

ادبیاتی مفہم

اور

اسلوبیات

گروہی چندماہگ

پروفیسر اردو، دہلی یونیورسٹی

پیشہ فیلو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن

پیشہ فیلو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن

ادبی تنقید

اور

اُسلوبیات

ادبی تنقید

اور

اسلوبیات

گوپی چند نارنگ

پروفیسر اردو، دہلی یونیورسٹی

نیشنل فیلو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن

ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس

© پروفیسر گوپن چند نارنگ

پاکستان میں اس کتاب کی اشاعت کے حقوق جناب انتظار حسین کے نام محفوظ ہیں۔

ADABI TANQEED
AUR USLOOBIYAT
by
GOPI CHAND NARANG

1st Edition 1989
11nd Edition 2001
ISBN 81-85360-48-0
Price. Rs.200

ادبی تنقید اور اسلوبیات	کتاب کا نام
پروفیسر گوپن چند نارنگ	مصنف
اول ۱۹۸۹ء	سنہ اشاعت
دوم ۲۰۰۱ء	سنہ اشاعت
۲۰۰ روپے	قیمت
کاک آفسیٹ پرنٹرز، دہلی	مطبع

Published by

Educational Publishing House

3108, Gali Vakil , Kucha Pandit , Lal Kuan Delhi-6(India)

Ph.: 3216162, 3214465 Fax:91-011-3211540

E-Mail: eph@onebox.com

دیباچہ

زیر نظر مجموعے میں صرف وہ مضامین شامل ہیں جن میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اسلوبیات سے مدد لی گئی ہے۔ اظہراً یہ مجموعہ بہت پہلے شائع ہو جانا چاہیے تھا، لیکن بوجہ اس کی اشاعت میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔ مجھ میں یہ کمزوری ہے کہ بعض کام عجلت میں نہیں کر سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان میں سے بعض مضامین دو دو تین تین برس میں لکھے گئے (خواہ وہ بہت معمولی کیوں نہ ہوں) یوں زیر نظر کتاب میں چوبیس پچیس برسوں کی تحریریں جمع ہو گئی ہیں۔ مثلاً شہریار مضمون ۱۹۶۵ء میں لکھا گیا تھا جب ان کا پہلا مجموعہ منظر عام پر آیا تھا، اور ادبی تنقید اور اسلوبیات پر مضمون ابھی کچھلے سال ۱۹۸۸ء میں مکمل ہوا۔ ہر مضمون کے بعد اس کا زمانہ تحریر دے دیا ہے جس سے اندازہ ہو گا کہ میں اسلوبیات کو ادبی مطالعے کے لیے ایک مدت سے برتنا، آزمانا اور پرکھتا رہا ہوں، اور بیس پچیس برس کے تنقیدی سفر میں جب یہ روایت میرے برے بھلے تنقیدی مزاج کا حصہ بن گیا، اور بالعموم اس بات کو محسوس کیا جانے لگا کہ اسلوبیات سے ادب کی افہام و فہم اور حسین کاری کے کام میں جو مدد مل سکتی ہے، وہ کسی

اور ذریعے سے ممکن نہیں، تو بالآخر میں نے اسلوبیات کی نظریاتی بنیادوں پر قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس کی، اور جس نظریاتی ماڈل کو میں ایک مدت سے برتتا رہا ہوں، اسے میں ضبطِ تحریر میں لے آیا، اور یوں یہ کتاب موضوعاتی اعتبار سے مکمل ہو گئی۔

اسلوبیات بہت مشکل میدان نہ سہی تو آسان بھی نہیں۔ اس کے نظریاتی ماڈل کی وضاحت جو پہلے مضمون میں پیش کی گئی ہے، اس لیے ضروری تھی کہ لسانیات نیا علم ہے، اور اسلوبیات چونکہ نیا تنقیدی رویہ ہے، اس کے بارے میں غلط فہمیاں عام ہیں۔ ضروری نہیں کہ جو نظریاتی ماڈل خاکسار نے پیش کیا ہے، یا اس کے جو نمونے شامل کتاب ہیں، ان سے سب سوالوں کا جواب مل جائے، کوئی کتاب بھی سب سوالوں کا جواب نہیں ہوتی، ہو بھی نہیں سکتی۔ بلکہ اس سے جہاں بعض سوالوں کا جواب ملے گا، وہیں کچھ نئے سوال بھی پیدا ہوں گے۔ تاہم خاکسار برسوں سے اسلوبیات کے بارے میں جو کچھ کہتا اور لکھتا رہا ہے، اگر زیرِ نظر کتاب سے ان مباحث میں ارتکاز پیدا ہو سکا تو اس کی اشاعت سعی نامشکور تصور نہ ہوگی۔

اتنی بات واضح رہے کہ اسلوبیات سے ادبی مطالعے میں کام لینے کے لیے ذوقِ نظر شرط ہے۔ ذوقِ نظر جتنا بالیدہ اور روایت آگاہ ہوگا، اسلوبیاتی مطالعہ اتنا ہی روشن اور معلومات افزا ہوگا، یہ بات خاطر نشان رہنا چاہیے کہ اسلوبیاتی طریق کار کو برتنے والے کی کمزوری ضابطہ علم کی کمزوری یا کوتاہی نہیں ہے۔ اسلوبیات نہایت وسیع اور متنوع میدان ہے، اور میں اس کے عشرِ عشر کو بھی پیش نہیں کر سکا۔

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اردو افسانے سے متعلق خاکسار کے اسلوبیاتی مضامین زیرِ نظر مجموعے میں شامل نہیں۔ انھیں الگ جلد میں پیش کیا جائے گا، گویا وہ کتاب اس کتاب کا دوسرا حصہ ہوگی۔ زیرِ نظر مجموعے میں زیادہ تر مضامین شاعری سے متعلق ہیں، صرف آخری دو میں نثر کے امتیازات سے بحث کی گئی ہے۔ ذاکر صاحب اور شہر یار والے مضامین زمانہ و سکانسن کی یادگار ہیں، اور نثری نظم اور اسلوبیات والے مضامین حال ہی میں لکھے گئے۔ اس اعتبار سے زیرِ نظر مجموعے میں خاکسار کے بیس پچیس برس کے ذہنی سفر کے نشانات راہ ملیں گے۔

یہ کتاب بھی حسبِ سابق محمد مجتبیٰ خاں، پروپرائیٹری کونسل پبلسٹنگ ہاؤس کے
 حُسنِ انتظام سے شائع ہو رہی ہے۔ ان کی توجہ نہ ہوتی تو اس میں مزید تاخیر ہو جاتی۔ ان
 کا اور رفقا میں پروفیسر حنیف کیفی، اور ڈاکٹر سید فرحت حسین کا تہ دل سے ممنون ہوں۔

گونی چند نازنگ

نئی دہلی

۱۱ فروری ۱۹۸۹ء

فہرست

۱۱	ادبی تنقید اور اسلوبیات	۱
	○	
۲۹	اسلوبیات میر	۲
۱۰۸	اسلوبیات انیس	۳
	اسلوبیات اقبال :	
۱۳۳	صوتیاتی نظام	۴
۱۵۳	صرفیاتی و نحویاتی نظام (نظریہ اسمیت اور فعلیت کی روشنی میں)	۵
	○	
۱۷۶	فیض کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام	۶
۲۱۶	عالیٰ جی کے من کی آگ	۷
	○	
۲۲۵	شہر یار : نئی شاعری اور اکہ اعظم	۸

- ۲۴۰ بانی : نئی غزل کا جو نامرگ شاعر ۹
 ۲۶۱ ساقی فاروقی : زمیں تیری مٹی کا جادو کہاں ہے ۱۰
 ۲۹۲ افتخار عارف : شہرِ مثال کا درد مند شاعر ۱۱



- ۳۱۲ نثری نظم کی شناخت ۱۲



- ۳۷۱ خواجہ حسن نظامی کی نثری ارضیت ۱۳
 ۳۸۳ ذاکر صاحب کی نثر : اردو کے بنیادی
 اسلوب کی ایک مثال ۱۴

ادبی تنقید اور اسلوبیات

بعض لوگ اسلوبیات کو ایک ہوا سمجھنے لگے ہیں۔ اسلوبیات کا ذکر اردو میں اب جس طرح جاو بیجا ہونے لگا ہے، اس سے بعض لوگوں کی اس ذہنیت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ اسلوبیات سے خوف زدہ ہیں۔ اسلوبیات نے چند برسوں میں اتنی ساکھ تو بہر حال قائم کر لی ہے کہ اب اس کو نظر انداز کرنا آسان نہیں رہا۔ اردو کے ایک جدید نقاد جنہوں نے بالقصد تنقید کو "خارزار" بنایا ہے تاکہ لوگ "آبلہ پانی کی لذت" سے آشنا ہو سکیں، اس بات کا اکثر ماتم کرتے ہیں کہ جدیدیت ایک "شعلہ بکف بغاوت" تھی، لسانی نقادوں نے اسے ٹھنڈا کر دیا۔ اول تو اردو میں لسانی نقاد ہی کتنے ہیں، اور اگر ہیں بھی تو انہوں نے اسلوبیاتی مضمون ہی کتنے لکھے ہیں۔ تعجب ہے کہ وہ "شعلہ بکف بغاوت" جس کی مقدس آگ کو دودر جن جید نقاد روشن رکھے ہوئے تھے، بقول ہمارے دوست کے اُسے دو ایک لسانی نقادوں کی شکستہ بستہ تحریروں نے ٹھنڈا کر دیا۔ یہ اگر صحیح ہے تو پھر یقیناً اسلوبیات میں کوئی خاص بات ہوگی کیونکہ جو چیز گرم رجحانات کو ٹھنڈا کر سکتی ہے، وہ سرد زمین میں گرم چیزگاریاں بھی بوسکتی ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلوبیات ایسا کوئی دعویٰ نہیں کرتی۔ ایک اور کرم فرما ہیں جنہیں اونچی سطح سے بات

کرنے کا مرض ہے گویا انوار انھیں پر نازل ہو رہے ہوں۔ وہ ”اخلاقیات تنقید“ کی دہائی دیتے ہوئے نہیں تھکتے، حالانکہ ادبی ریاکاری کو آرٹ بنانے میں انھیں ملکہ حاصل ہے۔ ان کے نزدیک ’دانشوری‘ یہی ہے کہ اسلوبیات کے بارے میں جملے بازی کرتے رہیں اور یوں اپنے احساس کتری کے زخموں کو سہلاتے رہیں۔ تنقید نگار تو خیر سمجھ میں آتا ہے کیونکہ بقراط بننے کا اُسے حق ہے، لیکن اس لائق احترام قبیلے میں ایک سربراہ اور وہ تخلیق کار بھی ہیں جو فلکشن میں اپنی ناکامیوں کا بدلہ اکثر و بیشتر تنقید سے لیتے رہتے ہیں، اور تنقید میں بھی لسانی تنقید کو برا بھلا کہہ کر اپنی بھکشوؤں والی بے تعلقی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا کرنے سے ان کے فلکشن کا بھلا ہو سکتا ہے تو لسانی تنقید کو ان کی محصومیت پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔ واضح رہے کہ زیر نظر مضمون کا روئے سخن ایسے دانشوروں سے نہیں، کیونکہ یہ پہنچے ہوئے لوگ ہیں، یہ اس منزل پر ہیں جہاں ہر منزل بجز خود پرستی کے ختم ہو جاتی ہے۔ یوں تو اس مضمون میں خاکسار نے بنیادی مباحث کو بھی چھیڑا ہے، اور ان مآخذ و مصادر کا بھی ذکر کیا ہے جن سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے اور دوسرے بھی اگر چاہیں تو حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ مضمون یا وہ کتب جن کا توالہ دیا گیا ہے، بھلا ایسوں کا کیا بگاڑ سکتی ہیں جو سب کچھ پہلے ہی جانتے ہیں۔ ایسے حضرات سے استدعا ہے کہ ان اوراق پر اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ البتہ یہ ان لوگوں کے لیے ہیں جو میری طرح طالب علمانہ تجسس رکھتے ہیں، نئے علم کے جو یا ہیں، یا نئے لسانی مباحث کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے خواہش مند ہیں۔

تو آئیے دیکھیں کہ اسلوبیات کیا ہے اور کیا نہیں ہے، اور ادبی تنقید سے اس کا کیا رشتہ ہے۔

اسلوبیات کی اصطلاح تنقید میں زیادہ پرانی نہیں۔ اس صدی کی پچھٹی دہائی سے

اسلوبیات کا استعمال اس طریق کار کے لیے کیا جانے لگا ہے، جس کی رُو سے روایتی تنقید کے موضوعی اور تاثراتی انداز کے بجائے ادبی فن پارے کے اسلوب کا تجزیہ معروضی لسانی اور سائنٹفک بنیادوں پر کیا جاتا ہے۔

لسانیات، سماجیات اور نفسیات سے جونہی روستی پھیلی دو دہائیوں میں حاصل ہوئی ہے، بالخصوص نظریہ ترکیب (COMMUNICATION THEORY) میں جو اضافے ہوئے ہیں، ان سے ادبی تنقید نے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ تنقید کے دو نئے ضابطے جو اسلوبیات اور ساختیات کے نام سے جانے جاتے ہیں اور جن کے حوالے سے ادب کی دنیا میں نئے فلسفیانہ مباحث پیدا ہوئے ہیں، وہ انھیں اثرات کا نتیجہ ہیں۔ تاریخی اعتبار سے اسلوبیات کے مباحث مقدم ہیں، اور نظریہ ساختیات یا اس سے متعلقہ نظریات جو پس ساختیات (POST-STRUCTURALISM) کے نام سے جانے جاتے ہیں، بعد میں منظر عام پر آئے، لیکن اسلوبیات کو سمجھے بغیر یا لسانیات کے بنیادی اصول و ضوابط کو جانے بغیر نظریہ ساختیات کو نیز ان تمام فلسفیانہ مباحث کو جو "پس ساختیات" کے تحت آتے ہیں، سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ یہ اعتراض اکثر کیا گیا ہے کہ ان مباحث سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسلوبیات کی سرحد کہاں ختم ہوتی ہے اور ساختیات کی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن دراصل جو لوگ لسانیات سے واقف ہیں یا بعض بنیادی لسانیاتی معلومات رکھتے ہیں، ان کے نزدیک یہ اعتراض بے اصل ہے کیونکہ نظریہ اسلوبیات اور نظریہ ساختیات اگرچہ دونوں اپنے بنیادی فلسفیانہ اصول و ضوابط لسانیات سے اخذ کرتے ہیں، لیکن دونوں کا دائرہ عمل الگ الگ ہے۔ اسلوبیات یا ادبی اسلوبیات ادب یا ادبی اظہار کی ماہیت سے سروکار رکھتی ہے، جبکہ ساختیات کا دائرہ عمل پوری انسانی زندگی، ترکیب و ابلاغ، اور تمدن انسانی کے تمام مظاہر پر حاوی ہے۔ ساختیات کا فلسفیانہ چیلنج یہ ہے کہ ذہن انسانی حقیقت کا ادراک کس طرح کرتا ہے اور حقیقت جو معرض میں موجود ہے، کس طرح پہچانی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ بات خاطر نشان رہنا چاہیے کہ ساختیات صرف ادبی اظہار سے متعلق نہیں بلکہ اساطیر، دیومالا، قدیم روایتیں، عقائد، رسم و رواج، طور طریقے، تمام ثقافتی

معاشرتی مظاہر، مثلاً لباس و پوشاک، رہن سہن، خورد و نوش، بود و باش، نشست و برخاست وغیرہ یعنی ہر وہ منظر جس کے ذریعے ذہن انسانی ترسیل معنی کرتا ہے یا ادراک حقیقت کرتا ہے، ساختیات کی دلچسپی کا میدان ہے۔ ادب بھی چونکہ تہذیب انسانی کا منظر بلکہ خاص منظر ہے، اس لیے ساختیات کی دلچسپی کا خاص موضوع ہے۔ ساختیاتی مباحث میں ادب کو جو مرکزیت حاصل ہے، اس کی وجہ یہی ہے۔

اسلوبیات کا بنیادی تصور اسلوب ہے۔ اسلوب (STYLE) کوئی نیا لفظ نہیں ہے۔ مغربی تنقید میں یہ لفظ صدیوں سے رائج ہے۔ اردو میں اسلوب کا تصور نسبتاً نیا ہے، تاہم ”زبان و بیان“ ”انداز“ ”اندازِ بیان“ ”طرزِ بیان“ ”طرزِ تحریر“ ”لہجہ“ ”زنگ“ ”زنگِ سخن“ وغیرہ اصطلاحیں اسلوب یا اس سے ملتے جلتے معنی میں استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ یعنی کسی بھی شاعر یا مصنف کے اندازِ بیان کے خصائص کیا ہیں، یا کسی صنف یا ہیئت میں کس طرح کی زبان استعمال ہوتی ہے یا کسی عہد میں زبان کیسی تھی اور اس کے خصائص کیا تھے، وغیرہ۔ یہ سب اسلوب کے مباحث ہیں۔ ادب کی کوئی پہچان اسلوب کے بغیر مکمل نہیں۔ لیکن اکثر اہل بارے میں اشاروں سے کام لیا جاتا رہا ہے، اور تنقیدی روایت میں ان مباحث کے نقوش کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اس روایت کے مقابلے میں جدید لسانیات نے اسلوبیات کا جو نیا تصور دیا ہے، اس کے بارے میں یہ بنیادی بات واضح ہونا چاہیے کہ اسلوبیات کی رُو سے اسلوب کا تصور، اس تصورِ اسلوب سے مختلف ہے جو مغربی ادبی تنقید یا اس کے اثر سے رائج رہا ہے، نیز یہ اس تصور سے بھی مختلف ہے جو علمِ بدیع و بیان کے تحت مشرقی ادبی روایت کا حصہ رہا ہے۔ مزید برآں یہ اس تصور سے بھی مختلف ہے جس کا کچھ نہ کچھ ذہنی تصور ہم موضوعی طور پر یعنی تاثراتی طور پر قائم کر لیتے ہیں۔ مشرقی روایت میں ادبی اسلوب بدیع و بیان کے پیرایوں کو شعر و ادب میں بروئے کار لانے اور ادبی حسنِ کاری کے عمل سے عہدہ برآ ہونے سے عبارت ہے، یعنی یہ ایسی شے ہے جس سے ادبی اظہار کے حسن و دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے۔ گویا اسلوب زلیور ہے ادبی اظہار کا جس سے ادبی اظہار کی جاذبیت، کشش اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے، یعنی مشرقی روایت کی

رُو سے اسلوب لازم نہیں بلکہ ایسی چیز ہے جس کا اضافہ کیا جاسکے۔ پس اسلوب کے قدیم اور جدید تصور یعنی اسلوبیات کے تصور میں پہلا بڑا فرق یہی ہے کہ اسلوبیات کی رُو سے اسلوب کی حیثیت ادبی اظہار میں اضافی نہیں بلکہ اصلی ہے، یعنی اسلوب لازم ہے یا ادبی اظہار کا ناگزیر حصہ ہے، یا اس تخلیقی عمل کا ناگزیر حصہ ہے جس کے ذریعے زبان ادبی اظہار کا درجہ حاصل کرتی ہے، یعنی ادبی اسلوب سے مراد لسانی سجاوٹ یا رنیت کی چیز نہیں جس کا رد یا اختیار میکانیکی ہو، بلکہ اسلوب فی نفسہ ادبی اظہار کے وجود میں پیوست ہے۔

اسلوبیات و فصاحتی لسانیات (DESCRIPTIVE LINGUISTICS) کی وہ شاخ

ہے جو ادبی اظہار کی ماہیت، عوامل اور خصائص سے بحث کرتی ہے، اور لسانیات چونکہ سماجی سائنس ہے، اس لیے اسلوبیات اسلوب کے مسئلے سے تاثراتی طور پر نہیں، بلکہ معروضی طور پر بحث کرتی ہے، نسبتاً قطعیت کے ساتھ اس کا تجزیہ کرتی ہے، اور مدلل سائنسی صحت کے ساتھ نتائج پیش کرتی ہے۔ اسلوبیات کا بنیادی تصور یہ ہے کہ کوئی خیال، تصور، جذبہ، یا احساس زبان میں کئی طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔ زبان میں اس نوع کی یعنی پیرایہ بیان کے اختیار کی مکمل آزادی ہے۔ شاعر یا مصنف قدم قدم پر پیرایہ بیان کی آزادی کا استعمال کرتا ہے۔ پیرایہ بیان کی آزادی کا استعمال شعوری بھی ہوتا ہے اور غیر شعوری بھی، اور اس میں ذوق، مزاج، ذاتی پسند و ناپسند، صنف یا ہیئت کے تقاضوں نیز قاری کی نوعیت کے تصور کو بھی دخل ہو سکتا ہے، یعنی تخلیقی اظہار کے جملہ ممکنہ امکانات جو وجود میں آچکے ہیں اور وہ جو وقوع پذیر ہو سکتے ہیں، ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا (جس کا اختیار مصنف کو ہے) دراصل اسلوب ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ اسلوب کا یہ تصور نہ صرف قدیم روایت کے اسلوب کے تصور سے

مختلف ہے، بلکہ جدید تنقید کے اس دبستان سے بھی "جوئی تنقید" "NEW CRITICISM" کے نام سے جانا جاتا ہے، بنیادی طور پر متضادم ہے۔ اسلوبیات میں پیرایہ بیان کے جملہ

ممکنہ امکانات کا تصور زماں، مکالم، اور سماج کے تصور کو راہ دیتا ہے جس کی "نئی تنقید" میں کوئی گنجائش نہیں۔ "نئی تنقید" کا تصور لسان جامد ہے، کیونکہ یک زمانی ہے، جبکہ

اسلوبیات زبان کے ماضی، حال، مستقبل یعنی جملہ امکانات کو نظر میں رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلوبیات میں اسلوب کا تصور تجزیاتی معروضی نوعیت رکھنے کے باوجود تاریخی سماجی جہت کی راہ کو کھلا رکھتا ہے، جبکہ ”نئی تنقید“ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ ”نئی تنقید“ کی رُو سے فن پارہ خود نمکتنی اور خود مختار ہے، اور جو کچھ بھی ہے فن پارے کے وجود کے اندر ہے، اور اس سے باہر کچھ نہیں۔ اسلوبیات بھی اگرچہ ”متن“ پر پوری توجہ مرکوز کرتی ہے لیکن ”نئی تنقید“ کی پیدا کردہ تاریخی اور سماجی تحدید کو قبول نہیں کرتی۔

ادبی اسلوبیات تجزیاتی طریق کار کے استعمال سے تخلیقی اظہار کے پیرایوں کی نوعیت کا تعین کر کے ان کی درجہ بندی کرتی ہے وہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ فنکار نے مکملہ تمام لسانی امکانات میں سے اپنے طرزِ بیان کا انتخاب کس طرح کیا اور اس سے جو اسلوب خلق ہوا، اس کے امتیازات یا خصائص کیا ہیں۔ یعنی وہ کون سی لسانی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے کسی پیرایہ بیان کی الگ سے شناخت ممکن ہے، یا لسانی اظہار کا جو عمومی فطری انداز (NORM) ہے، اس سے کسی مصنف یا شاعر کا کوئی پیرایہ بیان کتنا مختلف ہے، یا کسی مخصوص طرزِ اظہار میں کون کون سے لسانی خصائص پس منظر میں چلے گئے ہیں، اور کون کون سے پیش منظر میں آگئے ہیں، اسلوبیات میں یہ عمل FOREGROUNDING کہلاتا ہے۔

زبان کے فطری انداز کی درجہ بندی کی روشنی میں کسی خاص متن یا متون کو پرکھا جاسکتا ہے، یا منتخبہ متون کا باہمی تقابلی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اسلوبیاتی تجزیہ زبان کی کسی بھی سطح کو لے کر ممکن ہے۔ لسانیات میں زبان کی چار سطحیں خاص ہیں۔

PHONOLOGY	صوتیات
MORPHOLOGY	لفظیات
SYNTAX	نحویات
SEMANTICS	معنیات

زبان ان چاروں سے مل کر مشکل ہوتی ہے۔ خالص لسانیاتی تجزیوں میں کسی بھی سطح

کو الگ سے بھی لیا جاسکتا ہے، لیکن ادبی اظہار کے تجزیے میں ہر سطح کے تصور میں زبان کا کئی تصور شامل رہتا ہے۔ اس لیے کہ معنی لفظ سے اور لفظ معنی۔ معنی کی اکائی کلمہ ہے اور کلمہ لفظ یا لفظوں کا مجموعہ ہے۔ اور خود لفظ آواز یا آوازوں کا مجموعہ ہے۔ یعنی اسلوبیاتی تجزیے میں خواہ ایسا ظاہر نہ کیا گیا ہو، اور سائنسی طور پر محض کسی ایک سطح کا تجزیہ کیا گیا ہو، جیسا کہ رقم الحرف نے اپنے مضامین "اسلوبیات انیس" یا "اقبال کا صوتیاتی نظام" میں عمداً کیا ہے۔ لیکن زبان کا کئی تصور بشمول معنی کے اس میں مضمحل (LATENT) رہتا ہے، اور اس کا اخراج لازم نہیں، جیسا کہ نا سمجھی کے باعث عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔

غرض اسلوبیاتی تجزیے میں انسانی امتیازات کو نشان زد کیا جاتا ہے جن کی وجہ سے کسی فن پارے، مصنف، شاعر، ہیئت، صنف، یا عہد کی شناخت ممکن ہو۔ یہ امتیازات کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ (۱) صوتیاتی (آوازوں کے نظام سے جو امتیازات قائم ہوتے ہیں، ردیف و قوافی کی خصوصیات، یا معکوسیت، ہرکارت یا غنیت کے امتیازات یا مصمتوں اور مصوتوں کا تناسب وغیرہ)۔ (۲) لفظیاتی (خاص نوع کے الفاظ کا اضافی تواتر، اسما، اسمائے صفت، افعال وغیرہ کا تواتر اور تناسب، تراکیب وغیرہ)۔ (۳) نحویاتی (کلمے کی اقسام میں سے کسی کا خصوصی استعمال، کلمے میں لفظوں کا دروبست وغیرہ)۔ (۴) بدیعی (RHETORICAL) بدیع و بیان کی امتیازی شکلیں، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تمثیل، علامت، امیجری وغیرہ (۵) عروضی امتیازات (اوزان، بحر و زحافات وغیرہ کا خصوصی استعمال اور امتیازات)۔

اسلوبیات کے ماہرین جو سائنسی طریق کار اور محرومیت پر زور دیتے ہیں، انسانی خصائص کے اضافی تواتر اور تناسب کو معلوم کرنے کے لیے کمیتی اعداد و شمار کو بنیاد بناتے ہیں۔ اب تو ان تجزیوں کے لیے کمپیوٹر کے استعمال سے نتائج کو اور بھی زیادہ صحت اور یقین سے اخذ کیا جانے لگا ہے۔ کچھ ماہرین صرّنی لسانی تصورات کو بھی تجزیے کی بنیاد بناتے ہیں، مثلاً تصریفی (PARADIGMATIC) اور کھماتی (SYNTAGMATIC) تشکلوں کا فرق یا چامسکی کی تشکیلی گرامر کی بنا پر ظاہری اور داخلی ساختوں کا فرق اور ان کے امتیازات وغیرہ۔

زبان میں اظہار کے امکانات لا محدود ہیں، کوئی بھی مصنف ممکنہ امکانات میں سے صرف چند کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ انتخاب مصنف کے لسانی عمل کا حصہ ہے اور اس کی اسلوبیاتی شناخت کی بنیاد فراہم کرتا ہے اسلوبیاتی تجزیے سے مصنف کی پہچان بعینہ اسی طرح ممکن ہے جس طرح انسان اپنے ہاتھ کی لکیروں سے پہچانا جاتا ہے۔ اسلوبیات کے ذریعے مصنف کے لسانی اظہار کے ہاتھ کی لکیروں (FINGERPRINTS) کا پتہ چلایا جاسکتا ہے، اور اس کی شناخت حتمی طور پر متعین کی جاسکتی ہے۔ اشخاص کی طرح اصناف کا بھی مزاج ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلوبیات کی مدد سے یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ باہم گہ مختلف اصناف کا اسلوبیاتی امتیاز کیا ہے، اور پیرایہ بیان کی سطح پر وہ کس طرح ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اشخاص اور اصناف سے ہٹ کر اسلوبیاتی تجزیے کی ایک جہت اور بھی ہے۔ چونکہ ادبی ارتقا میں اظہار کے لسانی پیرایہ عہد بہ عہد تبدیل ہوتے رہتے ہیں، اسلوبیات کی مدد سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کس عہد میں کون سا اسلوب رائج تھا یا کسی عہد کی زبان کے لسانی امتیازات کیا تھے۔

لسانی امتیازات کی نشاندہی ادبی اظہار میں تخلیقی عمل کو سمجھنے میں ادبی انفرادیت کی بنیادوں کے تعین کے لیے بھی بیش بہا مدد فراہم کرتی ہے۔ ادبی اظہار بھی بہت کچھ قص و موسیقی کی طرح ہے۔ قص و سرود کی ظاہری سطح پر لطف و نشاط اور کیف و سرور کی مسجور کن فضا چھانی رہتی ہے جس میں اکثر ہم خود فراموشی کے عالم سے گزرتے ہیں اور کھوسے جاتے ہیں۔ تاہم اگر سطح کے نیچے غور سے دیکھیں تو تال، آہنگ (RHYTHM) اور صوتی امتیازات کا (بظاہر پیچیدہ لیکن اصلاً سادہ) جال سا بچھا ہوا نظر آئے گا، جیسے طرح طرح کے رنگوں کا کوئی مشجر (TAPESTRY) ہو یا جو میٹریکل ڈیزائن کا کوئی خوبصورت رنگارنگ فرش (MOSAIC) بنا ہوا ہو۔ ادبی اظہار میں لفظوں کی ظاہری سطح کے نیچے لسانی امتیازات سے طرح طرح کے ڈیزائن بنتے ہیں۔ ان کی پہچان ادبی اسلوبیات کا خاص کام ہے۔ عرضی تجزیے سے اگر کسی شعری ہیئت یا مصنف کے بارے میں عمومی نتائج — (GENERALISATION) اخذ کیے جائیں یا کسی مصنف یا فن پارے کے لسانی خصائص

کے تعین میں مدد ملی جائے تو ایسے تجزیے اسلوبیات کی ذیل میں آئیں گے۔

اسلوبیات میں تناج اخذ کرتے ہوئے اس خطرے سے آگاہ رہنا ضروری ہے کہ اسلوبیاتی تجزیہ محض مہلتی تجزیہ نہیں جس پر ”نئی تنقید“ کا دار و مدار ہے، کیونکہ اسلوبیات کی رو سے فن پارہ صرف لفظوں کا مجموعہ یا ہیئت محض (VERBAL CONSTRUCT) نہیں ہے، نہ ہی وہ کسی بھی طرح کے ”پیغام کا سٹ“ (SET OF MESSAGES) یا اطلاع محض یا معنی محض (PURE SEMANTIC INFORMATION) کی مثال ہے، بلکہ اس کی نوعیت ان دونوں کے بیچ کی ہے اور اسلوبیات اس کے لیے (DISCOURSE) کی اصطلاح استعمال کرتی ہے۔

اسلوبیاتی تجزیوں پر جو اعتراضات کیے جاسکتے ہیں، ان کی ایک خاص مثال MICHAEL RIFFATERRE کا وہ مضمون ہے جس میں بود لیئر کے سائنٹ LES CHATS کے رومان جیکبسن اور کلاؤڈ لیوئی سٹراس کے تجزیے سے بحث کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

STRUCTURALISM, ED., JACQUES EHRMANN, 1966.

رغائیں نے سوال اٹھایا تھا کہ اسلوبیات یہ تو بتا سکتی ہے کہ مختلف لسانی خصائص میں سے کسی فن پارے کے اپنے امتیازی خصائص کیا ہیں، لیکن اس کا فیصلہ کیسے کیا جائے گا کہ وہ کون سے خصائص ہیں جو کسی فن پارے کو جمالیاتی اعتبار سے زیادہ موثر بناتے ہیں، اور ان کا تعین کس طرح کیا جائے گا؟ اس کا جواب بعد کے ماہرین اسلوبیات نے یہ دیا کہ یہ اعمت سرائی ہی دراصل غلط توقعات پر مبنی ہے، کیونکہ اسلوبیات اس طرح سے جمالیات سے علاقہ نہیں رکھتی جس طرح ادبی تنقید رکھتی ہے۔ اسلوبیات کے پاس خبر بنظر نہیں، جمالیاتی قدر شناسی اسلوبیات کا کام نہیں۔ اسلوبیات کا کام بس اس قدر ہے کہ وہ لسانی امتیازات کی حتمی طور پر نشان دہی کر دے۔ ان کی جمالیاتی تعین قدر ادبی تنقید کا کام ہے۔ اس کی توقع ادبی تنقید سے کرنا چاہیے نہ کہ اسلوبیات سے۔ رہی یہ بات کہ اسلوبیات اور ادبی تنقید میں کیا رشتہ ہے، تو اس کو میں اس سے پہلے بھی کئی بار واضح کر چکا ہوں کہ اسلوبیات ادبی تنقید کا بدل نہیں ہے۔ اردو میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ اسلوبیات ادبی تنقید کا بدل ہے۔

غالب نے کہا تھا 'ضد کی ہے بات اور مگر خوبری نہیں' اسلوبیات کو ادبی تنقید کا بدل سمجھ کر اس سے بھڑکنا سمجھی کی بات ہے۔ اور ایسا اکثر وہ لوگ کرتے ہیں جو لسانیات کے تفاعل سے ناواقف محض ہیں، یا وہ لسانیات اور اسلوبیات سے خائف ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی بھی نئے علم سے پُرانی اجارہ دار لوگوں کو ٹھیس پہنچتی ہے، چنانچہ کچھ کرم فرما طنز و استہزا سے کام لیتے ہیں، لیکن زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو بات کو جانے اور سمجھے بغیر کھلم کھلا غیر علمی یا دانش دشمن (ANTI-INTELLECTUAL) رویہ اپناتے ہیں۔ ایسے لوگ ہماری ہمدردی کے مستحق ہیں کیونکہ مسائل و مباحث کو سمجھنے کی مخلصانہ اور ایماندارانہ کوشش انہوں نے نہیں کی۔ یہ حضرات شاید نہیں جانتے کہ غیر علمی رویہ اختیار کرنے، اور اس نوع کی حملے بازی سے دراصل خود انہیں کی ذہنی کم مائیگی اور مایوسی ظاہر ہوتی ہے۔ اسلوبیات نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ تنقید ہے یا ادبی تنقید کا بدل ہے۔ البتہ اتنی بات صاف ہے کہ اسلوبیات تنقید کی مدد کر سکتی ہے، اور اس کو نئی روشنی فراہم کر سکتی ہے۔ اسلوبیات کے پاس متن کے سائنسی لسانی تجزیے کا حربہ ہے۔ اس کے پاس ادبی ذوق کی نظر نہیں ہے۔ جب بھی ہم کسی فن پارے کو پڑھتے ہیں تو اپنے مزاج، معلومات اور احساس یعنی اپنے ادبی ذوق کے مطابق اس کے بائے میں کچھ نہ کچھ تاثر قائم کرتے ہیں۔ یہ جمالیاتی تاثر ہے جو دراصل ادبی تنقید کا نقطہ آغاز ہے۔ اس کی نوعیت خالص موضوعی ہے جو ہماری ذہنی کیفیت کو ظاہر کر سکتی ہے۔ یہ تاثر صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ اس کے بعد اسلوبیاتی تجزیے کا کام شروع ہوتا ہے جو خالص معروضی ہے، یعنی اسلوبیات ادبی تنقید کے ہاتھ میں ایک معروضی حربہ ہے۔ جیسے جیسے تجزیے کی فراہم کردہ معروضی معلومات سامنے آنے لگتی ہیں، یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ ابتدائی موضوعی تاثر صحیح خطوط پر تھا یا غلط خطوط پر۔ اگر تاثر غلط خطوط پر تھا تو اسلوبیات کوئی دوسرا مفروضہ یا اس سے بالعکس مفروضہ قائم کر کے از سر نو تجزیے کا آغاز کر کے دوسرے مفروضے کو آزما سکتی ہے لیکن جب توثیق ہو جائے کہ تجزیاتی سفر غلط راہ پر نہیں تھا، تو تجزیاتی معلومات سے ابتدائی جمالیاتی تاثر بتدریج زیادہ واضح اور شفاف (REFINE) ہونے لگتا ہے، اور لسانی خصائص کے بارے میں نئے نئے نکات سوچنے لگتے ہیں جن سے بالآخر

حتمی طور پر تخلیقی عمل کی لسانی نوعیت اور فن پارے کے امتیازی نقوش کا تعین ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلوبیات کا کام نمٹ جاتا ہے، اور ادبی تنقید اور جمالیات کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ ادب کی تحسین کاری اور تعین قدر کا کام ادبی تنقید اور جمالیات کا کام ہے، اسلوبیات کا نہیں۔

اسلوبیات ادبی تنقید کو لسانی حسن کاری کے رازوں، لفظوں کے تخلیقی استعمال کے نازک فرق، اور ہلکے گہرے لفظیاتی اور معنیاتی امتیازات سے آگاہ کر سکتی ہے۔ رچرڈ ڈوٹال کا اصرار ہے کہ اسلوبیات ایسا ان مصنوعی قیود کے بغیر کر سکتی ہے جو "نئی تنقید" کے دستان نے عائد کی ہیں، یعنی اسلوبیات فن پارے کا تجزیہ خلا میں نہیں کرتی۔ مزید یہ کہ اسلوبیات

ابہام (AMBIGUITY) علامت نگاری (SYMBOLISM) امیجری (IMAGERY)

قول محال (PARADOX) یا IRONY کی موجودگی یا عدم موجودگی کی بنا پر ترجیحات قائم نہیں کرتی، یعنی اسلوبیات اگرچہ ان سب سے بحث کرتی ہے لیکن ہرگز یہ حکم نہیں لگاتی کہ فلاں پر ایہ اعلا ہے اور فلاں ادنا، یا فلاں اسلوب بہتر ہے اور فلاں کمتر، بلکہ اسلوبیات اظہار کے لسانی امتیازات جیسے وہ ہیں، ان کا تعین کر کے اور ان کی شناخت کے کام کو پورا کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاتی ہے اور ادنا اعلا کا فرق قائم کرنے کے لیے ادبی تنقید کے لیے راہ چھوڑ دیتی ہے۔

البتہ اسلوبیات کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ بسیط فن پاروں کے لیے اس کا استعمال نہایت ہی مشکل ہے۔ یعنی غزل یا نظم کا تجزیہ آسان ہے اور ناول اور افسانے کا مشکل۔ نثر کے تجزیے میں یہ بھی دقت ہے کہ تصنیف کے کس حصے کو نمائندہ سمجھا جائے اور کس کو نظر انداز کیا جائے۔ جامع تجزیے کے لیے مواد (CORPUS) کا محدود ہونا اس کے حق میں ہے۔ اسلوبیات پر اعتراض کا ایک دروازہ اس وجہ سے بھی کھل جاتا ہے کہ مخصوص اصطلاحات کا استعمال کرتی ہے جو کلیتاً لسانیات سے ماخوذ ہیں، اور ادبی نقاد اکثر و بیشتر ان سے باخبر نہیں (اردو میں بے خبری پر اترنے والوں کی کمی نہیں) چنانچہ ترسیل کی اپنی مشکلات ہیں۔ جب عام نقادوں کا یہ حال ہے تو عام قارئین سے رشتے کی نوعیت کیا ہوگی۔ ظاہر

ہے کہ اسلوبیات عام قاری کی دسترس سے باہر ہے۔ قاری سے رشتے کا انقطاع وہ قیمت ہے جو اسلوبیات کو اپنی سائنسی بنیادوں کی وجہ سے بہر حال چکانا پڑتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر ضابطہ علم کی یا سائنس کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ اگر اس علم سے استفادہ کرنا ہے تو اس کی اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے، ورنہ اس علم کی کلید ہاتھ نہ آئے گی اور ہم اس سے استفادہ نہ کر سکیں گے۔ یہی حال اسلوبیات کا بھی ہے۔ اصطلاحات دراصل تصورات ہیں جن پر کسی بھی ضابطہ علم کی بنیاد ہوتی ہے۔ ان اصطلاحات کو نرم کر کے یعنی سمجھا کر بیان تو کیا جاسکتا ہے لیکن ان کو چھوڑا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ علم کے سائنسی مزاج کی خاطر کچھ تو قیمت ادا کرنی ہوگی اور کوئی قیمت اتنی بھاری نہیں ہے کہ اس کی خاطر اسلوبیات کے ذریعہ حاصل ہونے والی معروضی سائنسی بنیادوں کو ترک کر دیا جائے۔

خالص اسلوبیاتی مطالعے بالعموم اسلوبیاتی شناخت ہی کو مقدم سمجھتے ہیں، اور کسی بھی مصنف یا فن پارے کے لسانی امتیازات کو نشان زد کر دینے (FINGERPRINTING) کے بعد کسی نوع کی رائے زنی نہیں کرتے، تاہم ایسے مطالعات کی بھی کمی نہیں، جن میں اعداد و شمار اور افسانی تو اثر سے یا اس کی نفسیاتی اور ذہنی ترجیحات سے مربوط کر کے دیکھا گیا ہے اور نتائج اخذ کیے گئے ہیں کہ تجربے کی لسانی تقلیب کس طرح ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

LEO SPITZER, LINGUISTICS AND LITERARY HISTORY, 1968.

یا یہ کہ اسلوبیاتی امتیازات کا مصنف کی آئیڈیولوجی سے کیا تعلق ہے، یا اس کا نظریہ حیات کیا ہے، یا حقیقت کے تئیں اس کا رویہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ERICH AUERBACH, MIMESIS, 1953.

یا لسانی امتیازات کا جمالیاتی اور جذباتی تاثیر سے کیا ربط ہے، ملاحظہ ہو:

(حوالہ ماسبق (MICHAEL RIFFATERRE

بہر حال اس بارے میں متحد رویے اور رجحانات ہیں۔ ایک عام رویہ وہ ہے جس کو رینے ویلیک "THE IMPERIALISM OF MODERN LINGUISTICS" کہتا ہے، یعنی اسلوبیات کے

حدود کو اس قدر وسیع کرنا کہ ادبی تنقید میں جو کچھ ہے، اسلوبیات کا اس سب پر اطلاق ہو سکتا ہے یا یہ کہ اسلوبیات کو ہر درد کی دو سمجھ لیا جائے۔ ظاہر ہے یہ رویہ غلط ہے۔ اسلوبیات بس اس حد تک مفید ہے جس حد تک وہ مفید ہے۔ اس مسئلے سے بحث کرتے ہوئے STANLEY FISH نے

"WHAT IS STYLISTICS AND WHY ARE THEY SAYING SUCH TERRIBLE THINGS ABOUT IT?" (APPROACHES TO POETICS, ED., SEYMOUR CHATMAN, 1973).

میں وضاحت کی ہے کہ اصل اسلوبیات جس کو وہ (AFFECTIVE STYLISTICS) کہتا ہے، یہ ہے کہ قاری جب متن کا مطالعہ کرتا ہے تو اسلوب اور معنی کا مطالعہ الگ الگ نہیں کرتا، بلکہ لفظ، کلمہ، سہیئت، معنی، سب مجموعی طور پر یک وقت قاری کے ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں، گویا قاری کا ذہنی رد عمل (RESPONSE) کلی رد عمل (TOTAL RESPONSE) ہوتا ہے، جزوی نہیں، اسلوب اور معنی کی بحث کو الگ کرنا ممکن ہی نہیں، اس لیے اصل اسلوبیات وہی ہے جو قاری کے کلی رد عمل (TOTAL RESPONSE) کا احاطہ کرتی ہو۔ غرض دونوں طرح کی آرا ملتی ہیں، اور ہر فریق نے اپنے دعوے کے حق میں مدلل بحث کی ہے اس مقدمے کی وضاحت کے لیے کہ اسلوب کو معنی سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دیکھیے:

BENNISON GRAY, STYLE: THE PROBLEM AND ITS SOLUTION, 1969; AND "STYLISTICS: THE END OF A TRADITION", JOURNAL OF AESTHETICS AND ART CRITICISM, 31, 1973.

اس کے برعکس اس مقدمے کی مدلل بحث کے لیے کہ اسلوب کی بحث الگ سے ممکن ہے، اور خالص اسلوبیاتی تجزیے ادبی جواز رکھتے ہیں، ملاحظہ ہو:

E.D. HIRSCH, "STYLISTICS AND SYNONYMITY" IN THE AIMS OF INTERPRETATION, 1976.

یہاں مختصر وضاحت اردو اور اسلوبیات کے ضمن میں بھی ضروری ہے۔ اردو میں اسلوبیات کا ذکر اگرچہ بالعموم کیا جانے لگا ہے اور عام نقاد بھی اکاؤڈ کالسانیاقی اصطلاحیں استعمال کرنے لگے ہیں، لیکن درحقیقت اردو میں اسلوبیات کا سرمایہ زیادہ وسیع نہیں ہے۔ اگرچہ لسانیات

جاننے والوں کی تعداد اردو میں خاصی ہے، مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو لسانیات کو ادبی مطالعے میں برت سکنے پر قادر ہوں۔ اردو میں اس نوع کے مطالعات کا آغاز مسعود حسین خاں نے کیا۔ مغنی تبسم اسے اپنی تنقید میں استعمال کرتے ہیں۔ مرزا خلیل بیگ نے بھی متعدد تجزیے کیے ہیں۔ لیکن یہ سارا کام زیادہ تر صورتیات کے حوالے سے ہے، اور کسی قدر عروض کے حوالے سے۔ گیان چند جین لسانیات کے ماہر ہیں، لیکن روایتی تنقید ہی کو تنقید سمجھتے ہیں، جبکہ شمس الرحمن فاروقی باقاعدہ لسانیات سے علاوہ نہیں رکھتے، لیکن ان کے لسانی اور عروضی مباحث میں اسلوبیات کا اثر ملتا ہے۔ یہاں اس مضمون کا ذکر ضروری ہے جو گیان چند جین نے لکھا تھا:

”اسلوبیاتی تنقید پر ایک نظر“ (نیا دور، لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۸۴ء) اور جس کا جواب مرزا خلیل بیگ نے دیا تھا: ”اسلوبیاتی تنقید پر ایک ترچھی نظر“ (نیا دور، لکھنؤ، اپریل ۱۹۸۶ء)۔

گیان چند جین نے اردو کے گنتی کے نمونوں کو سامنے رکھا، اور اسلوبیات سے بحیثیت ضابطہ علم کے بحث نہیں کی، نہ ہی اسلوبیات اور ادبی تنقید کا رشتہ ان کے پیش نظر رہا جس کی ان سے توقع تھی۔ بعض کمزور نمونوں کے پیش نظر یہ بحث کی جاسکتی ہے کہ اسلوبیات کا اطلاق ٹھیک ہوا ہے کہ نہیں، لیکن اس سے ضابطہ علم کی معروضی بنیاد پر کوئی حرف نہیں آتا۔ راقم الحروف کے نام اپنے خط میں جین صاحب نے وضاحت کی کہ اس بارے میں ان کی معلومات مکمل نہیں تھیں، اور انھیں صرف ٹرنر کی کتاب دستیاب ہو سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر ٹرنر کی کتاب نہ صرف ناکافی ہے بلکہ اس اعتبار سے ناقص ہے کہ اس کا اصل موضوع اسلوبیات اور ادبی تنقید ہے ہی نہیں۔ راقم الحروف نے اپنے زیر نظر مضمون میں مصادر و ماخذ کا ذکر قدرے تفصیل سے عمداً کیا ہے کہ تاکہ ادبی تنقید کے سنجیدہ طالب علم کو معلوم ہو کہ اسلوبیاتی مباحث کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور ان کی سرحدیں کتنی پھیلی ہوئی ہیں۔ ان مباحث یا ان کے مبادیات کو جانے اور سمجھنے بغیر اسلوبیات سے متعلق کوئی سنجیدہ گفتگو ممکن ہی نہیں۔ چونکہ خاکسار سے اکثر اسلوبیات اور ساختیات کے حوالے سے ادبی تنقید کے بارے میں پوچھا جاتا ہے، ضروری ہے کہ مختصراً ہی سہی، خاکسار اپنے موقف کی وضاحت بھی کر دے۔

اس بارے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اردو میں اسلوبیاتی طور پر جو کچھ بھی لکھا گیا

ہے، راقم الحروف کا معاملہ اس سب سے الگ ہے۔ اول یہ کہ راقم نے مجرّد کسی فن پارے یعنی غزل، نظم یا نثر کے بطور ادبی اکائی کے اسلوبیاتی تجزیہ نہیں کیا۔ ایسا تجزیہ مصنف کے پورے تخلیقی عمل کو نظر میں رکھ کر ہی ممکن ہے۔ تفصیل کے لیے تو دفتر درکار ہے، مثلاً عرض کرتا ہوں، خواہ ”راجندر سنگھ بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں“ ہو یا ”انتظار حسین کا فن بہتر تک ذہن کا ستیاں سفر“ نیز ”اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام“ یا ”اسلوبیات اقبال: نظریہ سمیت و فعلیت کی روشنی میں“ یا ”نظیر اکبر آبادی: تہذیبی دید باز“ یا ”اسلوبیات انیس“ یا ”اسلوبیات میر“ خاکسار نے کبھی کسی فن پارے سے مجرّد بحث نہیں کی، بلکہ میر، انیس، نظیر، اقبال، بیدی، یا انتظار حسین کی تخلیقی شخصیت کے تناظر میں گفتگو کی ہے، اور شاعر یا مصنف کی تخلیقی انفرادیت یا اسلوبیاتی شناخت کے تعین کی کوشش کی ہے۔ اگر کہیں انفرادی فن پارے کے تجزیے کی بحث آئی بھی ہے، تو وہ یا تو ادبی انفرادیت اور تخلیقی عمل کے سانی امتیازات کے ضمن میں ہے، یا پھر کسی ادبی مسئلے کو واضح کرنے کے لیے اسلوبیاتی تجزیے سے مدد لی ہے، جیسا کہ پرچم چند کے فن میں IRONY کا عنصر یا ”نیا نثر“ علامت، تمثیل اور کہانی کا جوہر“ والے مضمون میں کیا گیا ہے۔ اتنی بات ظاہر ہے کہ کسی فن پارے کا مجرّد اسلوبیاتی تجزیہ کرنا جتنا آسان ہے، فن پارے یا فن پاروں کو مصنف یا شاعر کی پوری تخلیقی شخصیت سے جوڑنا اور انفرادی سانی امتیازات کی نشاندہی کرنا یا کسی صنف یا عہد کے تناظر میں ان کا تجزیہ کرنا اتنا ہی مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ خاکسار نے جو بھی بُرا بھلا کام کیا ہے، وہ اسی نوعیت کا ہے۔ یہ بنیادی فرق ہے اور اس تنقیدی فرق کو چونکہ بالعموم محسوس نہیں کیا جاتا، اور ساری سانی تنقید کو ایک ہی لاکھی سے ہانک دیا جاتا ہے، اس لیے اس کی وضاحت ضروری تھی۔

دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ جہاں دوسروں نے زیادہ تر شاعری کی تنقید سے سروکار رکھا، خاکسار نے فکشن کے مطالعے میں بھی اسلوبیات سے کام لیا ہے اور اس کے جو بھی اچھے بُرے نمونے پیش کیے ہیں، وہ سب کے سامنے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ خاکسار نے اگرچہ صوتیات سے مدد لی ہے، لیکن صرف صوتی سطح پر تکیہ نہیں کیا، بلکہ لفظیاتی اور نحو یاتی سطحوں سے بھی مدد لی ہے۔ ”ذاکر صاحب کی نثر“ اور

”خواجہ حسن نظامی“ والے مضامین سے قطع نظر ”اسلوبیاتِ اقبال“ اور ”اسلوبیاتِ میر“ کے تجزیات میں ساری بحث ہی لفظیاتی اور نحویاتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ نتائج سامنے نہ آتے جو اخذ کیے گئے ہیں۔

چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ خاکسار نے اگرچہ بعض تجزیے بلاشبہ انتہائی تکنیکی پیش کیے ہیں (مثلاً ”اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام“ یا ”اسلوبیاتِ امیس“) لیکن یہ خاکسار کا عام انداز نہیں ہے۔ چند تکنیکی تجزیے اس لیے ضروری تھے کہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ تنقید کو جو موضوعی اور ذہنی عمل ہے، سائنسی معروضی بنیادوں پر استوار کیا جاسکتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ تجزیے عام قارئین کے لیے نہیں تھے۔ لیکن یہ تجزیے عمداً کیے گئے تھے اور ان کا مقصد تنقید کی سائنسی معروضی بنیادوں کو واضح کرنا تھا۔

بالہوم خاکسار نے ایک الگ راہ اختیار کی ہے اور اسلوبیات کو ادبی تنقید میں ضم کر کے پیش کیا ہے۔ ایسا میرے ادبی مزاج کی وجہ سے بھی ہے۔ فکشن پر تنقید کے علاوہ اس نوع کی نسبتاً تفصیلی مثال ”اسلوبیاتِ میر“ والا مقالہ ہے جس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ میرا عام انداز اسلوبیات اور ادبی تنقید کو ملا کر بات کرنے کا ہے۔ ”اسلوبیاتِ میر“ میں سارے ادبی مباحث اپنی ذہنی غذا اسلوبیاتی تجزیے سے حاصل کرتے ہیں، اور یہ اسلوبیاتی تجزیہ بخوبی بھی ہے، صہنی بھی، اور صوتیاتی بھی، لیکن تجزیہ زیادہ تر آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے اور اگر کہیں سطح پر ظاہر ہوا بھی ہے تو بھی تکنیکی معلومات سے گراں بار نہیں ہوتا، اور قاری کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ صبرِ اسی کو ”جامع اسلوبیات“ کہہتا ہوں۔ یعنی ادبی مطالعے میں میرا ذہنی ردِ عمل (RESPONSE) کچھ اس طرح کا ہے کہ میں اسلوب اور معنی کا مطالعہ الگ الگ نہیں کرتا۔ بلکہ صوت، لفظ، کلمہ، ہیئت، معنی، مجموعی طور پر بیک وقت کارگر رہتے ہیں، اور اگر کسی نکتے کو واضح کرنے یا اس کا سراغ لگانے کے لیے کسی ایک سانی سطح کو الگ کرنے کی کوئی خاص ضرورت پیش نہ آئے تو میرا ذہنی ردِ عمل کئی ہوتا ہے جزوی نہیں۔ اور کسی ایک سطح کو الگ کرنا ضروری بھی ہو تو اس عمل کے دوران بہر حال یہ احساس حاوی رہتا ہے کہ سطحوں کا الگ کرنا مبحث کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ہے ورنہ بذاتہ یہ ایک مصنوعی عمل ہے،

اور ہر سطح یعنی جز اپنی کُل کے ساتھ مل کر لسانی وحدت بنتا ہے اور ترکیبِ حیطِ معنی میں کارگر ہوتا ہے۔ گویا اسلوبیات میرے نزدیک محض ایک حربہ ہے، کُل تنقید ہرگز نہیں۔ تنقیدی عمل میں اس سے بیش بہا مدد لی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ تاثراتی اور جمالیاتی طور پر چورائے قائم کی جاتی ہے، اسلوبیات اس کا کھرا کھوٹا پرکھ کر تنقید کو ٹھوس تجزیاتی سائنسی معروضی بنیاد عطا کر سکتی ہے۔ واضح تکنیکی تجزیوں کا جواز فقط اتنا ہے کہ ان سے تنقیدی نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اگر اسلوبیات کا جوہر ذہن میں جاگزیں ہو گیا ہے تو غیر تکنیکی تجزیہ متن کی قرأت کے دوران ذہن و شعور میں احساس کی رو کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، اور میں اسی کو "جامع اسلوبیات" کہتا ہوں۔ یہی حقیقت ہے کہ مجھے اپنے تنقیدی عمل میں زبان کی ظاہری سطحوں کو کُل معنیاتی نظام کے ساتھ ساتھ لے کر چلنے میں ساختیات سے بھی مدد ملتی ہے، جس کی کھلی ہوئی مثالیں "ساختہ کر بلا بطور شعری استعارہ" یا "فیض کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام" یا فیکشن پر خاکسار کے مضامین میں مل جائیں گی۔ لیکن ساختیات ایک الگ موضوع ہے اور اس کو کسی دو سو وقت کے لیے اٹھا رکھا جاتا ہے۔

35150

جہاں تک مصادر کا تعلق ہے، اسلوبیات پر انگریزی اور فرانسیسی میں سینکڑوں مضامین اور کتابیں ہیں۔ ان میں لسانیات کے ماہرین کی تصانیف بھی ہیں اور ادبی نقادوں کی بھی۔ اسلوبیات کے موضوع پر کئی بین الاقوامی سیمینار اور کانفرنسیں بھی منعقد ہو چکی ہیں جن کی رودادوں میں وہ اہم مقالات بھی ملیں گے جنہوں نے ان مباحث کو آگے بڑھانے میں اور اسلوبیات کو ایک ضابطہ علم کی حیثیت سے مستحکم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ذیل کے مجموعہ ہائے مضامین اس بارے میں کتب حوالہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسلوبیات کو جاننے کے لیے ان سے اور اوپر جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے، ان سے رجوع کرنا نہایت ضروری ہے:

1. THOMAS A. SEBEOK, ED., STYLE IN LANGUAGE, 1960.
2. ROGER FOWLER, ED., ESSAYS ON STYLE AND LANGUAGE, 1966.
3. GLEN A. LOVE, AND MICHAEL PAYNE, EDS., CONTEMPORARY ESSAYS ON STYLE, 1969.

4. DONALD C. FREEMAN, ED., LINGUISTICS AND LITERARY STYLE, 1970.
5. SEYMOUR CHATMAN, ED., LITERARY STYLE: A SYMPOSIUM, 1971.
6. HOWARD S. BABB, ED., ESSAYS IN STYLISTIC ANALYSIS, 1972.

اسلوبیات پر بعض تعارفی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، ان میں سے میرے نزدیک ذیل کی کتابیں اہم ہیں :

1. EPSTEIN, E.L., LANGUAGE AND STYLE, LONDON, 1978.
2. ENKVIST, SPENCER, AND GREGORY, LINGUISTICS AND STYLE, OXFORD, 1964.
3. WIDDOWSON, H.G., STYLISTICS AND THE TEACHING OF LITERATURE, LONDON, 1988.
4. CHAPMAN, RAYMOND, LINGUISTICS AND LITERATURE, LONDON, 1975.
5. ENKVIST, N.E., LINGUISTIC STYLISTICS, HAGUE, 1973.
6. HOUGH, G., STYLE AND STYLISTICS, LONDON, 1969.

اسلوبیات کو کسی خاص ملک، قوم یا نظریے سے وابستہ کرنا بھی بے خبری کی وجہ سے ہے۔ اس کو ترقی دینے والوں میں سب شامل رہے ہیں۔ اسلوبیات پر لکھنے والوں میں روسی ہیئت پسندوں RUSSIAN FORMALISTS نے بھی نمایاں حصہ لیا ہے، اور فرانسیسی، برطانوی، جرمن اور امریکی ماہرین لسانیات بھی پیش پیش رہے ہیں۔ ان میں ممتاز ترین نام رومان جکیب سن، لیوس پیٹرز، مائیکل رفاٹیر، سٹیفن المان، اور رچرڈ اوہان کے ہیں۔ ان کے اردو سے بہت سے اہم لکھنے والوں کے مقالات اور مباحث ان کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں جن کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا۔

(۱۹۸۸ء)

اُسُوبِیَاتِ مِیْر

۱

دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

تذکرہ خوش معرکہ زیبا از سعادت خاں ناصر لکھنوی (۱۲۶۱ھ) سے روایت ہے
”ایک دن سراج الدین علی خان آرزو نے جو کہ میر تقی میر کے سوتیلے ماموں تھے کہا کہ
آج میرزا رفیع سودا آئے اور یہ مطلع نہایت مباحث کے ساتھ پڑھ گئے:

چمن میں صبح جو اوس جنگجو کا نام لیا

صبا نے تیغ کا آبِ رواں سے کام لیا

میر نے اوس کو سن کر بدیہہ یہ مطلع پڑھا:

ہمارے آگے ترا جب کسوں نے نام لیا

دلِ ستم زدہ کو اپنے تھام تھام لیا

خان آرزو فرطِ خوشی سے اوجھل پڑے اور کہا خدا چشمِ بد سے محفوظ رکھے: ”یہ غزل دیوانِ
اول میں سات شعر کی موجود ہے۔ البتہ دوسرا مصرع یوں ہے / دلِ ستم زدہ کو ستم نے
تھام تھام لیا /۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں میر کے جس شعر سے سب سے پہلے
بحث کی ہے وہ یہی مطلع ہے اور لکھا ہے ”ایسے دھیمے الفاظ میں وہی لوگ جوش

کو قائم رکھ سکتے ہیں جو میٹھی چھری سے تیز خنجر کا کام لینا جانتے ہیں اور اس جوش کا پورا پورا اندازہ کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو صاحبِ ذوق ہیں۔“

ذکرِ میر میں میر نے صراحت کی ہے ”جو لوگ درویش (والد) کی زندگی میں میری خاکِ پا کو سُرْمہ سمجھ کر آنکھوں میں لگاتے تھے، اب انھوں نے یکبارگی مجھ سے آنکھیں پُرا لیں ناچار پھر دہلی گیا اور اپنے بڑے بھائی کے ماموں سراج الدین علی خان آرزو کا منت پذیر ہوا۔“ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ اس وقت میر کی عمر کوئی پندرہ برس ہوگی۔ میر نے لکھا ہے کہ ”جب میں کسی قابل ہوا تو سوتیلے بڑے بھائی کا خط پہنچا۔“ میر محمد تقی فتنہ روزگار ہے ہرگز اس کی تربیت میں سعی نہ کی جائے وہ عزیز (سراج الدین علی خان آرزو) واقعی دنیا دار شخص تھا اپنے بھانجے کے لکھنے پر میرے درپے ہو گیا... میرے ساتھ ان کا سلوک ایسا تھا جیسا کسی دشمن سے ہوتا ہے اگر ان کی تفصیل بیان کروں تو ایک دفتر ہو جائے۔“ گویا میر کچھ ہی مدت کے بعد خان آرزو سے الگ ہو گئے۔

ذکرِ میر اور نکات الشعرا کے بیانات سے ظاہر ہے کہ تذکرہ خوش معرکہ زیبا کی سودا کے مطلع پر مطلع کہنے کی روایت شروع جوانی کی ہے جب میر کی عمر پندرہ سترہ برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ یہی زمانہ میر کے جوشِ وحشت کا بھی ہے جب انھیں اس قدر رنج اور تکلیف پہنچی کہ ان کی حالت جنون کی سی ہوگئی۔ میر اور سودا کی عمروں میں جو فرق ہے اس کے پیش نظر اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ میر جب شعر کہنا شروع کرے تھے اس وقت سودا شہرت کے درجے پر فائز ہو چکے تھے۔ (سودا ۱۷۱۳-۱۷۸۰) میر تقی میر (۱۷۲۲-۱۷۸۱)۔ میر نے طویل عمر پائی، ان کی استاد کی لوہا سب نے مانا اور ان کے شاعرِ دل پذیر اور سخنِ سنج بے نظیر ہونے کا اعتراف بھی سب نے کیا لیکن میر کی تمام زندگی پر سودا کی شہرت کا سایہ برابر لہراتا رہا ہے اور اکثر تذکرہ نگاروں

نے بشمول تذکرہ ہندی (مصحفی) گلشن ہند (میرزا علی لطف) اور گلشن بے خار (مصطفیٰ خاں شیفتہ) سودا سے میر کا موازنہ کرتے ہوئے میر کے بارے میں اعتدار کا لہجہ اختیار کیا:

”اکثرے درفن ریختہ اورا درپلہ مزار رفیع سودا گرفتہ اند و اکثر در غزل
 مثنوی بہتر از مرزا قیاس می کنند و مرزا را در، بجز و قصیدہ بر او فضیلت می
 دہند۔ غرض ہرچہ ہست استادی ریختہ بر و مسلم است۔“ (تذکرہ ہندی)

”سچ تو یہ ہے کہ نظم غزل میں ید بیضار رکھتا ہے۔ قصیدہ تو ختم میرزا محمد
 رفیع سودا پر ہوا، ہاں طرز مثنوی کی بھی ان کی خوب ہے۔“ (گلشن ہند)

”پست و بلند کہ در کلامش بینی و رطب و یابس کہ در ابیانش بنگری نظر نہ
 کنی و از نظرش نیفلنی“ (گلشن بے خار)

منفرد لہجے کی شناخت

اس تناظر میں میر کے مندرجہ بالا مطلع کو دیکھیے تو ایک دل چسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ شروع ہی سے میر کا مزاج اپنے پیشرووں سے بالکل مختلف تھا۔ ان کا جوہر ذاتی اس نوع کا تھا اور تخلیقی اُپج ایسی زبردست تھی کہ شروع جوانی ہی سے میر اپنے عہد کے مزاج سے ہٹ کر شعر کہہ سکتے تھے اور اپنی طرزِ گفتار اور انفرادی لہجے کا انہیں شدید احساس بھی تھا اور نہ سودا جیسے مسلم الثبوت شاعر کے مطلع پر بدیہہ مطلع کہنے کی ہمت کیونکر کرتے۔ نوجوانی کی اس ایک بیت سے کسی ایسے عناصر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو بعد میں میر کے شعری اسلوب اور طرزِ گفتار کی شناخت بن گئے۔ سودا کا مطلع معمولی نہیں۔ چمن، صبا، صبح، تیغ، آبِ رواں میں معنوی اور صوتی نسبتیں ہیں نیز جنگجو کی رعایت سے صبا کا آبِ رواں سے تیغ کا کام لینا بھی خالی از لطف نہیں لیکن میر کے مطلع میں دل کو چھو لینے والی جو کیفیت ہے، سودا کا مطلع اس سے خالی ہے۔ کیوں؟

شعر میں معنویت، تصویریت، کیفیت سب لفظوں ہی کے ذریعے پیدا ہوتی ہے اور زبان کا تخلیقی استعمال ہی شاعر کی اُچھ، فطری جوہر، جوش جذبات اور زورِ تخیل کی بنیادی کلید فراہم کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو اس مطلع میں میر کی فطری افتاد نے ان کے لہجے کو کس طرح یکلخت سودا سے الگ کر دیا ہے۔ اسلوبیات کی معمولی مدد سے جس کا نام آتے ہی کمر میں تکیے لگا کر انشا پر دازی کرنے والے نام نہاد نقادوں کی نیندیں اُچاٹ ہو جاتی ہیں، اس بارے میں کیسی مدد مل سکتی ہے۔ سودا کے شعر میں چمن، صبح، جنگو، صبا، تیغ، آب، کام، کیا ہیں؟ یہ سب اسم ہیں۔ پورا مصرع سات اسما کا مجموعہ ہے۔ اب میر کا مطلع دیکھیے۔ علاوہ لفظ نام کے جو دونوں شعروں میں مشترک ہے، سارے شعر میں صرف ایک اسم ہے، دلِ ستم زدہ، اور شعر کا پورا معنیاتی نظام اس ایک اسم کے گرد گھومتا ہے۔ اس سے معنی کی ترسیل اور کیفیت پیدا کرنے میں جو مدد ملتی ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ بادی النظر میں محسوس یہی ہوتا ہے کہ میر نے بول چال کی زبان استعمال کی ہے اور اس کا اعادہ ہماری میریات کی پوری تنقیدی روایت میں ہوتا رہا ہے حالانکہ اس سے زیادہ غلط بات میر کے اسلوب شعر کے بارے میں کہی ہی نہیں جاسکتی اور اس سے بحث آگے آئے گی کہ میر کی زبان محض بول چال کی زبان نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میر کا صرفی اور نحوی ڈھانچہ عام اردو کا ہے۔ لیکن لفظوں کے سُر الگ ہیں۔ متعدد اسلوبیاتی امتیازات کے باعث میر کا لہجہ ایسی شدید انفرادیت رکھتا ہے کہ میر کا شعر پڑھتے یا سنتے ہی فوراً محسوس ہوتا ہے کہ یہ لہجہ دوسروں سے الگ ہے۔

رفتہ رفتہ میر کی آواز پورے عہد پر چھا جاتی ہے۔ میر کا یہ دعویٰ غلط نہیں:

اگرچہ گوشہ نشین ہوں میں شاعروں میں میر
 پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

دیکھتے ہی دیکھتے شعر میر نے زمانے کا مذاق بدل کر رکھ دیا۔ سودا کی اہمیت اپنی جگہ قائم رہی لیکن مقبولیت میں میر کہاں سے کہاں نکل گئے۔ سید عبداللہ نے اشارہ کیا ہے کہ سودا کے ایک شاگرد نے اپنے ایک قصیدے میں شکایت کی ہے کہ جو شاعر ظہوری اور نظیری کے انداز میں شعر لکھتا ہے، لوگ اس پر ایسے شاعر کو ترجیح دے رہے ہیں جو لہجہ عام میں شعر کہتا ہے :

جو ایسی زباں میں ہو غزل اس کو کہیں بد

اور لہجے میں ہو عام کے سو پائے وہ توقیر

یعنی نظیری اور ظہوری کے لہجے میں غزل کو (اس انداز کو جسے سودا نے اپنایا ہے) اب بُرا سمجھا جانے لگا اور لہجہ عام کی شاعری (یعنی میر کے انداز) کی قدر بڑھ گئی ہے۔ میر کا سب سے بڑا اعجاز یہی ہے کہ فوری احساس یہی ہوتا ہے کہ وہ لہجہ عام کے شاعر ہیں حالانکہ یہ نظر کا دھوکا ہے، اور یہ سلسلہ دو صدیوں سے چل رہا ہے۔ اصلاً میر کا آرٹ فریبِ نظر کی کیفیت رکھتا ہے۔ اس کا کمال یہی ہے کہ اس آرٹ پر آرٹ کا شائبہ نہیں ہوتا یعنی سادگی کے ساتھ میر کی پُرکاری اس درجہ تہ نشیں ہے کہ بظاہر سادہ ہی سادہ معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ میر نے بار بار تنبیہ کی ہے :

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے

ہمیں تو لگے ہے وہ عیار سا

میر بار بار دعویٰ کرتے ہیں اگرچہ ان کو گفتگو عوام سے ہے لیکن ان کے شعر خواص پسند ہیں۔ عوام سے گفتگو ایک نوزائیدہ زبان کے اپنے آپ میں آنے کا ثبوت تھا لیکن اشعار کا خواص پسند ہونا ادائے خیال، لطفِ بیان اور حسنِ کاری کے ان تمام تقاضوں کو پورا کیے بغیر ممکن نہیں تھا جو غزل کی صدیوں کی شعری روایت کا حصہ بن چکے تھے۔ یعنی بغیر شدید نوعیت کی پُرکاری کے خواص کی پسندیدگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

نکات الشعرا کی بحث اور ”انداز“

میر نے بھی قائم کی طرح کئی جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے کہ معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا۔ اردو اس وقت ایک کچی پٹی آن گھڑ زبان تھی جس کے بنانے اور نکھارنے میں میر اور ان کے معاصرین نے زبردست کردار ادا کیا۔ اس وقت زبان کئی سمتوں میں سفر کر سکتی تھی۔ تذکرہ نکات الشعرا کی بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کو اردو کی ان وسعتوں اور بعض ابتدائی معذوریوں کا پورا اندازہ تھا۔ انھوں نے نکات الشعرا میں ریختے کی چھ قسمیں بیان کی ہیں۔ اول ایک مصرع فارسی اور ایک مصرع ہندی جس کی مثال امیر خسرو کے قطعے سے دی ہے۔ دوم آدھا مصرع ہندی اور آدھا فارسی اس کی مثال میر معز کے شعر سے دی ہے۔ سوم حرف و فعل فارسی میں لائے جائیں اسے میر نے قبیح قرار دیا ہے۔ پنجم ایہام کہ شاعر ان سلف میں اس کا رواج تھا اب اس صنعت کی طرف توجہ کم ہے جب تک نہایت شستگی کے ساتھ نظم نہ ہو۔ چوتھی اور چھٹی شق کی ذیل میں میر نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے لہجے کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ چوتھی قسم ترکیبوں کے استعمال کے بارے میں ہے۔ میر کا کہنا ہے کہ ”جو ترکیبیں زبان ریختے کے موافق ہیں، ان کا صرف جائز ہے۔ اس کی تمیز غیر شاعر نہیں کر سکتا۔ جو ترکیب نامانوس ہیں ریختے کے لیے معیوب ہیں۔ اس کی شناخت سلیقہ شاعر پر موقوف ہے۔ فقیر کا مسلک یہی ہے۔“ (اردو ترجمہ) چھٹی شق کی ذیل میں میر تقی میر نے ”انداز“ کی وضاحت کی ہے اور لکھا ہے ”اسے ہم لوگوں نے اختیار کیا ہے جو تمام صنائع پر محیط ہے، تجنیس، ترصیع، تشبیہ، گفتگو کی صفائی، فصاحت، بلاغت، ادا بندی، خیال وغیرہ یہ سب اسی ضمن میں آتے ہیں۔ فقیر بھی اسی وتیرے سے خوش ہے۔“ (اردو ترجمہ) میر نے مزید وضاحت کی ہے ”جو شخص اس

فن میں طرزِ خاص کا مالک ہے میرا مطلب سمجھتا ہے۔ عوام سے مجھ کو سروکار نہیں۔ احباب کے لیے میرا قول سند ہے ہر شخص کے لیے نہیں کیونکہ میدانِ سخن وسیع ہے اور چمنستانِ ظہور کا تلون آشکار ہے“ (اردو ترجمہ) چنانچہ چوتھی اور تھپٹی شق سے ظاہر ہے کہ میر صرف ان فارسی ترکیبوں کا صرف جائز سمجھتے تھے جو زبانِ ریختہ کے موافق ہوں اور اس کی شناخت کے لیے انھوں نے سلیقہ شاعر کو ضروری قرار دیا۔ نیز اس ”انداز“ کو جو تمام صنائع پر محیط ہے میر نے اپنا طرزِ خاص کہا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میریات کی تنقیدی بحث میں اس پہلو کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا گیا۔ میر کو خداے سخن تو سب نے تسلیم کیا، ان کی بارگاہِ عظمت میں سر بھی سب نے جھکایا، اور ان کی شہرت کا ڈنکا بھی بجتا رہا، لیکن میر کی تنقیدی بازیافت کی راہ میں حالی، مولوی عبدالحق اور اثر لکھنوی نے جو بنیادی اقدام کیے، اگرچہ مولوی عبدالحق اور اثر لکھنوی دونوں کے پیش نظر نکات الشراکا یہ بیان تھا، تاہم اردو کی ابتدائی تنقید محمد حسین آزاد کی اس مغالطہ آمیز رائے سے دھوکا کھاتی رہی۔ ”انھوں نے جس قدر فصاحت اور صفائی پیدا کی اتنا ہی بلاغت کو کم کیا“ یوں میر کی سادگی نظروں میں رہی اور میر کے کمال کی دوسری جہات پوری طرح زیرِ بحث نہیں آئیں بالخصوص وہ چیز جسے میر نے ”انداز“ سے تعبیر کیا تھا جو صرف لفظوں کی سادگی، سلاست، صفائی، گھلاوٹ سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ کسی حد تک اس کی ضد تھی۔ سید عبداللہ نے میر کے ”انداز“ سے بحث کی لیکن انھوں نے بھی اصرار سادگی ہی پر کیا۔

اس میں شک نہیں کہ اثر لکھنوی نے میر کے بعض اشعار کا بہت اچھا معنوی تجزیہ کیا۔ انھیں میر سے سچی عقیدت تھی لیکن ان کی معنوی وضاحتیں تجزیے سے زیادہ کہفیات کا اظہار ہیں۔ بہت زور مارتے ہیں تو ان کی تان ایسے بیانات پر ٹوٹی ہے:

”میر کے یہاں عجیب و غریب سلاست و روانی ہے، درد و حسرت کی ہے۔ اور بس“

اس میں شبہ نہیں یہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔ میر کے یہاں سادگی، سلاست، درد و حسرت کی بھی ہے، ان کے اکثر اشعار سہل ممتنع بھی ہیں، لیکن بات صرف اتنی نہیں۔ اسلوب میر کی اور جہتیں بھی ہیں اور جب تک ان سب کو نظر میں نہ رکھا جائے میر کے ”انداز“ کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ میر اردو کے پہلے بڑے شاعر ہیں جن کے یہاں اردو کی جتنی شانیں، جتنے ذیلی اسالیب اور جتنی لسانی جہات ملتی ہیں اتنی بعد کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتیں۔ غالب اور اقبال کی عظمت مسلم، لیکن غالب یا اقبال کے شعری اسالیب میں اتنا لسانی تنوع نہیں ہے۔ تاریخ کے مختلف لمحات میں رائج ہونے والے مختلف اسالیب کے مختلف دھاروں کے باہم موج زن ہونے سے جو کیفیت میر کے یہاں پیدا ہوتی ہے، بعد میں وہ کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اس حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ اقبال کے شعری اور معنیاتی اسلوب کا جو رشتہ غالب سے ہے وہی رشتہ غالب کے شعری اسلوب کا میر سے ہے۔ غالب کی بہار ایجابی بیدل اپنی جگہ پر لیکن مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے صحیح وضاحت کی ہے کہ غالب کے شعری اسلوب کے اکثر حوالے میر سے نکلتے ہیں۔ میر کے یہاں شعری زبان کی وہ کیفیت بھی موجود ہے جو گنجینہ معنی کی طلسم کاری سے عبارت ہے جسے غالب نے منہتہ کمال کو پہنچا دیا اور علاوہ اس کے میر کے یہاں دوسری شانیں بھی ہیں۔ میر کی پہچان بالعموم سادگی اور سلاست والی شان سے ہوتی رہی ہے جو تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ میر کی زبان کا سب سے بھرپور تجزیہ وحید الدین سلیم نے کیا تھا۔ یہ تجزیہ گرامر کی حد تک جامع ہی نہیں مانع بھی ہے۔ ان کا یہ مضمون اس حد تک SEMINAL ثابت ہوا کہ بعد میں میر کی زبان کی ساری بحثیں اسی سے متاثر رہیں۔ لیکن یہ تجزیہ صرف لفظی اور صرفی نوعیت کا ہے۔ لفظیات اور صرفیات کے امتیازات اس طرح شعر کا حصہ بنتے ہیں اور میر کے یہاں ان سے کیا جادو پیدا ہوتا ہے، یا

میر کے یہاں اندازِ شعر کی تشکیل میں ان عوامل کی کارفرمائی کیونکر ہوتی ہے، اس کا تذکرہ انھوں نے نہیں کیا اور شاید اس لیے بھی نہیں کیا کہ ان کے زمانے میں زبان کے تجزیے کے جو محدود تصورات تھے، وہ ان سے آگے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔

بنیادی اسلوبیاتی امتیازات

اندازِ میر کی بحث میں یہ بات خاطر نشان رہنی چاہیے کہ کسی ایک مثال یا ایک طرح کی مثالوں سے میر کے انداز کو سمجھنا سطحیت کو راہ دینا ہے۔ ایسی کوئی کوشش ایک طرف، ادھوری، اور یک رُخی ہوگی۔ چنانچہ اس کے لیے ایک طرف نہیں بلکہ بیک وقت کئی اطراف میں دیکھنا ضروری ہے۔ کچھ باتیں تجزیے اور وضاحت کی زد میں آتی ہیں اور کچھ نہیں بھی آتیں۔ تاہم منطقی زبان کی یہ کمزوری ہے کہ جب بحث کی جائے گی تو SERIAL ہوگی۔ لیکن یاد رہے کہ اسلوبیاتی امتیازات ہرگز SERIAL نہیں ہوتے۔ یہ پرت در پرت بیک وقت وارد ہوتے ہیں اور اس حد تک باہم دگر مربوط ہوتے ہیں کہ انھیں الگ الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اور یہ تخلیقی عمل کے منافی بھی ہے تاہم بحثِ شعر میں یہ عمل ناگزیر ہے۔ یہاں پہلے میر اور غالب کی ایک ایک ہم طرح غزل کو لیا جاتا ہے۔ مزید گفتگو اس کے بعد ہوگی:

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کا ٹاپیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی، خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
 چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبت بدنام کیا
 کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام
 کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
 شیخ جو ہے مسجد میں ننگا، رات کو تھا میخانے میں
 جُستہ، خرقة، کرتا، ٹوپنی، مستی میں انعام کیا
 یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
 رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو توں توں شام کیا
 صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیف ہوا لے آئی تھی
 رُخ سے گل کو مول لیا قامت سے سرو غلام کیا
 ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیے
 بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا
 ایسے آہوتے رم خوردہ کی وحشت کھونی شکل تھی
 سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا
 میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
 قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

وحشی بن صیاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا
 رشتہ چاک جیب دریدہ صرف قماشِ ام کیا
 عکس رخِ افروختہ تھا تصویر بہ پشتِ آئینہ
 شوخ نے وقتِ حسن طرازی تمکین سے آرام کیا

ساقی نے ازبہر گریباں چاکی موجِ بادہٴ ناب
 تارِ نگاہِ سوزنِ مینارِ شستہ خطِ جامِ کیا
 مہر بجائے نامہ لگائی بر لبِ پیکِ نامہ رساں
 قائلِ تمکینِ سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا
 شامِ فراقِ یار میں جو شہِ باخیرہ سری سے ہم نے آمد
 ماہ کو در تسیحِ کواکب جائے نشینِ امام کیا

میر کی غزل ان کی ابتدائی غزلوں میں ہے اور دیوانِ اول میں شامل ہے۔ اس میں گلِ پندرہ شعر ہیں جن میں سے صرف گیارہ کو یہاں نقل کیا گیا ہے۔ غالب کی غزل بھی ابتدائی دور سے متعلق ہے اور نسخہٴ حمید یہ میں ملتی ہے۔ ان غزلوں کا موازنہ کرتے ہوئے سید عبداللہ نے لکھا ہے ”ان مماثل غزلوں میں ایک آدھ شعر کے سوا مضمون اور اسلوب کی کوئی مشابہت نظر نہیں آتی۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ غالب اس غزل کی رواں دواں اور پُر جوش و پُر تر تم بحر سے محظوظ ہوئے مگر اس دل بستگی کے باوجود میر کے سب قوانی غالب سے نبھ نہیں سکے۔ غزل کو پانچ اشعار تک پہنچا کر ختم کر دیا ہے۔ میر کی پُر تاثیر غزل کے مقابلے میں غالب کی یہ غزل محض چند رنگین الفاظ کا مجموعہ ہے مگر اس سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کی فطرت اپنے لیے کسی مقامِ بلند کی تلاش میں بیچ و تاب کھا رہی ہے اور کسی روشن مستقبل کے لیے آمادہ ہو رہی ہے“ (نقدِ میر ۲۸۱) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دونوں غزلیں اپنے اپنے اسلوب کی نمائندہ ہیں۔ غالب کے مطلع میں اسما اور اسمائے صفات نو ہیں؛ وحشی، صیاد، رم خوردوں، رشتہ، چاک، جیب، دریدہ، قماش، دام۔ میر کے یہاں کیا ہے؟ پہلے مصرع میں تدبیریں اور دوا اور دوسرے میں بیماریِ دل اور ان کی ساخت یوں ہے، تدبیروں کا اُلٹا ہو جانا، دوا کا کام نہ کرنا اور بالآخر بیماریِ دل کا کام تمام کرنا۔ آپ نے دیکھا شعر میں صرف تین اسما ہیں

اور تین نحوی اکائیاں ہیں اور ہر ایک کی تکمیل فعل سے ہوتی ہے۔ ان تینوں افعال کو ”دیکھا“ کے صرف سے جو بجائے خود ایک فعلیہ اکائی ہے شاعر نے بیماریِ دل کے آخر کام تمام کرنے کی معنویت کو پوری طرح راسخ کر دیا۔ غالب کے یہاں دوسرے شعر میں بھی دس اسما ہیں، جبکہ میر کے یہاں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ بالعموم شعر کے دو مصرعوں میں دو نحوی واحد سے ہوتے ہیں یا اگر ایک مصرع دوسرے سے نحوی اعتبار سے جڑا ہوا ہو تو ایک ہی نحوی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ میر کے یہاں ایسا نہیں، طویل بحر کی اس غزل میں تین تین چار چار نحوی ٹکڑے ملیں گے: اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں / کچھ نہ دوا نے کام کیا / دیکھا / اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا / اسی طرح / عہدِ جوانی رور و کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند / یعنی رات بہت تھے جاگے / صبح ہوئی آرام کیا۔ یہ پہلا خطِ امتیاز ہے جو میر اور غالب کے اسالیب کے بیچ کھینچا جاسکتا ہے یعنی میر کی زبان میں اسما یا اسمائے صفت کی بھرمار نہیں۔

دوسرے یہ کہ میر کے یہاں طویل بحروں میں بھی چھوٹے چھوٹے نحوی واحد سے ہیں جو معنیاتی NODES کی طرح کام کرتے ہیں اور فوری ترسیلِ جذبات یا تاثیر میں مدد بہم پہنچاتے ہیں۔

تیسرے اسما کی قلت و کثرت سے مضاف اور مضاف الیہ کا رشتہ اور اضافت کا کردار بھی متاثر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ سامنے کی بات ہے لیکن غیر اہم نہیں ہے۔ غالب کا ہر شعر اس کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

چوتھے یہ کہ اسلوبِ میر میں اُلٹی ہو گئیں، رور و کاٹا، آنکھیں موند، ہاتھ میں لاکے چھوڑ دیے، بھولے اس کے قول و قسم پر، وحشت کھونی، قشقہ کھینچا، سے صاف ظاہر ہے کہ میر کی زبان اپنی طاقت دھرتی کی گہرائیوں میں پیوست پراکرتوں کی جڑوں سے بھی حاصل کر رہی ہے۔ غالب کی زیر نظر غزل میں ایک بھی معکوسی یا ہکار آواز نہیں آئی۔ کیوں؟ کیا

اس سے اردو زبان کے صرف ایک رُخ کی تصویر سامنے نہیں آتی؟ یہ بات نہیں ہے کہ غالب کی ساری شاعری میں ایسی امتیازی آوازیں نہیں آتیں، آتی ہیں لیکن کم کم۔ میر کے یہاں ان کا عمل دخل فطری ہے جسے اردو کے اردو پن یا ٹھیٹھ پن سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ اسلوب میر کا صرف ایک وسیلہ ہے۔ میر جس طرح فطری زبان کو شعری زبان کے درجے تک لے آتے ہیں اور اسے شعر میں کھیلتے ہیں، وہ الگ بات ہے۔

پانچویں یہ کہ میر کے یہاں مصوتوں کا استعمال اور بالخصوص طویل مصوتوں کا استعمال دوسرے صاحب اسلوب شعرا کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ میر کے یہاں قوت پرواز بھی ہے اور گم شدگی، سپردگی، اور حیرت و استعجاب کی کیفیتیں بھی لیکن زبان کے معاملے میں دھرتی سے ان کا رشتہ کہیں نہیں ٹوٹتا۔ موسیقی کے نظام کی طرح ہمارے عروضی نظام میں بھی یہ گنجائش ہے کہ زمانی وقفے تو مقرر ہیں لیکن آوازیں مقرر نہیں۔ چنانچہ مصوتوں کی تعداد فنکار کی تخلیقی قوت کے زیر اثر گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اس سے حروں کے صرف میں شاع کی انفرادی شان اور انفرادی ترقم پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے عروضی نظام کی بنیاد حرف پر ہے۔ یہ مصمتوں اور طویل مصوتوں میں فرق نہیں کرتا۔ چنانچہ ہر بڑے شاعر کے یہاں ان کے صرف کی شان الگ ہی ملے گی۔ اس کا ثبوت میر کی مندرجہ بالا غزل کے ہر شعر سے مل جاتا ہے یوں دیکھیے تو یہ خصوصیت پہلی بنیادی خصوصیت سے بڑی حد تک جڑی ہوئی ہے کیونکہ جہاں نحوی واحدے زیادہ ہوں گے طویل مصوتے بھی افعال کے در آنے سے لامحالہ زیادہ ہوں گے۔ اس بحث کے بعد اب میر کے اشعار کو کہیں سے بھی لیجیے۔ اور ان سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ان کی نحو پر بھی نظر رکھیے، اور دیکھیے کہ ان میں نحوی واحدے کس کثرت سے ہیں اور انہیں کتنی آسانی سے الگ کیا جاسکتا ہے:

دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی / نازک ہے اسرار بہت
 اچھر تو ہیں عشق کی دوہی / لیکن ہے بستار بہت

گرچہ کب دیکھتے ہو / پر دیکھو
 آرزو ہے / کہ تم ادھر دیکھو

ملنے لگے ، ہو دیر دیر / دیکھیے / کیا ہے کیا نہیں
 تم تو کرو ، ہو صاحبی / بندے میں کچھ رہا نہیں

کن نیندروں اب تو سوتی ہے / اے حتم گر یہ ناک
 مڑگاں تو کھول / شہر کو سیلاب لے گیا

دل بہم پہنچا بدن میں / تپ سے سارا تن جلا
 آپٹری یہ ایسی چنگاری / کہ پیرا ہن جلا

خوب ہے اے ابریک شب آؤ / باہم روئے
 پیر نہ اتنا بھی کہ ڈو بے شہر / کم کم روئے

گلی میں اس کی گیا / سو گیا / نہ بولا پھر
 میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا

شہرِ دل آہِ عجب جائے تھی / پر اس کے گئے
ایسا اُجڑا / کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

کیا جانے / کہ چھاتی جلے ہے کہ داغِ دل /
اک آگ سی لگی ہے / کہیں کچھ دھواں سا ہے /

عشق ہمارا آہ نہ پوچھو / کیا کیا رنگ بدلتا ہے /
خون ہوا / دل داغ ہوا / پھر درد ہوا / پھر غم ہے اب /

اب کے بہت ہے شورِ بہاراں / ہم کو مت زنجیر کرو /
دل کی ہوس تک ہم بھی نکالیں / دھو میں ہم کو مچانے دور /

عالم عالم عشق و جنوں ہے / دنیا دنیا تہمت ہے /
دریا دریا روتا، ہوں میں / صحرا صحرا وحشت ہے /

کہتا تھا کسو سے کچھ / تکتا تھا کسو کا منہ /
کل میر کھڑا تھا یاں / سچ ہے / کہ دو انا تھا /

عشق ہمارے خیال پڑا ہے / خواب گیا / آرام گیا /
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے / صبح گیا / یا شام گیا /

oral روایت کا آخری ایمن سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اس کی

میر کا زمانہ آج سے دو ڈھائی سو برس پہلے کا زمانہ تھا۔ میر کے اواخر عمر میں چھاپے خانے کی ابتدا ہو گئی تھی لیکن خود میر کا کلیات فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۱۱ء میں چھپ کر تیار ہوا۔ میر کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ہوا تو گویا خود انھوں نے اپنا کلیات چھپا ہوا نہ دیکھا ہوگا۔ چھاپے خانے کے اثر سے اردو شعر و ادب کے اسالیب پر جو زبردست اثر پڑا اس کو ابھی پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس وقت تک ہمارے ادب کی بہت سی روایتیں نشر میں بھی اور شعر میں بھی کہنے اور سننے کی روایتیں تھیں۔ بعد میں یہ روایتیں رفتہ رفتہ چھپی ہوئی تحریر کی روایتوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ داستان سے ناول کی طرف گریز میں سب سے بڑی عمل کاری شاید اسی عنصر کی ہے۔ اس پس منظر میں دیکھیے تو شاید میر اردو غزل میں کہنے اور سننے کی ORAL روایت کے آخری ایمن ہیں۔ وہ بار بار اس کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ میر کے اشعار میں باتوں کا انداز پایا جاتا ہے۔ محمد حسین آزاد کہتے ہیں ”بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں“ سید عبداللہ نے لکھا ہے ”میر لکھنے سے زیادہ کہنے کے قائل ہیں۔ اس لیے وہ بات اور گفتگو کا انداز اختیار کرتے ہیں“ مثلاً

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا
پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
درد انگیز انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھوے گا

پڑھتے پھرے گے گلیوں میں ان رینختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

میر جا بجا میاں، پیارے، ارے، صاحب، رے کا استعمال کرتے ہیں۔ آپ کے بجائے
تم اور بعض جگہ بول چال کی بے تکلفی میں تم کے بجائے تو بھی لاتے ہیں۔ میر، میر صاحب،
میر جی بھی گفتگو میں مخاطب کے لیے خوب خوب استعمال کیا ہے۔ ان کی شاعری کا عام
انداز یہ ہے گویا باتیں کر رہے ہیں:

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
سے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں
مرتا ہوں میں تو ہاتے رے صرفہ نگاہ کا

جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میر
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

چلانہ اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر
ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

پیار کرنے کا جو خواہاں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھتے تم اتنے پیارے کیوں ہوئے

کچھ کر د فکر مجھ دو آنے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں
منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

سیر کی ہم نے ہر کہیں پیارے
پھر جو دیکھا تو کچھ نہیں پیارے

بُو کیے کھلائے جاتے ہوں نزاکت ہائے رے
ہاتھ لگتے میلے ہوتے ہوں لطافت ہائے رے

کیا خوبی اس کے منہ کی اے غنچہ نقل کریے
تو تو نہ بول ظالم بو آتی ہے دہاں سے

کیا رفتگی سے میری تم گفتگو کرو ہو
کھویا گیا نہیں میں ایسا جو کوئی پاوے

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

مشہور ہیں عالم میں تو کیا، ہیں بھی کہیں ہم
القصد نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

جب سے جواں ہوئے ہو یہ چال کیا نکالی
جب تم چلا کرو ہو ٹھوکر لگا کرے ہے

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دُعا کر میر
کہ اب جو دیکھوں اسے میں، بہت نہ پیار آئے

میر شاعری کے تحریری پہلو کے نہیں سننے یا سنانے کے انداز کے نمائندہ ہیں۔
جگہ جگہ انھوں نے اپنی باتوں کو کہانی یا رام کہانی سے بھی تعبیر کیا ہے :
فرصتِ خواب نہیں ذکرِ بُتوں میں ہم کو
رات دن رام کہانی سی سنا کرتے ہیں

سرگزشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا
سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اس کی

سہلِ منتع اور طبیعت کی روانی / میر دریا ہے سُنے شعر زبانی اس کی /

میر کے سلسلے میں سہلِ منتع کا تذکرہ سب نے کیا ہے۔ غالب نے اپنے ایک خط میں
سہلِ منتع کی دادیوں دی ہے کہ جس کو دیکھ کر خیال ہو کہ ایسا کہنا بہت آسان ہے، لیکن
جب کہنے کی کوشش کی جائے تو ناممکن ہو۔ اس سہلِ منتع کا اسلوبیاتی پہلو یہ ہے کہ
میر کے اشعار میں حیرت انگیز حد تک عام بول چال یا نثر کی نحوی ترتیب برقرار رہتی ہے۔

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ بحر اور وزن کی ضرورتوں کے تحت نحوی ترتیب میں تقدیم و تاخیر ہوتی رہتی ہے۔ اگرچہ اس کی بھی اپنی حد بندیاں ہیں اور جو کچھ بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں بعض نحوی حدود کے اندر ہوتی ہیں لیکن میر کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں اگرچہ کہیں کہیں ضرورتِ شعری کے تحت ایک آدھ لفظ آگے پیچھے آتا ہے لیکن جس بڑے پیمانے پر زبان کی عام ساخت یعنی جملے کی ساخت برقرار رہتی ہے ان کی قدرتِ کلام کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذیل کے اشعار میں یہ بھی دیکھیے کہ دو مصرعوں میں دو NODES کا وقوع فطری ہے (اگر مصرعے نحوی طور پر مربوط ہوں یعنی ایک میں خبر ہو اور دوسرے میں مبتدا تو NODE ایک ہی ہوگا) لیکن میر کے یہاں اکثر و بیشتر تین یا اس سے زیادہ NODES ملتے ہیں، یہ بالذات نحوی واحدے اور ان کی فطری ساخت سہلِ ممتنع کی وہ اسلوبیاتی بنیاد ہے جس کی وضاحت شریات کی قدیم روایت میں ناممکن تھی جیسا کہ مولوی عبدالحق نے بھی اعتراف کیا ہے۔ ”میر کا کلام بہ لحاظ فصاحت و روانی سہلِ ممتنع ہے، اور سہلِ ممتنع کا تجزیہ کر کے الگ الگ اس کی خوبیوں کا گنونا ناممکن ہے۔“

تذکرہ خوش معرکہ زبیا کی یہ روایت خاصی دل چسپ ہے کہ عنفوانِ جوانی میں جب میر جوشِ وحشت میں مبتلا ہوئے تو ہرزہ گوئی پر راغب ہوئے بلکہ رسوائیِ خاص و عام پسند آئی۔ ہر کسی کو دشنام دینا شعار اور سنگ زنی کا روبرو تھا۔ خان آرزو نے کہا اے عزیز دشنام موزوں دعائے ناموزوں سے بہتر ہے۔ اور رخت کے پارہ کرنے سے تقطیعِ شعر خوشتر ہے۔ چونکہ موزوں طبیعت جو ہر ذاتی تھی جو دشنام زبان تک آئی مصرع یا بیت ہوگئی۔ بعد اصلاحِ دماغ و دل کے مزہ شعر گوئی کا طبیعت پر رہا۔ ”دشنام طرازی والی بات صحیح ہو یا نہ ہو لیکن ایک احتجاجی کیفیت اور لہجے کی گھلاوٹ اور دردمندی کے باوجود ایک دبی دبی تلخی میر کی شاعری میں ہے۔ اس کا گہرا رشتہ ان کے جوشِ طبیعت

اور تخلیقی اُبج سے ہے۔ اس روایت میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ”موزونی طبیعت جو ہر ذاتی تھی“ بول چال کی جس نحوی ترتیب کا ذکر اوپر کیا گیا اس کا گہرا تخلیقی رشتہ میر کی حد درجہ موزونی طبیعت اور شدید نوعیت کی روانی کلام سے مل جاتا ہے۔ جب تک طبیعت میں شدید اُبال نہ ہو اور تخلیقی موجیں اندر ہی اندر پیچ و تاب نہ کھاتی ہوں اور ان میں اظہار کے لیے تلاطم برپا نہ ہو لفظ شدت سے شعر کا قالب اختیار نہیں کرتے۔ میر کے یہاں بعض بعض مضامین مثلاً لہو میں نہانا، خون میں ہاتھ رنگنا، آنسوؤں کا سیلاب بن کے بستنیوں اور آبادیوں کو بہالے جانا یا جنگل کو سیراب کرنا، عاشق کا بگولہ، دھواں یا غبار بننا، سایہ دیوار میں بیٹھنا، دل کے اُجڑے نگر میں اکیلے چراغ کا جلنا، ہڈی ہڈی کا گلنا، اُسٹخاں کانپ کانپ جلنا، دل کے مکاں کا اُجڑنا، ہڈیوں کا مٹی میں مل جانا، نقش پایا استخوانوں کا بولنا، خاک سے پھول بن کر نمودار ہونا، یہ اور ایسے بعض دوسرے مرکزی مضامین بار بار بیان ہوئے ہیں۔ ان میں بعض جگہ پیکروں کی بھی تکرار ہے۔ لیکن کسی بھی بحر کا تقاضا یا قافیے کی ضرورتیں میر کی طبیعت کو بند نہیں کر پائیں۔ بحر کوئی ہو، قافیہ کچھ ہو میر کا جوش طبیعت ایسی تمام پابندیوں کو حس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا ہے۔ اور ایک کیفیت سے کیا کیا کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ میر کے ساتھ سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ روایت نے انھیں بہتر نشروں کا شاعر مشہور کر دیا، دوسرے یہ کہ شیفٹہ سے منسوب قول بلندش بغایت بلند و پستش بغایت پست اتنا مشہور ہو گیا اکثر یہ سمجھا جانے لگا کہ چند مشہور اشعار کو چھوڑ کر باقی کلام رطب و یابس سے بھر اپڑا ہے۔ حالانکہ صدر الدین آزرہ سے جو اصل روایت تھی وہ یوں تھی:

”پستش اگرچہ اندک پست است اما بلندش بسیار بلند است۔“ حق بات یہ ہے کہ میر کا یہ دعویٰ غلط نہیں تھا کہ جہاں سے دیکھیے اک شعر شور انگیز نکلے ہے/ قیامت کا سا ہنگامہ ہے لہر جا میرے دیواں میں/ میر کے پہلے دو دیوانوں میں تمام و کمال، تیسرے اور

چوتھے دیوان میں بڑی حد تک اور پانچویں اور چھٹے دیوان میں کسی حد تک میر کے جوشِ طبیعت اور شدید نوعیت کی روانی کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ میر نے بار بار اپنی ”طبعِ رواں“ کا ذکر کیا ہے۔ ان کو اس کا شدید احساس تھا کہ ”میر شاعر بھی زور کوئی تھا۔“ اور اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اصل صنّاعی یہی ہے کہ اگر بات نہ بنتی ہو تو بھی موزوں طبعوں اس کو بنا دیتے ہیں۔

طرفِ صنّاع ہیں اے میر یہ موزوں طبعوں
بات جاتی ہے بگڑ تو بھی بنا دیتے ہیں

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریاے سخن پر
صدرنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

میر دریا ہے سُنے شعرِ زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی
بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جا دو تھا
پر ملی خاک میں کیا سحرِ بیانی اس کی
سگرگزشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا
سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اس کی
مرثیے دل کے کسی کہہ کے دیے لوگوں کو
شہرِ دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی
آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ ہے
دردِ مندی میں گئی ساری جوانی اس کی

دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میر
دُر سے ہزار چند ہے ان کے سخن میں آب

نحوی ساختیں جملوں سے قریب / بگڑیں ہزار شکلیں تب بھول یہ بتائے /

میر کی شاعری کی نحوی ساختیں غیر معمولی موزونی طبیعت کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ زبان
کی عام ساختوں سے بے حد قریب ہیں۔ جملوں اور لفظوں کی ترتیب گفتگو کی ترتیب سے
دور نہیں۔ اگر کہیں کچھ رد و بدل ہوا بھی ہے تو معمولی لیکن ہر جگہ شعریت کا حق ادا
ہو گیا ہے :

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

ساقی تک ایک موسم گل کی طرف بھی دیکھ
ٹپکا پڑے ہے رنگ چمن میں ہول سے آج

ڈوبے اُچھلے ہے آفتاب ہنوز
کہیں دیکھا تھا تجھ کو دریا پر

گوش کو ہوش سے تک کھول کے سُن شور جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

ہم ہوتے تم ہوتے کہ میر ہوتے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوتے

بڑھتیں نہیں پلک سے تا ہم تلک بھی پہنچیں
پھرتی ہیں وہ نگاہیں پلکوں کے سائے سائے

ہر قطعہ چمن پر ٹک گاڑ کر نظر کو
بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے

سمجھے تھے ہم تو میر کو عاشق اسی گھڑی
جب سُن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

ہے جنبش لب مشکل جب آن کے وہ بیٹھے
جو چاہیں سو یوں کہہ لیں لوگ اپنی جگہ بیٹھے
کیا رنگ میں شوخی ہے اس کے تنِ نازک کی
پیرا ہن اگر پہنے تو اس پہ بھی تہ بیٹھے

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے
ان کو اس روزگار میں دیکھا

وے لوگ تو نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے
پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

بہت سعی کیجئے تو مر رہیے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیکے پسینے میں

کچھ رنجِ دلی میر جوانی میں کھنچا تھا
زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک

ہم فقروں سے بے ادائیگی
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

جم گئی انہوں کفِ قاتل پہ ترا میر ز بس
ان نے رور و دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

ظلم ہے، قہر ہے، قیامت ہے
غصے میں اس کے زیر لب کی بات

بھاتی ہے مجھے اک طلب بوسہ میں یہ آن
لکنت سے اُلجھ جا کے اسے بات نہ آنی

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

یا قوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گلُ برگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصوّر بے بدل
ہائے کیا پردے میں تصویریں بناتا ہے میاں

اب ایسے ہیں کہ صانع کے مزاج اوپر بہم پہنچے
جو خاطر خواہ اپنے ہم ہوتے ہوئے تو کیا ہوتے

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت ہیں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

نامُرادانہ زلیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہم کو

دُور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشقِ بن یہ ادب نہیں آتا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہبِ عشق اختیار کیا

مصائب اور تھے پر جی کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

میر کی سادگی نظر کا دھوکا

میر کی نحوی سادگی جس سے حصہ اول میں بحث کی گئی، دراصل نظر کا دھوکا ہے۔ بالعموم اس نحوی سادگی کو معنوی سادگی بھی سمجھ لیا گیا جو غلط ہے۔ میر کے یہاں جو بول چال کا پیرایہ یا گفتگو کی نحوی ترتیب کا انداز ہے، اس سے شاعری کی زبان کے بارے میں ایک بنیادی سوال کو راہ ملتی ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بول چال کی زبان شاعری کی زبان نہیں ہوتی۔ شاعری کی زبان جتنی بول چال کی زبان سے ہٹی ہوئی ہوگی یا اس سے گریز کرے گی اتنی ہی زیادہ وہ شاعری کا حق ادا کرے گی۔ غالب اور اقبال کے اسالیب اس حقیقت کی روشن ترین مثالیں ہیں۔ میر نے لہجہ عام پر اصرار کیا اور سودا کے طرز اور اپنے عہد کے مقبول عام رواج ایہام کوئی کو رد کیا۔ اور عمداً ”باتوں“ کا انداز اختیار کیا۔ پھر ان کی زبان شاعری کی زبان کیونکر ہوئی؟ اور یہ شاعری ساحری کے درجہ پر کیسے پہنچی:

شاعر نہیں جو دیکھا تو تو ہے کوئی سحر

دو چار شعر پڑھ کر سب کو رچھا گیا ہے

میر کی زبان بار بار یہ سوال پوچھتی ہے کہ لہجہ عام یعنی معمولی ریختے کو جو بقول معیار سازوں کے اس وقت عیب ہی عیب تھا، میر نے اس عیب کو ہنر کیسے کیا:

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے

بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

اور دُر سے ہزار چند آب میر نے اپنے اشعار میں کیسے پیدا کی:

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

نہ رکھو کان نظم شاعرانِ حال پر اتنے
چلو تک میر کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

بول چال کی زبان شاعری کی زبان نہیں

میر کے یہاں اگر ”بول چال کی زبان“ ہے اور کوئی خاص ”طرز“ بھی نہیں تو پھر موتی پرونے کا راز کیا ہے؟ یہ سوال شہری زبان کے جن امکانات پر توجہ کی دعوت دیتا ہے ان میں بنیادی نکتہ یہ ہے اگرچہ بول چال کی زبان شاعری کی زبان نہیں ہوتی لیکن شاعری کی زبان میں بول چال ہو سکتی ہے، اور اس کا حق ادا کرنا سلیقہ شاعر پر موقوف ہے۔ میر کا اصل کارنامہ جو بالعموم فریب نظر کی کیفیت پیدا کرتا ہے یہ ہے کہ انھوں نے لہجہ عام کو اپنا یا لیکن اسے لہجہ عام کی سطح پر برتا نہیں۔ بول چال کی زبان اور شاعری کی زبان میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ بول چال کی زبان میں زبان کی محض اوپری ساخت کام کرتی ہے۔ اس میں لفظ محض لفظوں کی طرح کام کرتے ہیں، اور صرف وہی معنی ادا کرتے ہیں جو ان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ بول چال کی زبان اور شاعری کی زبان کا یہ بنیادی فرق کہ بول چال کی زبان صرف اپنی اوپری ساخت کے ذریعے کام کرتی ہے اور رس نتائج کا حامل ہے کیونکہ شاعری کی زبان میں زبان کی محض اوپری ساخت نہیں بلکہ اس کے علاوہ داخلی ساخت اور بعض اوقات کئی کئی داخلی ساختیں کام کرتی ہیں۔ میر نے نکات الشعرا میں اپنے ”انداز“ کی وضاحت کرتے ہوئے صرف صنائع کا ذکر کیا تھا یعنی تجنیس و ترصیح و تشبیہ و ادا بندی وغیرہ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شعری زبان کی داخلی ساختوں

میں نہ صرف یہ بلکہ بدیع و بیان کے جملہ منضبط اور غیر منضبط وسائل کام میں آتے ہیں۔ صنعتوں کے محدود تصور سے ہٹ کر داخلی ساختیں ایسے ایسے جہانِ معنی آباد کرتی ہیں، اور ایسے ایسے احساسات و جذبات و تصورات و خیالات کے دروازے کھول دیتی ہیں جن تک پہنچتے ہوئے زبان کی اوپری ساخت کے پر جلتے ہیں اور جنہیں صرف ملفوظی مجازی واسطوں ہی کے ذریعے بیان کیا جاسکتا ہے۔ زبان کا ذخیرہ الفاظ محدود ہے اور جہانِ معنی لامحدود۔ فرائڈ کے ایک نئے ترجمان اور فرانس کے نئے فلسفی JACQUES LACAN نے کیا پتے کی بات کہی ہے کہ زبان کی ساخت انسانی لاشعور کی ساخت کا مثلی ہے۔ LANGUAGE IS STRUCTURED LIKE THE UNCONSCIOUS چنانچہ زبان کے دھندلے خطے اس کے روشن خطوں سے کہیں زیادہ کارگر ہیں۔ ان کی وسعتیں اور پنہائیاں لامحدود ہیں اور انسانی ذرائع سے ہم انہیں ناپ نہیں سکتے۔ غور فرمائیے کہ یہ بات عام زبان کے لیے کہی گئی ہے جس کا کُل ذخیرہ الفاظ چند سو صفحوں کے ایک لغت میں سما جاتا ہے۔ کسی بھی فنکار کا کمال زبان کے اس معمولی ذخیرے سے غیر معمولی محسوسات اور خیالات کا چراغاں کرنے میں ہے۔ فراق گورکھپوری، محمد حسن عسکری، ناصر کاظمی اور نئی نسل کے شعرا کی میر تقی میر سے عقیدت بے وجہ نہیں۔ فراق کا یہ کہنا کہ ”میر کے یہاں ہر معمولی بات جتنی معمولی ہوتی ہے اتنی ہی غیر معمولی بن جاتی ہے“ اس بات کا اعتراف ہے کہ میر کے یہاں عام زبان عام زبان نہیں رہتی۔

داخلی ساختوں کا شعری تفاعل / کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ /

میر کے یہاں عام زبان کی شعری تقلیب ہوتی ہے تب کہیں جا کر وہ موتی کی لڑی بنتی ہے یا جادو کا سا اثر کرتی ہے۔ تقلیب کا عمل اصلاً ربط و تضاد، رشتوں یا مناسبتوں کا عمل ہے جس میں ذہن ایک چیز سے دوسری کی طرف یا دوسری سے تیسری کی طرف یا اس کی

خوبیوں یا خصائص کی طرف یا ان کے رشتوں یا ضد کی طرف راجح ہوتا ہے۔ ان رشتوں کے کئی نام ہیں، تشبیہ، استعارہ، اشارہ، کنایہ، رمز، مجاز، علامت، پیکر، تجنیس، تضاؤ وغیرہ۔ میر کا اعجاز یہ ہے کہ عام بول چال کی زبان کی اوپری ساخت میں وہ ایسی خاموشی سے داخلی ساختوں کو لے آتے ہیں کہ سننے یا پڑھنے والے کو گمان تک نہیں ہوتا اور وہ عام زبان کو اعلیٰ ترین شعری زبان کا درجہ دے دیتے ہیں۔ میر کا کوئی شعر کہیں سے لیجیے۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کاشات

کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

بظاہر یہ بول چال کی زبان ہے۔ لیکن کیا واقعی یہ بول چال کی زبان ہے؟ بظاہر گفتگو کا پیرایہ ہے لیکن کیا اس کے پیچھے ایک جہانِ معنی پوشیدہ نہیں؟ یوں روایتی طور پر دیکھیں تو گل، کلی، کلی کا تبسم کرنا یعنی کھلنا میں ایسی رعایتیں ہیں جو عام زبان کو شعری زبان کا درجہ دیتی ہیں، لیکن روایتی صنعتوں کا تصور اپنے تحدد کی وجہ سے زیادہ دور تک ساتھ نہیں دیتا، اس نوع کی صنعتیں تو بالکل بے روح شعر میں بھی پائی جاسکتی ہیں۔ جبکہ درحقیقت جو چیز عام زبان کو شعری زبان بناتی ہے وہ داخلی ساختوں کا وہ تفاعل ہے جس کے ذریعے ایک محدود تجربہ کسی لا محدود صداقت کا خزینہ دار بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مکالمہ جاندار اور بے جان میں ہے۔ اس طرح کا مکالمہ روزمرہ کی زبان میں جہاں بالعموم زبان کی خارجی ساختیں کام کرتی ہیں، ممکن ہی نہیں۔ ایک جاندار کا بے جان سے خطاب کرنا اور بے جان کا بجائے لفظوں کے محض اپنے عمل سے جواب دینا بجائے خود شعری پیرایہ ہے جو تمثیل کے رشتوں سے جڑا ہوا ہے اور تمثیل، تجسیم یا تشکیل کے رشتے داخلی ساختوں کے معنیاتی عمل در عمل سے وجود میں آتے ہیں۔ شعر میں لطف و اثر تبھی پیدا ہوتا ہے جب خارجی ساختیں داخلی ساختوں کے ساتھ مل کر بیک وقت کام کرتی ہیں۔ گل شاخ پر کھلنے والا پھول بھی ہے اور حسن و رنگ و بو

کا استعارہ بھی۔ اس طرح کلی کا تبسم کرنا اس کا محض کھلنا بھی ہے یعنی کلی کا پھول بننا بھی ہے اور حُسن کا اپنے کمال یعنی شباب کو پہنچنا بھی۔ نیز پھول کی کیفیت سے اس کا لمحاتی ہونا بھی مراد ہے اور حسن کا بے ثبات اور ناپائیدار ہونا بھی۔ ان میں کوئی معنی خارجی یا داخلی بالذات طور پر یعنی منفرد طریقے سے قائم نہیں ہوتا ہر معنی دوسرے معنی سے اپنا وجود پاتا ہے اور دوسرے کے رشتے میں بندھا ہوا ہے اور ایک رشتہ دوسرے رشتہ کو راہ دیتا ہے اور یوں معنی در معنی کا نظام روشن ہو اٹھتا ہے۔ سوال ہے کہ گل کا ثبات کتنا ہے۔ کلی اس کا جواب نہیں دیتی، بس سُن کر تبسم کرتی ہے۔ تبسم کرنا کی داخلی ساخت ہے کھل کر پھول بننا اور کھل کر پھول بننا کی داخلی ساخت ہے اور کمال پر پہنچنا اور اوج کمال پر پہنچنے کی داخلی ساخت ہے زوال کی طرف راجع ہونا اور زوال کی طرف راجع ہونا کی داخلی ساخت ہے موت کی طرف قدم بڑھانا۔ کلی کے مسکرانے کے عمل میں کئی دوسری معنیاتی داخلی ساختیں بھی ہیں۔ یعنی جو بات پوچھنے کی نہ ہو، اس پر بھی مسکرا دیتے ہیں۔ گویا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے کہ گل کا ثبات کتنا ہے۔ یہ تو اظہر من الشمس ہے۔ کلی جواب دینے کی بھی زحمت نہیں کرتی۔ بس مسکرا دیتی ہے۔ یہ مسکراہٹ تحقیر آمیز بھی ہو سکتی ہے کہ بھی سامنے کی بات ہے کہ گل کا ثبات بس اتنا ہے جتنی دیر میں کلی کھل کر پھول بنتی ہے۔ نیز ایک پہلو یہ بھی ہے کہ پھول سے پر مردگی، یا جوانی سے بڑھاپے، یا زندگی سے موت، یا خوشی سے دکھ کا فاصلہ بس اتنا ہی ہے جتنی دیر میں کلی کھلتی ہے۔ تبسم میں مسرت و نشاط کی اور کلی کے پھول بننے اور پھر مرجھانے میں زوال اور الم ناک کی جو کیفیت ہے اور ان کیفیتوں کے معنوی ساختیوں میں جو تضاد اور تناؤ ہے وہ بھی معنیاتی نظام کو لطف و حسن عطا کرتا ہے۔ اگرچہ شعر کا مضمون انتہائی پیش پا افتادہ ہے یعنی زندگی بے ثبات ہے یا ناپائیدار ہے، لیکن میر نے اسے تمثیلی پیرایہ دے کر انوکھی کیفیت سے سرشار کر دیا ہے۔ پہلے مصرع میں استہفام کا لہجہ ہے، دوسرے میں

بصری پیکر ہے لیکن تمثیل کا نظام اصلاً قائم ہوتا ہے گل، کلی اور تبتم کی داخلی ساختوں کے عمل سے جن سے معنی در معنی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور مضمون کے پیش پا افتادہ ہونے کے باوجود شعر حسن و لطف کا شاہکار بن گیا ہے یا دوسرے لفظوں میں شعر میں نشتریت پیدا ہوگئی ہے۔ بادی النظر میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ شعر بول چال کی زبان میں ہے، لیکن یہاں زبان محض بول چال کی سطح پر کام نہیں کرتی بلکہ شعری وسائل کو بروئے کار لا کر داخلی ساختوں کو انگیز کرتی ہے۔ یہ بول چال کی زبان کا نہیں شعری زبان کا تفاعل ہے۔ غرض بول چال کی زبان صرف معنی قائم کرتی ہے جبکہ شعری زبان در معنی کا ایسا پہلو دار نظام قائم کرتی ہے جو شعری لطف یا جمالیاتی حسن پیدا کرتا ہے۔ یہ حسن کاری بول چال کی زبان سے کوسوں آگے کی بات ہے۔ پس معلوم ہوا کہ میر کے یہاں بول چال کی زبان میں شاعری نہیں بلکہ شاعری کی زبان میں بول چال ہے۔ یعنی میر کے یہاں بول چال کی زبان کی شعری تقلیب ہوتی ہے۔ صاحب طبقات الشعرا نے صحیح داد دی تھی ”ہر چند سادہ گو است اما در سادہ گوئی پر کاری ہا دارد“ اردو تنقید نے پہلے حصے کو یاد رکھا دوسرے کو فراموش کر دیا۔ اگرچہ خود میر نے اس رویہ کے خلاف صاف لفظوں میں خبردار کیا تھا۔ میر کے اس شعر کو بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے:

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے

ہمیں تو لگے ہے وہ عیار سا

میر کے یہاں عام زبان عام زبان نہیں رہتی۔ وہ گویا ان کے چھو دینے سے جس شعر سے برقیاجاتی ہے۔ یہ چند اشعار مزید دیکھیے۔ بظاہر یہ بول چال کی زبان میں ہیں، لیکن ملاحظہ ہو کہ عام زبان کی کیسی تقلیب ہوئی ہے اور معنیاتی نظام کس طرح داخلی ساختوں کے شعری تفاعل سے روشن ہوا اٹھتا ہے:

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا تنگے نے التماس کیا

قد کھینچے ہے جس وقت تو ہے طرفہ بلا تو
کہتا ہے ترا سایہ پری سے کہ ہے کیا تو
منظر میں بدن کے بھی یہ اک طرفہ مکاں تھا
افسوس کہ تک دل میں ہمارے نہ رہا تو

ڈوبے اُچھلے ہے رات بھر خورشید
اس نے دیکھا ہے تجھ کو دریا پر

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

کچھ کرو فکر اس دوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

دل عجب شہر تھا خیا لوں کا
نوٹا مارا ہے حُسن والوں کا

رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوادونوں
کیا قافلہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے

اسے ڈھونڈتے میر کھوئے گئے
کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

یہ عیش کہہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن کا ساغ بھرا ہوا

یہ تو ہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں
دل ہوا ہے چراغِ مفلس کا

ایک محروم چلے میرے ہیں عالم سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

ہاں خدا مغفرت کرے اس کو
صبرِ مرحوم تھا عجب کوئی

مرگِ مجنوں پہ عقلِ گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے

کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث
برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالہ

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا
خدائی صدقے کی انسان پر سے

آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا یہ ولے قابلِ دیدار نہ تھا

ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

سرکسی سے فرو نہیں ہوتا
جیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

ماہیتِ دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے
یک قطرہ خونِ دل یہ طوفان ہے ہمارا

الہی کیسے ہوتے ہیں جنس ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دانگیز ہوتی ہے خدا ہوتے

اب ایسے ہیں کہ صانع کے مزاج اُوپر ہم پہنچے
جو خاطر خواہ اپنے ہم ہوئے ہوتے تو کیا ہوتے

ملاحظہ ہو خود میر کو اپنے ”دلِ پُر شور“ اور اپنی ”صناعی“ کا کتنا گہرا احساس تھا:
خوش ہیں دیوانگی میر سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر
کیا کیا کہا کریں ہیں زبانِ قلم سے ہم

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام ہے ہے

صوتِ جرس کی طرزِ سیاہاں میں ہائے میر
تنہا چلا ہوں میں دل پر شور کو لیے

تھا بلا ہنگامہ آرا میر بھی
اب تلک گلیوں میں اس کا شور ہے

صنّاع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صدرنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

طرفِ صنّاع ہیں اے میر یہ موزوں طبعان
بات جاتی ہے بگڑ تو بھی بنا دیتے ہیں

میر صناع ہے ملو اس سے
دیکھو باتیں تو کیا بناتا ہے

سوز کی ہنڈ کھیا اور میر کی باتیں / گفتارِ خام پیشِ عزیزاں سند نہیں /

صاحبِ طبقاتِ الشعر نے میر کو ”محاورہ دانِ متین“ کا لقب شاید اسی لیے دیا تھا کہ ان کی شاعری میں بول چال کا انداز تو ہے لیکن یہ عام بول چال نہیں۔ تذکرہ نویسوں کے نزدیک یہ فرق محاورہ کے استعمال سے پیدا ہوا حالانکہ محاورہ محض ایک شعری وسیلہ ہے، اور میر کے یہاں صرف محاورہ ہی نہیں، بہت سے دوسرے شعری وسائل بھی بروئے کار آتے ہیں۔ یوں شدید نوعیت کی شعری ایجابیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے میر زندگی کی عام اور خاص حالتوں کی مصوری کرتے ہیں اور لطیف سے لطیف جذبات کو نہایت موثر طریقے سے ادا کرتے ہیں۔ ان کے باتوں کے انداز کے بارے میں محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے ”حقیقت میں یہ انداز میر سوز سے لیا۔ مگر ان کے ہاں باتیں ہی باتیں تھیں۔ انھوں (میر) نے اس میں مضمون داخل کیا، اور گھریلو زبان کی متانت کا رنگ دے کر محفل کے قابل کیا“

سوال یہ ہے کہ باتوں میں مضمون کیسے ”داخل“ ہوتا ہے؟ کیا باتوں میں مضمون نہیں ہوتا یا کیا گھریلو زبان متانت سے عاری ہوتی ہے؟ دراصل آزاد نے سوز کے باتوں والے انداز سے الگ کرنے کے لیے یہ بات بنائی، ورنہ دوسرا کوئی جواز انھیں سوچھا نہیں۔ آزاد کی اس رائے پر میریات میں برابر رائے زنی ہوتی رہتی ہے کہ میر تقی میر بول چال کے انداز میں سوز سے متاثر ہوئے لیکن ان کی شاعری مختلف ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ عام بول چال کی زبان اور میر کے شعری اسلوب میں وہی فرق ہے جو میر سوز اور میر تقی میر کی شاعری میں ہے۔ دراصل اس ضمن میں اولین روایت تذکرہ خوش

معرکہ زیبا ہی کی ہے اور وہ کہیں زیادہ واضح ہے: ”اس میں میر محمد سوز صاحب کہ اوتاد جناب عالی (نواب آصف الدولہ) کے تھے، واسطے مجرے کے حاضر ہوئے۔ حضور نے فرمایا: کچھ شعر پڑھو۔ حسب الحکم میر سوز نے دو تین غزلیں اپنے دیوان کی پڑھیں۔ نواب فلک جناب نے تعریف میں ان کی مبالغہ فرمایا۔ میر صاحب کو دلیری میر سوز کی اور تعریف نواب کی بہت ناگوار گزری۔ میر سوز صاحب سے کہا: تمہیں اس دلیری پر شرم نہ آئی؟ میر سوز نے کہا: صاحب بندہ، کیا میں شاہجہان آباد میں بھاڑ جھونکتا تھا؟ کہا بزرگی اور شرافت میں تمہاری کیا تامل! مگر شعر میں میر سے کسی کو ہمسری نہیں۔ موقع اور محل تمہاری شعر خوانی کا وہ ہے جہاں لڑکیاں جمع ہوں اور ہنڈ کھیا پکتی، سو نہ کہ میر تقی میر کے سامنے“ اس روایت سے واضح طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ میر کو شعری زبان کا کیسا گہرا شعور تھا اور عام بول چال کی شاعری کو جو میر سوز کرتے تھے وہ ”ہنڈ کھیا“ کی شاعری سمجھتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ میر نے باتوں کا انداز اختیار کیا تھا لیکن ان کے یہاں ”ریختہ“ اصلاً پردہ تھا ”سخن“ کا جسے انھوں نے فن کے اوج کمال پر پہنچا دیا۔

کیا تمہا ریختہ پردہ سخن کا

سو ٹھہرا ہے وہی اب فن ہمارا

آل احمد سرور نے صحیح لکھا ہے ”میر سوز کی سادگی کا میر سے موازنہ کیا جائے تو میر کی چابکدستی اور صنائی کا پتہ چلتا ہے۔ میر سوز کے یہاں سرد راکھ ہے۔ میر کے یہاں وہ لاوا جو تن تک کو جلا دیتا ہے۔“ دیکھیے خود میر نے عام بول چال کو ”گفتارِ خام“ کہا ہے، البتہ جب اس میں ”سوزِ دل“ کی آمیزش ہوتی ہے تو شعر شعر بنتا ہے:

بے سوزِ دل کھوں نے کہا ریختہ تو کیا

گفتارِ خام پیشِ عزیزاں سند نہیں

میر کی زبان اندر کی آگ میں تپی ہوئی زبان ہے۔ میر کی باتیں عام باتیں نہیں۔ میر کا لہجہ عام

محض ہجو عام نہیں۔ میر کی شاعری کی زبان محض بول چال کی زبان نہیں۔ یہ بول چال کی زبان سے یعنی دھرتی سے اپنا رس ضرور لیتی ہے لیکن یہ اعلیٰ درجے کی شعری زبان ہے جس میں ایمائیت و اشارت و ادا کے تمام ہنر فطری طور پر یعنی زور طبیعت کے شعوری اور غیر شعوری تقاضوں کے تحت کھپ گئے ہیں۔ درج ذیل شروع کے اشعار میں ملاحظہ فرمائیے کہ میر نے خود اپنے ”اسلوب شعر“ یا ”سلیقہ“ کے بارے میں کیا اشارے کیے ہیں، اور وہ عام شاعر جن کے یہاں بول چال کی زبان کی شعری زبان میں تقلیب نہیں ہوتی، ان کے دواوین کو ”گودڑ“ کہا ہے۔ بعد کے اشعار میں دیکھیے کہ میر عام زبان میں معنوی تہ داری پیدا کر کے شعریت کا کیسا حق ادا کرتے ہیں:

میر شاعر بھی زور کوئی تھا
دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب

عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اس فرقے کا عاشق ہوں
کہ بے دھڑکے بھری مجلس میں یہ اسرار کہتے ہیں

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

کس کا ہے قماش ایسا گودڑ بھرے ہیں سارے
دیکھو نہ جو لوگوں کے دیوان نکلتے ہیں

زلف سا بیچ دار ہے ہر شعر
 ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا
 میر پر "نظر" کی مرکزیت آشکار تھی۔ دیکھیے کیا غضب کا شعر ہے :
 قلب یعنی کہ دل عجب زر ہے
 اس کی نقادی کو نظر ہے شرط
 میر کے یہاں سے مثالیں دیتے ہوئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مثالیں کہاں
 تک دی جائیں، سارا کلیات ایسے تہ دار اور پُرکیف اشعار سے بھرا ہوا ہے :
 قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل
 سارے عالم کو میں دکھالایا

ایک دو ہوں تو سحرِ چشم کہوں
 کارِ خسانہ ہے واں تو جادو کا

عشق کرتے ہیں اس پریٰ رو سے
 میر صاحب بھی کیا دو آنے ہیں

حالِ بد گفتنی نہیں میرا
 تم نے پوچھا تو مہربانی کی

التفاتِ زمانہ پر مت جا
 میر دیتا ہے روزگار فریب

استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں
عشق نے آگ یہ لگائی ہے

حیرتِ حسنِ یار سے چُپ ہوں
سب سے حرف و کلام ہے موقوف

خوش نہ آئی تمہاری چال ہمیں
یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں

شہرِ خوبی کو خوب دیکھا میر
جنسِ دل کا کہیں رواج نہیں

رونا آنکھوں کا رویے کب تک
پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں
ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دلِ عذاب ہیں دونوں

گرچہ کب دیکھتے ہو پر دیکھو
آرزو ہے کہ تم ادھر دیکھو

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے
 عمر نے ہم سے بے وفائی کی

اسی تقریب اس گلی میں رہے
 منتیں ہیں شکستہ پانی کی

سراپا میں اس کے نظر کر کے تم
 جہاں دیکھو اللہ اللہ ہے

چھوڑ جاتے ہیں دل کو تیرے پاس
 یہ ہمارا نشان ہے پیارے

اے شورِ قیامت ہم سوتے ہی نہ رہ جاویں
 اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
 عجب اک ساخہ سا ہو گیا ہے

وجہ بیگانگی نہیں معلوم
 تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سر ہانے دھرے دھرے

سر و لبِ جو، لالہ و گل، نسرين و سمن ہیں شگوفے بھی
دیکھو جدھر اک باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے
زمین سخت ہے آسمان دُور ہے

بہت سعی کرے تو مَر رہے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

میر کی سادگی پر اس قدر زور دیا گیا کہ میر کے شعری اسلوب کے دوسرے بہت سے پہلو نظر انداز ہو گئے۔ میر کی شاعری بحرِ ذُخار ہے۔ مولوی عبدالحق اور اثر لکھنوی نے جب میر کی تنقیدی بازیافت شروع کی تو شاید سادگی و سلاست پر اصرار کی ضرورت بھی تھی کیونکہ یہ سامنے کی چیز تھی لیکن تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لے تید عبد اللہ تک چلی گئی ہے۔ ”اس میں شک نہیں کہ میر جہاں اپنی غزل میں فارسیت کا رنگ پیدا کرنے پر اتر آتے ہیں، اس میں بھی ایک بات پیدا ہو جاتی ہے، مگر جو اثر ان کے اصلی رنگ میں ہے، وہ اس میں نہیں۔ ذیل کی غزل

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

صناعتی لحاظ سے مکمل اور بے عیب ہے۔ غزل کو پڑھ کر کلیم یا سلیم کا دھوکا ہوتا ہے۔ مگر ان اشعار میں وہ اثر موجود نہیں جو عام طور پر میر کے کلام میں پایا جاتا ہے، (نقد میر ۲۲) تعجب ہے کہ سید عبدالشریح جیسے سخن فہم نے جنھوں نے میریات کی کئی منزلیں سر کی ہیں، اس غزل کے ایسے اشعار کو کس طرح نظر انداز کر دیا:

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی رازِ نہاں ہوں
جلوہ ہے مجھی سے لب دریا تے سخن پر
صدرنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں
اک وہم نہیں بیش مری ہستی موہوم
اس پر بھی تری خاطر نازک پہ گراں ہوں

اکثر و بیشتر میر فارسی تراکیب کو نہایت خوبی سے کھپاتے ہیں۔ اثر لکھنوی نے صحیح اشارہ کیا ہے کہ بہت سی ترکیبیں مثلاً کاو کاو / ایک قطرہ نوحوں / سادہ و پُرکار / شیشہ باز / یک بیاباں / ہنگامہ گرم کُن / حریفِ نبرد / حریفِ بے جگر وغیرہ جن کے وضع کرنے کا سہرا غالب کے سر باندھا جاتا ہے، میر کی دست نگر ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ طرز جو غالب سے منسوب کیا جاتا ہے اس کی داغ بیل میر ڈال گئے تھے:

حریفِ بے جگر ہے صبر، ورنہ کل کی صحبت میں
نیاز و ناز کا جھگڑا کرو تھا ایک جرات کا

یک بیاباں برنگِ صوتِ جرس
مجھ پہ ہے بے کسی و تنہائی

ہنگامہ گرم کُن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ شور تھا

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشان
مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑایا

دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے پیش
ایک عالم کے سر بلا لایا

اپنے ہی دل کو نہ ہو وا شد تو کیا حاصل نسیم
گو چمن میں غنچہ پر پڑ مردہ تجھ سے کھل گیا

دلِ عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے واں آگے درد تھا

فارسی آمیز لہجہ کی خوش امتزاجی اور نشتریت / میرصنّاع ہے ملو اس سے /

ایسے اشعار کا سیدھا اسلوبیاتی رشتہ غالب کی مخصوص شعری ساختوں تک چلا گیا

ہے لیکن میر کے دواوین میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں فارسیت اور بول چال

کے انداز میں خوش امتزاجی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ یعنی ان میں میر کی خوش ترکیبی ریختے کی صرفی و نحوی ساختوں سے ایسی گھل مل گئی ہے کہ شعر کی حسن کاری اور تہ داری کا بڑا انحصار اسی لسانی خوش امتزاجی پر ہے۔ اگرچہ استثنائی صورتیں مل جائیں گی تاہم میر کو جہاں جہاں ٹھیس لگی اور وہ آبلے کی طرح پھوٹ رہے ہیں انھوں نے سادہ ایمانی لہجہ اختیار کیا لیکن جہاں انکشاف ذات کی صورت پیدا ہوئی ہے یا ماہمیت عالم پر غور کیا ہے یا ذات و کائنات کا فشار محسوس ہوا ہے یا حیرت و استعجاب کے عالم میں ڈوب ڈوب گئے ہیں وہاں اکثر و بیشتر فارسی آمیز پر اکر تہ امتزاجی پیرائے سے اظہار کا حق ادا ہوا ہے۔ اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ اس نوع کے اشعار بھی میر کے بہترین اشعار ہیں اور سادہ ایمانی اشعار کے مقابلے میں ان میں بھی ”نشتریت“ کی کمی نہیں :

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں
بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں

مزگان تر کو یار کے چہرے پہ کھول میر
اس آب خستہ سبزے کو ٹک آفتاب دے

موسم آیا تو نخلِ دار میں میر
سرِ منصور ہی کا بار آیا

کچھ گل سے ہیں شگفتہ کچھ سرو سے ہیں قد کش
اس کے خیال میں ہم دیکھے ہیں خواب کیا کیا

پھاڑا ہزار جا سے گریبانِ صبر میر
کیا کہہ گئی نسیمِ سحر گل کے کان میں

چشمِ ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

یہ عیش کہہ نہیں ہے یاں رنگا در کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن کا ساغ بھرا ہو کا

سر و لب جو، لالہ و گل، نسرین و سمن ہیں شگوفے بھی
دیکھو جدھر اک باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا

و اس سے سرِ حرف تو، ہو گو کہ یہ سر جائے
ہم حلقِ بریدہ ہی سے تقریر کریں گے

کرے ہے جس کو ملامت جہاں وہ میں ہی ہوں
اجل رسیدہ، جفا دیدہ، اضطراب زدہ

اُگتے تھے دستِ بیل و دامانِ گل بہم
صحنِ چمن نمونہ، یومُ الحساب تھا

دست کشتِ نالہ پیش رو گریہ
آہ چلتی ہے یاں عِلم لے کر

ماہیتِ دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے
یک قطرہ خون یہ دل طوفان ہے ہمارا

ظلم ہے، قہر ہے، قیامت ہے
غصے میں اس کے زیرِ لب کی بات

اس دشت میں اے سیل سنبھل ہی کے قدم رکھ
ہر سمت کو یاں دفن مری تشنہ لبی ہے

معلوم تیرے چہرہ پر نور کا سا لطف
بالفرض آسماں پہ گیا پھول مہ ہوا

دل سے میرے شکستیں اُلجھی ہیں
سنگِ باراں ہے آگینے پر

مانندِ حرفِ صفحہٴ ہستی سے اٹھ گیا
دل بھی مرا جریدہٴ عالم میں فرود تھا

ہیں عناصر کی یہ صورت بازیاں
شعبدے کیا کیا ہیں ان چاروں کے بیچ

ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پلوچھوں
کہ بزمِ عیشِ جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

مے خانہ وہ منظر ہے کہ ہر صبح جہاں شیخ
دیوار پہ خورشید کا مستی سے سر آوے

بلا تہ دار بحرِ عشق نکلا
نہ ہم نے انتہالی ابتدا میں

ہر جزو مد سے دست و بغل اٹھتے ہیں خروش
کس کا ہے راز بحر میں یارب کہ یہ ہیں جوش
ابروئے کج ہے موج کوئی چشم ہے حباب
موتی کسی کی بات ہے سپی کسی کا گوش

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں در آ
عالم آئینے کے مانند در باز ہے ایک

مجھ کو دماغ و صفِ گل و یاسمن نہیں
میں جوں نسیم باد فروشِ چمن نہیں

پیدا ہے روزِ مشرقِ نو کی نمود سے
نکلے ہے کوئے یار سے نچ نچ کر آفتاب

بات احتیاط سے کر، ضائع نہ کرنفص کو
بالیدگی دل ہے مانند شیشہ دم سے

آیاتِ حق ہیں سارے یہ ذراتِ کائنات
انکار تجھ کو ہووے سوا قرار کیوں نہ ہو

روئے گل پر روز و شب کس شوق سے رہتا ہے باز
رخنہ دیوار ہے یادیدہ نظرِ سارگی

میر کے ہم عصر شعرا نے اور سب سے بڑھ کر خود میر نے فارسی اثرات کو کیسی خوش
اسلوبی سے اردو میں کھپایا۔ سینکڑوں ترکیبیں اور محاورے اردو میں کھپ کر اردو کے ہو گئے۔
اور زبان کی تاثراتی جہات روشن تر ہو گئیں۔ خوش آمدن سے خوش آنا، بو کر دن سے باس کر نام،
سرفرو آوردن سے سرفرولانا، بروئے کار آوردن سے بروئے کار لانا، تماشا کردن سے تماشا

کرنا، ساز کردن سے ساز کرنا، خو کردن سے خو کرنا، نیاز کردن سے نیاز کرنا، تکلیف کردن سے تکلیف کرنا، اسی طرح طرح کردن (طرح کرنا) بہم رسیدن (بہم پہنچنا) و اشدن (واہونہ) داغ شدن (داغ ہونا) سرکشیدن (سرکھینچنا) قدم رنجہ کردن (قدم رنجہ کرنا)، تر آمدن (تر آنا)، راہ غلط کردن (راہ غلط کرنا)، وغیرہ سینکڑوں الفاظ اور ترکیبیں اردو میں آگئیں۔

وحید الدین سلیم نے اپنے تجزیے میں ایسے پورے کے پورے مصرعے فارسی کے نقل کیے ہیں جو میر کے یہاں ملتے ہیں۔ جن کے لیے بعد میں غالب کی شاعری بدنام ہوئی۔ صحرا صحرا وحشت، دنیا دنیا تہمت، عالم عالم عشق و جنوں، شائستہ پیریدن، جوش اشکِ ندامت، صد سخن آغشتهٔ خون، غبارِ دیدہ پروانہ، سر نشین راہِ مے خانہ، ہنگامہ گرم گن، دلِ غفراں پناہ، حرفِ زیر لبی، تہِ بال، ستم کشتہ، غنچہ پیشانی جیسی ترکیبیں تو میر کی اردو میں ایسے گھل مل گئی ہیں گویا فارسی کی نہ ہوں اردو ہی کی ہوں۔ آل احمد سرور نے صحیح کہا ہے ”میر کے لہجے کی خوش آہنگی اور شیرینی کبھی ماند نہیں پڑتی، ان کے یہاں اضافوں کے پہاڑ بھی روئی کے گالے معلوم ہوتے ہیں۔“ اضافتیں تو کم کم ہیں البتہ ترکیبیں خوب خوب آئی ہیں۔ وحید الدین سلیم کہتے ہیں کہ ”ان میں سے بعض ترکیبیں یقیناً ایسی ہیں کہ اردو زبان ان کا تحمل نہیں کر سکتی لیکن میر صاحب پر کون حرف رکھ سکتا ہے۔“ یہاں وحید الدین سلیم سے نکات الشعرا کے شق چار والے بیان کی روشنی میں کچھ زیادتی ہوئی ہے۔ میر نے کہا تھا ”فارسی ترکیبیں ایسی ہونی چاہئیں جو زبانِ ریختہ سے مناسبت رکھتی ہوں اور اس بات کو شاعر کے سوا کوئی نہیں پہچان سکتا اور اس کا جاننا سلیقہ شاعری پر موقوف ہے۔“ چنانچہ میر کے یہاں اکثر و بیشتر یہ تمام عناصر مانوس و نامانوس، راج اور غیر راج، غریب و غیر غریب، یہ سب میر کے تخلیقی آتش کدے میں تپ کر اردو میں ایسے کھپ گئے ہیں کہ اردو کے وجود کا حصہ بن گئے ہیں۔ فارسی عنصر کا جذب و قبول میر کی شاعری کا روشن پہلو ہے۔ ذیل کے اشعار میں دیکھیے فارسی عنصر سے کہیں ثقات پیدا نہیں ہوتی۔ اس کو دسی عنصر یعنی

اردو کی اردو تیت کے ساتھ کیسا کھپایا ہے اور اس سے کیا کیا کیفیتیں پیدا کی ہیں:

صحرائے مجت ہے قدم دیکھ کے رکھ میر
یہ سیر سِرِ کوپہ و بازار نہ ہووے

افسر دگی سوختہ جاناں ہے قہر میر
دامن کو ٹنگ ہلاکہ دلوں کی بجھی ہے آگ

روز آنے پہ نہیں نسبتِ عشقی موقوف
عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

سینکڑوں حرف ہیں گرہ دل میں
پر کہاں پائے لبِ اظہار

شہرِ خوبی کو خوب دیکھا میر
جنسِ دل کا کہیں رواج نہیں

آدارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

جہم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میر ز بس
ان نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

شوقِ قامت میں ترے اے نونہال
گل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں

ہم جانتے ہیں یا کہ دلِ آشنا زدہ
کہیے سوکس سے عشق کے حالات کے تئیں

اک نگہ ایک چشمک ایک سخن
اس میں بھی تم کو ہے تامل سا

ہے جو اندھیر شہر میں خورشید
دن کو لے کر چراغ نکلے ہے
ہر سحر حادثہ مری خاطر
بھر کے خوں کا ایانہ نکلے ہے

سائے میں ہر پلک کے خوابیدہ ہے قیامت
اس فتنہ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو

منصور کی نظر تھی جو دار کی طرف سو
پھل وہ درخت لایا آخر سر بریدہ

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ ہیں شور ہے پھر نوہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفٹہ سری کا
اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا
صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہ شیشہ گری کا
ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

ہائے غموری جس کے دیکھے جی ہی نکلتا ہے اپنا
 دیکھیے اس کی اور نہیں پھر عشق کی یہ بھی غیرت ہے
 صبح سے آنسو تو میدانہ جیسے وداعی آتا تھا
 آج کسو خواہش کی شاید دل سے ہمارے رخصت ہے
 کیا دل کش ہے بزم جہاں کی جاتے یاں سے جسے کھو
 وہ غم دیدہ رنج کشیدہ آہ سراپا حسرت ہے

کچھ موج ہو اچھپاں اے میر نظر آئی
 شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
 مغرور بہت تھے ہم آنسو کی سرایت پر
 سو صبح کے ہونے کو تاثیر نظر آئی
 گل بار کرے ہے گا اسباب سفر شاید
 غنچے کی طرح بلبل دل گیر نظر آئی

آگے ہمارے عہد سے وحشت کو جانہ تھی
 دیوانگی کسو کی بھی زنجیر پانہ تھی
 بیگانہ سالگے ہے چمن اب خزاں ہیں ہائے
 ایسی گئی بہار مگر آشنا نہ تھی
 وہ اور کوئی ہوگی سحر جب ہونی بقول
 شرمندہ اثر تو ہماری دُعا نہ تھی

آگے بھی تیرے عشق سے کھنچے تھے درد و رنج
لیکن ہماری جان پر ایسی بلا نہ تھی
اُس وقت سے کیا ہے مجھے تو چراغِ وقف
مخلوق جب جہاں میں نسیم و صبا نہ تھی

گردشِ نگاہِ مست کی موقوفِ سابقا
مسجد تو شیخِ جی کی خرابات ہو گئی
ڈرِ ظلم سے کہ اس کی جزا بس شتاب ہے
آیا عمل میں یاں کہ مکافات ہو گئی
خورشیدِ ساپیا لہ دے بے طلب دیا
پیرِ مغاں سے رات کرامات ہو گئی
کتنا خلافِ وعدہ ہوا ہو گا وہ کہ یاں
نومیدی و امیدِ مساوات ہو گئی
ٹنک شہر سے نکل کے مرا اگر یہ سیر کر
گویا کہ کوہِ ودشت پہ برسات ہو گئی
اپنے تو ہونٹھ بھی نہ ہلے اس کے روبرو
رنجش کی وجہ میر وہ کیا بات ہو گئی

صد حرفِ زیرِ خاک تہِ دل چلے گئے
مہلت نہ دی اجل نے ہمیں ایک بات کی

ہم تو ہی اس زمانے میں حیرت سے چپ نہیں
 اب بات جا چکی ہے سبھی کائنات کی
 حورو پری فرشتہ بشر مار ہی رکھا
 دزدیدہ تیرے دیکھنے سے جس پہ گھات کی
 عرصہ ہے تنگ چال نکلتی نہیں ہے اور
 جو چال پڑتی ہے سو وہ بازی کی مات کی

آرزو اس بلند و بالا کی
 کیا بلا میرے سر پہ لاتی ہے
 دیدنی ہے شگفتگی دل کی
 کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
 ہے تصنع کہ لعل ہیں وے لب
 یعنی اک بات سی بنائی ہے
 مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر
 کیا دوانے نے موت پائی ہے

ہندی الفاظ کا رس: پوری اردو کا پورا شاعر

میر کی زبان کو دراصل سادگی و سلاست یا فارسیت و مشکل پسندی کی اصطلاحوں کے ذریعے سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ درجہ بندی بعد کی شعری روایتوں کی وجہ سے راسخ ہو گئی اور

تنقیدی زبان میں میکانیکی طور پر برتی جانے لگی۔ میر کا تخلیقی ذہن شاید ان حد بندیوں سے بے نیاز تھا۔ اس لیے ان درجہ بندیوں کی مدد سے میر کی زبان کو بھنا میر سے بے انصافی کرنا ہے۔ میر نے اردو کے ایک روپ ایک رُخ ایک سطح یا ایک پرت کو نہیں برتا بلکہ اردو کو برتا ہے مستقبل کی اردو کے تمام شہری امکانات کی سیر میر کے یہاں ہو جاتی ہے۔ میر سے محمد حسین آزاد نے جو روایت منسوب کی ہے کہ انوری و ذائقانی کا کلام سمجھنے کے لیے ان کی شہر میں مصطلحات اور فرہنگیں موجود ہیں۔ اور میر کے کلام کے لیے فقط محاورہ اہل اردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں، اور اس سے آپ محروم: اس روایت کا یہ پہلو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ جامع مسجد کی زبان کو سند میں لانے کی ضرورت لسانی برتری جتانے کے لیے لکھنؤ میں پیش آئی تھی، ورنہ میر کا لڑکپن آگرے میں گزرا تھا۔ اکبر آباد کی لسانی روایت پر دہلی کی کھڑی بولی کی نہیں بلکہ آگرے کی برج کی چھاپ تھی۔ میر کے یہاں کبھو، کسو، کجھو، لیجو، جد، تد، ان، کن، ٹک، تنک، نیٹ، پون، پنجن، ٹکھ، نگر، برہ، سانجھ، بجن، پاس، ماٹی، سینکڑوں الفاظ برج کے غیر شعوری لسانی اثرات کی یاد دلاتے ہیں۔ طویل مصوتوں یا خفیف مصوتوں کو کھینچ کر طویل بنانے کا رجحان بھی برج بھاشا کی بھگتی کال کی شاعری کے اثرات کی عام کیفیت ہے۔ البتہ میر کی زبان کی شیرازہ بندی، ہونی دہلی میں اور یہ گھر گھر آکر اور بن سنور کر، جوان ہونی دہلی کی کھڑی بولی کے سایے میں۔ میر کے یہاں کھڑی کے قدیمی اثرات مثلاً آوے ہے، جادے ہے، بووے گا، کھاوے گا، ڈھائے کر، آئے کر، جائے کر، بلبل کنے، دوش اوپر، بھپاس، ہم پاس، میرے تئیں، اپنے تئیں، دیکھا ہوں، لکھا ہوں، جو جو تم نے ظلم کیے سو سو ہم نے اٹھائے ہیں وغیرہ بہت سی لسانی خصوصیات ستر، مویں اٹھا رہیں صدی کی کھڑی بولی سے لے کر آج تک کی عوامی زبان میں چلی آتی ہیں۔ لکھنؤ میں معاملہ مختلف تھا یہاں کی اردو کا وہ لوج جو بعد میں انیس کے مرثیوں اور مرزا شوق کی مثنویوں میں سامنے آیا، اودھی کے اثرات کی دین تھا۔ میر لکھنؤ میں ساٹھ برس کی عمر میں پہنچے تھے، اس لیے کسی نئے لسانی اثر کو قبولنا جہاں

شموری طور پر احساس برتری کے باعث ناممکن تھا، وہاں تحت شعوری طور پر نئے لسانی اثرات کے بروئے کار آنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اردو زبان بولیوں کے سنگم پر وجود میں آئی تھی۔ چنانچہ جامع مسجد کی سیرھیوں کی زبان سے مراد وہ زبان یعنی چاہیے جو ان تمام بولیوں کے لسانی منتھن سے میر کے عہد تک وجود میں آچکی تھی۔ جامع مسجد کی سیرھیوں کی وضاحت میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے میر نے مسجد کو مسیت، پلید کو پلینت، دستخط کو دستخط یا خیال کو خیال، بروزن حال باندھنے کا جواز پیدا کیا ہے تو یہ اس مہتمم بالشان لسانی روایت کی نہایت ہی محدود اور سطحی تعبیر ہے۔ یہ تعبیر اس انتہائی کشادہ اور مختلف عناصر کو جذب کرنے والی زبان کی توہین ہے جو میر کی شاعری میں ایک متواج سمندر کی طرح تلامخیز نظر آتی ہے۔ میر دراصل پوری اردو زبان کے پورے شاعر تھے۔ اس سے میری یہ مراد نہیں کہ میر کی لفظیات سب سے بڑی ہے۔ قطعی لفظ شماری کی غیر موجودگی میں یہ بات قیاساً ہی کہی جاسکتی ہے کہ ممکن ہے کہ نظیر یا انیس کی لفظیات میر سے زیادہ ہو، لیکن لفظیات زبان کی صرف ایک سطح ہے پوری اردو سے مراد صرف ایک سطح نہیں ہے بلکہ اس کے تمام لسانی روپ اور پرتیں یعنی صرفی اور نحوی، صوتیاتی، اسلوبیاتی نیز عروضی ان تمام رُخوں کو جیسا میر نے کھنگالا ہے اور زبان کے آئندہ کے امکانات کی جو بشارت دی ہے اس اعتبار سے پوری اردو زبان کے پورے شاعر کہلانے کا شرف میر ترقی میر ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے صحیح کہا ہے: "میر کی اردو دوسرے شعرا کی اردو سے اس اعتبار سے علاحدہ اور اہم ہے کہ دوسرے شعرا اکثر و بیشتر عربی فارسی اور دوسری زبان کے الفاظ، تراکیب، بندش، محاورہ، روزمرہ، یا انواع و اقسام کے علوم و فنون یا نعروں کے سہارے چلتے ہیں، میر صرف — اردو اور اپنے مخصوص لب و لہجہ سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے ممتاز شعرا کی جو مخصوص زبان ہوتی ہے، اس میں اتنی "اردو تیت" یا "اردو پن" نہیں ہوتا جتنا میر کے یہاں ہے۔" ذیل کے اشعار میں دیکھیے ایک معمولی سے ایسی لفظ نے شعر میں کیا معنویت پیدا کی ہے

کہتے نہ تھے مت کڑھا کر
دل ہونہ گیا گداز تیرا

جی ڈہا جاتے ہے سحر سے آہ
رات گزرے گی کس خرابی سے

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب حضور و مسیحائے مرنے کا مزا جانا

ایک ڈھیری راکھ کی تھی صبح جاتے میر پر
برسوں سے جلتا تھا شاید رات جل کر رہ گیا

آسماں شاید ورے کچھ آگیا
رات سے کیا کیا رکا جاتا ہے جی

یا قوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گل برگ
ٹمک ہونٹھ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

آتش سی پھک رہی ہے سارے بدن میں میرے
دل میں عجب طرح کی چنگاری آپڑی ہے

کیا فکر کروں میں کہ ٹلے آگے سے گردوں
یہ گاڑی مری راہ میں بے ڈول آرہی ہے

جی ہی دینے کا نہیں کڑھنا فقط
اس کے در سے جانے کی حسرت بھی ہے

رخسار اس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں ہم
آتا ہے جی میں آنکھوں کو ان میں گڑوئیے

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرورِ قلب
آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زباں کے بیچ

کہہ ساجھ کے موئے کو اے میر روئیں کب تک
جیسے چراغِ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

نہیں وسواس جی گوانے کے
ہائے رے ذوقِ دل لگانے کے

پھول نرگس کا لیے بھیچک کھڑا تھا راہ میں
کس کی چشمِ پُرفسوں نے میر کو جادو کیا

تب قیس جنگلوں کے تین آگ دے گیا
ہم بھر چلے ہیں رونے سے اب سائے بن میں اب

جان کا صرفہ نہیں ہے کچھ تجھے کڑھنے میں میر
غم کوئی کھاتا ہے میری جان غم کھانے کی طرح

ناسازی و خستہ جنگل ہی چاہتی ہے
شہروں میں ہم نہ دیکھا بالیدہ ہوتے کیکر

تم نے دیکھا ہوگا پکپن میر کا
ہم کو تو آیا نظر وہ خام سہل

اب چھیڑیے جہاں وہیں گویا ہے درد سب
پھوڑا سا ہو گیا ہے ترے غم میں تن تمام

محبت نے کھویا کھپایا ہمیں
بہت ان نے ڈھونڈھا نہ پایا ہمیں

سدا ہم تو کھوئے گئے سے رہے
کبھو آپ میں تم نے پایا ہمیں

آہِ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا
اس باو نے ہمیں تو دیا سا بھادیا

دیکھا کہاں وہ نسخہ اک روگ میں بسا ہا
جی بھر کبھو نہ پنپا بہتیری کیس دوائیں

جنگل ہی ہرے تنہا رونے سے نہیں میرے
کو ہوں کی مکر تک بھی جا پہنچی ہے سیرانی

ان درس گہوں میں وہ آیا نہ نظر ہم کو
کیا نقل کروں خوبی اس چہرہ کتابی کی

کل بارے ہم سے اس سے ملاقات ہوگی
دو دو پچن کے ہونے میں اک بات ہوگی

ٹمک حالِ شکستہ کے سننے ہی میں سب کچھ ہے
پر وہ تو سخن رس ہے اس بات کو کیا مانے

اندوہ وصل و سحر نے عالم کھپا دیا
ان دو ہی منزلوں میں بہت یار تھک گئے

تڑپھے ہے جب کہ سینے میں اُچھلے ہے دو دو ہاتھ
گردل یہی ہے میر تو آرام ہو چکا

گل پھول کوئی کب تک جھڑ جھڑ کے گرتے دیکھے
اس باغ میں بہت اب جوں غنچہ میں رُکا ہوں

روشن ہے اس طرح دل ویراں میں ایک دماغ
اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

اَلْجھاوِ پڑ گیا جو ہمیں اس کے عشق میں
دل ساعز: بیز جان کا جنجال ہو گیا

محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ
دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

میر کی زبان آج بھی تازہ

اب آخر میں یہ سوال اٹھانا بھی ضروری ہے کہ میر کی زبان میں پُرانا پن ہے، لیکن یہ آج بھی پُرانی معلوم نہیں ہوتی۔ کیوں؟ ان دو سو برسوں میں زبان کتنی آگے نکل آئی ہے، اس میں کتنی تبدیلیاں ہو گئیں۔ نسخ کی روایت کے ماننے والوں پر ہندی کی چندی کا الزام دھرنا عام سی بات ہے حالانکہ متروکات کا سلسلہ منوستان شراے دہلی ہی کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ یہ لے بعد میں بڑھ گئی اور یاروں نے اظہار کی کیسی کیسی وسعتوں اور نرمیوں کی راہیں

مسدود کر دیں۔ زبان سب سے اہم سماجی مظہر ہے۔ سماجی ضرورتوں اور تاریخی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ زبان میں بھی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ کسی بھی زبان کو دیکھیے صدیوں پہلے کی زبان پُرانی اور ادھوری معلوم ہوگی۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ میر کی زبان پُرانی ہوتے ہوئے بھی پُرانی معلوم نہیں ہوتی۔ یہ سوال بیسویں صدی کے اواخر میں پوچھا جاسکتا ہے تو شاید آئندہ بھی پوچھا جاتا رہے گا۔ میر کی زبان کا بھلا لگنا یا پیارا لگنا الگ بات ہے۔ یہ میر سے محبت یا میر کے زخموں کی کائنات کی بنا پر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ لسانی طور پر بھی میر کی زبان پُرانی ہونے کے باوجود پُرانی معلوم نہیں ہوتی۔ یہ زبان آج بھی تازہ ہے گرم ٹپکتے ہوئے خون کی طرح یا کچے سونے کی طرح یا پھول کی پتی پر لرزتی ہوئی اوس کی بوند کی طرح۔ اس میں تازگی کا زندہ عنصر نہ ہوتا تو آزادی کے بعد میر کے تخلیقی اثرات کی جو بازیافت ہوئی اور نئی غزل کے غیر رسمی، شخصی اور تازہ کار ہلجے سے میر کی زبان کا جو تخلیقی رشتہ استوار ہوا، وہ رشتہ ہرگز استوار نہ ہو سکتا۔ تاہم بات صرف مقبولیت کی نہیں۔ میر کی زبان اپنے ARCHAIC (قدیم) عنصر کے باوجود ARCHAIC معلوم نہیں ہوتی، یہ آج کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ اس بارے میں یہ حقیقت ہے کہ میر کی زبان کا قدیمی عنصر شاید اس زبان کا ایک فی صد بھی نہیں۔ بنیادی ساختیں جن کا گہرا رشتہ اردو کی لسانی جڑوں، بولیوں ٹھولیوں اور زمینی اثرات سے ہے وہ سب جوں کی توں ہیں۔ میر کی زبان کا چونکہ گہرا اور سچا رشتہ بولیوں ٹھولیوں سے ہے، اس لیے اس زبان میں آج بھی گرم تازہ خون کی کیفیت ہے۔ زبانوں کے ارتقا کا یہ پہلو خاصا دل چسپ ہے کہ زبانیں اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ بلوغ کی منزلیں طے کرتی ہیں، اور پھر معیار رسیدہ ہو جاتی ہیں، لیکن بولیاں ٹھولیاں کبھی فرسودہ اور پُرانی نہیں ہوتیں۔ پُرانا ہوتے ہوئے بھی ان کا کچا سونا کبھی ماند نہیں پڑتا اور وہ ہمیشہ جوان رہتی ہیں۔ میر کی زبان کے سدا بہار ہونے کا راز بھی یہی ہے کہ اس زبان کا جو سیدھا سچا رشتہ

بولیوں سے ہے وہ آج بھی تو انا اور با معنی ہے، اور اس کی لسانی گونج آج بھی پورے
 برصغیر میں موجود ہے کیونکہ یہ بولیاں چاروں طرف زندہ ہیں۔ یہ بولیاں آج بھی میر کی زبان
 کے آئینے میں اپنا چہرہ دکھتی ہیں تو یہ رشتہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی تازہ اور نیا
 ہوتا رہتا ہے۔ میر کی زبان میں جڑوں کی بڑی اہمیت ہے، اس لیے وقت کا سیل اسے چھو
 نہیں سکتا۔ یہ زبان آج بھی تازہ ہے اور آئندہ بھی تازہ رہے گی۔

نغمگی اور ترنم ریزی: غنیت اور طویل مصوتے

میر کی زبان کے زمینی عنصر کی نغمگی اور ترنم ریزی کے بارے میں بھی کچھ اشارے
 ضروری ہیں۔ میر کی موسیقیت کا ذکر کرتے ہوئے اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ قافیے اور بحر
 مترنم لاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ردیفوں کی تکرار نیز ان کی طوالت سے بھی عمدہ کیفیت
 پیدا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں میر کی ہندی بحر کا ذکر ضروری ہے۔ میر نے بحر متقارب و
 متدارک میں بجائے سالم ارکان کے مختلف زحافات میں غزلیں کہہ کر اردو کو ہندی آہنگ
 سے قریب کر دیا۔ ستید عبداللہ کا کہنا ہے ”میر نے غزل کی تمام مروجہ بحور کو استعمال کیا
 ہے مگر سب سے زیادہ لطف ان کی لمبی بحر والی غزلوں میں ہے۔ لمبی بحر میں لطیف اور
 ہلکے احساس کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ ہندی گیت کو زندہ رکھنے یا زندہ کرنے کی جتنی کوششیں
 ہوتی ہیں، ان میں خصوصیت سے میر کا بہت حصہ ہے۔ میر کی گیت نما غزلیں اتنی مترنم اور
 پُر لطف ہیں کہ ان کی پوری کیفیتوں کا بیان نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے بعض درد کا اور بعض
 شوق کا اظہار کرتی ہیں، بعض تمنا کا، بعض میں حسرت ہے جس کا اظہار بحر و ہی سے
 ہو جاتا ہے۔“ (نقد میر ۵۰)

جو جو ظلم کیے ہیں تم نے سو سو ہم نے اٹھائے ہیں
 داغ جگر پہ جلاتے ہیں چھاتی پہ جراثیم کھائے ہیں

تب تھے سپا ہی اب ہیں جو گی آہ جو زنی یوں کاٹی
ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوا نگ بنائے ہیں

جھکی کچھ کہ جی میں چھٹی، بسھی ہلی تک کہ دل میں کھٹی بسھی
یہ جو لاگ پلکوں میں اس کی ہے نہ پھری میں ہے نہ کٹا رہیں

چھلے ہیں مونڈھے پھٹی ہے کہنی جسی ہے چولی پھنسی ہے ہری
قیامت اس کی ہے تنگ پوشی ہمارا جی تو بہ تنگ آیا

اٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

مرا شور سن کے جو لوگوں نے کیا پوچھنا تو کہے ہے کیا
جسے میر کہتے ہیں صاحبو! یہ وہی تو خانہ خراب ہے
بکھو لطف سے نہ سخن کیا بکھو بات کہ نہ لگا لیا
یہی لحظہ لحظہ خطاب ہے وہی لمحہ لمحہ محبت ہے

میر کی نغمگی میں غنیت اور طویل مصوتوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ میر ضمائر کی جمع
راتیں تمہاریاں، باتیں ہماریاں، اسی طرح مؤنث صورتوں میں افعال کی جمع عورتیں آئیاں،
پھولوں کی جھڑیاں ہلیاں، زلفیں دکھائیاں لاتے ہیں۔ اسی طرح حال میں آنکھیں ترستیاں

ہیں، ماضی قریب میں شکلیں خاک میں ملائیاں ہیں، ماضی بعید میں باتیں بہت بنائیاں، ماضی
 احتمالی میں وہ آئیاں ہونگی، ماضی تمنائی میں کاش وہ نگاہیں آنکھوں میں گرٹتیاں لاتے ہیں۔
 ان تمام افعال میں کیا ایک ہی صوتی عنصر کی کرشمہ کاری نہیں؟ یہ نون غنہ کا استعمال ہے جو
 طویل مصوتوں کے ساتھ ہی ممکن ہے اور جس کی ترنم ریزی کے بارے میں کسی وضاحت
 کی ضرورت نہیں۔

جفائیں دیکھ لیاں، بے وفائیاں دیکھیں
 بھلا ہوا کہ تری سب بُرائیاں دیکھیں

دیکھیں تو کیا دکھائے یہ افراطِ اشتیاق
 لگتی ہیں تیری آنکھیں ہمیں پیاریاں بہت

گل نے ہزار رنگ سخن بھر کیا ولے
 دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

تھا دل جو پکا پھوڑا بیاری الم سے
 دکھا گیا دو چنداں جوں جوں دو الگائی

کب سے نظر لگی تھی دروازہ حرم سے
 پردہ اٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم سے

دل کی کچھ تفصیر نہیں ہے آنکھیں اس سے لگ پڑیاں
مار رکھا سوان نے مجھ کو کس ظالم سے جا لڑیاں

یولیوں سے رشتہ / اندرون میں جیسے باغ لگا /

وقت کی دوڑ میں میر کی زبان کے یہ انچھر بھلا دیے گئے، تاہم یہ آج بھی بھلے لگتے ہیں۔ اسی طرح کی کچھ اور خصوصیات دیکھیے۔ ماضی ناتمام میں وہ ڈریں تھے، تو ڈرے تھا، تم ڈرو تھے / فعل حال میں وہ چلے ہے، وہ چلیں ہیں، تم چلو ہو، / فعل میں جمع مؤنث کے صیغے مست ہو پڑیاں، صورتیں دکھائیاں، نعمتیں چکھ لیاں، بڑی بڑی ڈالیں کاٹیاں / مضارع میں آوے ہے، جاوے ہے، کھاوے تھا، لیوے تھا، بووے گا، سووے گا یا ٹوٹ گیا کی جگہ پر ٹوٹا گیا، پھوٹا گیا یا جگر آوے، ہنر آوے، ادھر آوے / یا سائبان جل جائے، زبان جل جاوے، استخاواں جل جاوے یا معطوفہ میں ڈھا کر کے بجائے ڈھائے کر، کھا کر کے بجائے کھائے کر، آئے کر، گائے کر ان سب میں جو چیز زائد ہے وہ طویل مصوتہ ہے خواہ وہ یائے ہو یا الف یا واو جس سے زبان کے لوچ اور ننگی میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ بات صرف اتنی نہیں۔ اردو میں الفاظ کے ربط کے لیے عطف و اضافت کے دو زبردست وسیلے ہیں۔ عطف کا سلسلہ تو تمام ہند آریائی زبانوں میں ہے اور زمینی اثرات کے ذیل میں بھی آتا ہے۔ اضافت کو میر کم استعمال کرتے ہیں لیکن حروف کی تخفیف کی کیسی کیسی صورتیں میر کے یہاں ملتی ہیں۔ مثلاً مجھ پاس، ہم پاس، کسی کنے، دوش اوپر، بلبل کنے، دل ساتھ، دل سوا، گلوں چھٹ، ہم وہاں دیر رویا کیے، چمن بیچ، اپنے اعتقاد، دل ترے کوچے سے آنے کہے ہے یعنی آنے کو۔ جگہ جگہ نے کا حذف ہوا ہے / پوچھا جو میں نشاں / ہم قیاس کیا / باس کیا / لیکن یہ کھٹکتا نہیں۔ یہ صورتیں ایک ایسی زبان کا پتہ دیتی ہیں جو بعد کی زبان سے لسانی ساختوں کے اعتبار سے یقیناً زیادہ

وسیع، زیادہ بھرپور اور زیادہ متمول تھی۔ ملاحظہ ہوں یہ چند شعر:

حرم کو جاتیے یادیر میں بسر کرے
تری تلاش میں اک دل کدھر کدھر کرے

ٹمک تمہارے ہونٹھ کے ہلنے سے یاں ہوتا ہے کام
اسنی اتنی بات جو ہووے تو مانا کیجیے

عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ اٹھی یہ آگ ناگا ہی کہ گھر سب پھک گیا

ایک دل کو ہزار داغ لگا
اندرونے میں جیسے باغ لگا

نکبتِ خوش اس کے پنڈے کی سی آتی ہے مجھے
اس سبب گل کو چمن کے دیر میں نے بو کیا

باغباں بے رحم گل بے دید موسم بے وفا
آشیاں اس باغ میں بلبل نے باندھا کیا بھم (خذف کر)

رہتی ہے چت چڑھی ہی دن رات تیری صورت
صفحے پہ دل کے میں نے تصویر کیا نکالی

گل کو محبوب ہم قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس کیا
(حذفِ نے)

عشقِ خواباں کو میر میں اپنا
قبلہ و کعبہ و امم کیا
(حذفِ نے)

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو ہیں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا
(حذفِ نے)

یہ دعا کی تھی تجھے کن نے کہ بہرِ قتلِ میر
محضرِ خونیں پہ تیرے اک گواہی بھی نہ ہو

کچھ گل سے ہیں شگفتہ کچھ سرو سے ہیں قد کش
اس کے خیال میں ہم دیکھے ہیں خواب کیا کیا
(حذفِ نے)

مگر آنکھ تیری بھی چمکی کہیں
ٹپکتا ہے جتوں سے کچھ پیار سا

دل بہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا
 آپڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیسرا بن جلا
 کب تک دھونی لگائے جو گیوں کی سی رہوں
 بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے تو مرا آسن جلا
 شعلہ افشانی نہیں یہ کچھ نئی اس آہ سے
 دوں لگی ہے ایسی ایسی بھی کہ سارا بن جلا

سناہٹے سے باغ میں اٹھتے ہیں اے نسیم
 مرغ چمن نے خوب متھا ہے فغاں کے تئیں

جامہ مستی عشق اپنا مگر کم گھیر تھا
 دامن ترکا مرے دریا ہی کا سا پھر تھا

جلوہ ماہ تہہ ابر تنک بھول گیا
 ان نے سوتے میں دوپٹے سے جو منہ کوٹھا کا

ان گل رُوخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں
 جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

میر کی زبان کے صوتیاتی امتیازات ایک الگ مقالے کا تقاضا کرتے ہیں۔ سر دست اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ اس مطالعے کے شروع میں کہا گیا تھا زبان میر کے صوتیاتی امتیاز کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ اس میں فارسی عربی کی صغیری آوازوں کے ساتھ ساتھ دیسی

ہکار اور معکوسی آوازیں گھل مل گئی ہیں۔ سید عبداللہ میریات کے واحد نقاد ہیں جن کی نظر میر کی صوتیات تک گئی ہے۔ انھوں نے تکرارِ حروف سے بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میر کاف اور گاف سے غیر معمولی دل چسپی رکھتے ہیں۔ بعض بعض غزلوں کے الفاظ تو انہیں دونوں حروف سے بھرے پڑے ہیں :

آہ کس ڈھب سے روئیے کم کم
شوق حد سے زیادہ ہے ہم کو

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

تجھ کو کیا بننے بگڑنے سے زمانے کے کہیاں
خاک کن کن کی ہوئی اور ہوا کیا کیا کچھ

کیا آگ کی چنگاریاں سینے میں بھری ہیں
جو آنسو مری آنکھ سے گرتا ہے شر ہے

نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت
کہو میر جی آج کیوں ہو خفا سے

کھول کر آنکھ اڑا دید جہاں کا غافل
خواب ہو جائے گا پھر جاگنا سوتے سوتے

جم گیا خوں کفِ قاتل پہ تیرا میر ز بس
ان نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

بات صرف کگ کی نہیں۔ یہی حال بھ پھ تھ دھ وغیرہ اورٹ ڈر اور ٹھ ڈھ رھ کا بھی ہے۔ اور یہی وہ روپ ہیں جو صغیری اور بندشی آوازوں کے ساتھ مل کر اردو کے اردو پن یا اردو کے پورے صوتیاتی امکانات کو اُجاگر کرتے ہیں۔ میر کے جتنے اشعار اس مقالے میں پیش کیے گئے، انہیں کہیں سے دیکھیے، خوش امتزاجی کی یہ صوتی کیفیت برابر ملے گی۔ بعض جگہ تو پوری کی پوری غزلیں ایسی ہیں جن کی زمینیں ہی ان آوازوں سے آباد ہیں۔

دل کی طرف کچھ آہ سے دل کا لگاؤ ہے
ٹک آپ بھی تو آئیے یاں زور باؤ ہے
گھاؤ ہے / چھپاؤ ہے / بناؤ ہے ...

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سُنو ہو یہ بستی اُجاڑ کر
گاڑ کر / اکھاڑ کر ...

دو دن سے کچھ ہی تھی سو پھر شب بگڑ گئی
صحبت ہماری یار سے بے ڈھب بگڑ گئی
واشد کچھ آگے آہ سی ہوتی تھی دل کے تئیں
اقلیمِ عاشقی کی ہوا اب بگڑ گئی
گرمی نے دل کی ہجر میں اس کے جلا دیا
شاید کہ احتیاط سے یہ تب بگڑ گئی

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم
کاہے کو میر کوئی دے جب بگڑ گئی

جب تک کڑی اٹھائی گئی ہم کڑے رہے
ایک ایک سخت بات پہ برسوں اڑے رہے
پڑے رہے / کھڑے رہے ...

دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا
رات کو سینہ بہت کُٹا گیا
چھوٹا گیا / لُٹا گیا ...

میر کی شاعری میں معکوسی اور ہرکار آوازوں کی تاک جھانک جو لطف و اثر پیدا کرتی ہے اس کے لیے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ میر کے یہاں دیسی عنصر کے سحرکارانہ صرف سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ زبان میں کوئی آواز اچھی یا بُری نہیں ہوتی۔ لفظ یا آواز کا اثر، اس کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے۔ بعد کے شاعروں نے کچھ آوازوں اور لفظوں کو اچھوت بنا کر اردو میں کیسی شدید برہمنیت یا ملائیت کو رواج دیا۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ نئی شاعری کے تحت جو نئی اسلوبیاتی روایت بننا شروع ہوئی ہے وہ اس عہد میں کچھ ایسا باغیانہ لسانی کردار ادا کر رہی ہے جیسا زمانہ قدیم میں گوتم بُدھ نے برہمنیت کے خلاف کیا تھا۔ پالی کی سرپرستی اس وقت زبان کی جڑوں کی طرف لوٹنے کا عمل تھا۔ معیار بندی ضروری ہے، لیکن معیار بندی اگر جکڑ بندی بن جائے تو جڑیں سوکھنے لگتی ہیں۔ اردو میں زبان کی جڑوں کی نمائندگی جیسی میر کی شاعری کرتی ہے، دوسرا کوئی نہیں کرتا۔ ادھر لہجہ میر کی پیروی اردو زبان کے اپنی جڑوں سے نیا رس حاصل کرنے کا کھلا ہوا اشارہ ہے۔

ریختہ رُتے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے

اوپر کی بحث میں اگرچہ میر کے شعری اسلوب کی بنیادی جہات کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم بہت سے ذیلی نکات اور تفصیل ایسی ہیں جن پر مزید گفتگو ہو سکتی تھی۔ لیکن طوالت کے خوف سے ان سے صرف نظر کرنا پڑا۔ میر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے پوری اردو کے ادبی حسن کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ آشکار کیا۔ ٹھیٹھ بول چال کی زبان سے انھوں نے شاعری کی زبان وضع کی اور فارسی اثرات کی خوش آہنگ آمیزش سے ایمانی اظہار کی ایسی ایسی رفعتوں تک ایک نوزائیدہ زبان کو پہنچا دیا کہ باید و شاید۔ میر کے یہاں حسن کاری اور تہ داری کی بنیادیں دراصل زبان کی جڑوں میں پیوست ہیں۔ ان کی سلاست، صفائی، لطافت، اگرچہ بے ارادہ اور بے کاوش معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے پیچھے جو زبردست تخلیقی جوہر ہے، وہ ایسا بھید بھرا معنیاتی زیروم پیدا کرتا ہے کہ وجود کے بہت سے سُراس کی زد میں آجاتے ہیں۔ فراق نے کیا خوب کہا ہے ”معلوم ہوتا ہے کہ میر نہیں بول رہے ہیں ہماری انسانیت اور ہماری فطرت بول رہی ہے۔“ میر کی آواز کا جادو ہر عہد میں محسوس کیا جاتا رہا ہے۔ ان کے لہجے کی خوش آہنگی اور تاثیر اور درد مندی کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔ ان کے یہاں محروں اور آوازوں کے ترم، گونج اور تھر تھرا، ہٹوں سے پورا پورا کام لیا گیا ہے۔ وہ ایسے صنائع ہیں جن کی صناعتی آسانی سے نظر نہیں آتی۔ ان کے یہاں خاموشی اور ستائے بولتے ہیں۔ کم سے کم لفظوں سے وہ ایسی تصویریں بناتے ہیں، اور داخلی محسوسات کی ایسی ترجمانی کرتے ہیں کہ دل پر چوٹ پڑتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایسی دل آویزی اور دل آسانی ہے جو اور کہیں نہیں ملتی۔ میر کی زبان آج بھی زندہ ہے، اور یہ زبان آج بھی دل کی تہوں سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میر کی عظمت کے کئی گوشے ہیں لیکن شاید سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے پوری زبان کے پورے امکانات کو روشن کیا

اور پوری زبان کی ظاہری اور زیریں ساختوں کو جس طرح برتا اور جس طرح شعری اظہار کی
اعلا ترین سطحوں پر فائز کیا، یہ اعزاز اور اعجاز کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے

معتقد کون نہیں میر کی استاد کی

میر کی شاعری درد مند انسانیت کی آواز ہے۔ میر کی چشم خوں بستہ انہیں ہر دل سے ضرور
قریب کر دیتی ہے، لیکن میر کا سمجھنا سہل نہیں۔ میر کی بصیرت تہ در تہ ہے۔ انہوں نے
اپنی موجِ سخن کو بلاوجہ صد رنگ نہیں کہا تھا:

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر

صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

لیکن اردو تنقید نے ابھی اس موجِ صد رنگ کے تمام رنگوں سے انصاف نہیں کیا۔ پورے
میر کو سمجھنا اور پہچاننا ابھی باقی ہے۔

لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میر

دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

(بابائے اردو مولوی عبدالحق یادگاری خطبہ)

انجمن ترقی اردو (پاکستان) مئی ۱۹۸۴ء

اسلوبیاتِ انیس

انیس کے شعری کمال اور ان کی فصاحت کی داد کس نے نہیں دی، لیکن انیس کے ساتھ انصاف سب سے پہلے شبلی نے کیا اور آنے والوں کے لیے انیس کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کی شاہراہ کھول دی۔ بعد میں انیس کے بارے میں ہماری تنقید زیادہ تر شبلی کے دکھاتے ہوئے راستے پر چلتی رہی ہے۔ انیس کے محاسن شعری کے بیان میں شبلی نے جو کچھ لکھا تھا، پون صدی گزرنے کے باوجود اس پر کوئی بنیادی اضافہ آج تک نہیں کیا جاسکا۔ شبلی نے انیس کی فصاحت کے ضمن میں جو کچھ کہا تھا، وہ دراصل مشرقی نظریہ شعری کی آخری شمع کے بھڑک اٹھنے کا منظر تھا۔ شبلی نے شعرا بعمم اور موازنہ انیس و دبیر لکھ کر مشرقی شغریات اور جمالیات کی جو خدمت کی تھی، ویسی اور اس پالیے کی بھرکسی سے نہ ہو سکی۔ حالی کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ شاعری میں نشاۃ الثانیہ کے نقیب تھے جس کا منطقی نتیجہ آگے چل کر عقلیت پرستی اور افادیت پسندی پر اصرار کی شکل میں ظاہر ہوا۔ شبلی شعر میں حظ و لطف اور فصاحت و ادا بندی کے دلدادہ تھے۔ یوں دونوں کی شخصیتیں متاخرین شعراے اردو کے غالب رجحان یعنی ناسخیت سے انحراف کے طور پر ابھری تھیں۔ لیکن دونوں کا ردِ عمل ان کی اپنی اپنی انفرادی افتادِ طبع کا انداز لیے ہوئے تھا۔

انیس کے زمانے میں شعر گوئی کے دو انداز عام تھے: ایک انداز تو وہی قدیمی تھا جس کی رو سے میر تقی میر کو خداے سخن تسلیم کیا گیا تھا، اور جو اپنے وسیع معنوں میں دہلوی شعرا سے

منسوب کیا جاتا تھا، یعنی تغزل، درد مندی، سوز و گداز، جذبات نگاری، لطف بیان، جدتِ ادا، سلاست، روانی، اور اداے معنی میں حسن و سلیقہ جسے عرفِ عام میں فصاحت کہتے تھے، اور دوسرا وہ جسے ناسخ اور ان کے شاگردوں، پیرووں اور ہم عصروں نے شہرت کے بامِ عروج تک پہنچایا تھا اور جسے اپنی اپنی شعر گوئی کے ذریعے استحکام بخشا تھا۔ یعنی جس میں بالذات قدرتِ بیان، مشاقی، نغظی شعبہ گری، صنائعِ نغظی و معنوی (معنیوں میں)، مضمون آفرینی، نازک خیالی اور علمیت کا اظہار شاعری کا مقصد اور منتہا سمجھا جاتا تھا۔ انیس کے فن کو پوری طرح سمجھنے کے لیے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ انیس کی شعری شخصیت اس پُر تصنع رجحان کے خلاف ردِ عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس زمانے کے لکھنؤ میں ناسخیت کا ڈنکا بجتا تھا، ناسخیت ہی سکے۔ مآجِ الوقت تھی۔ اردو کی شعری روایت میں قادر الکلامی اور مشاقی کا بہترین اظہار قصیدے کی فضا میں ممکن تھا۔ ناسخ اور ان کے پیرووں نے اپنی صناعتی اور بے روح قافیہ پیمائی کے لیے تقویت اسی روایت سے حاصل کی ہوگی کیوں کہ غزل کی سابقہ روایت میں سوائے شاہ نصیر کے ایسی کوئی نظیر نہیں تھی۔ اور خود شاہ نصیر کی سائیکی نے جس سرپرستانہ ماحول کے زیر اثر ان عناصر کو قصیدے کی روایت سے جذب کیا تھا، وہ کئی گنا ملگبر صورت میں لکھنؤ کے نوابانہ ماحول میں موجود تھے، اور ناسخ اور ان کے متبعین نے غزل میں اس روایت کو نہ صرف ایک غالب رجحان کی شکل دی بلکہ اسے اس حد تک پر شکوہ اور باوقار بنایا کہ دوسرے تمام رنگ اس کے سامنے پھیکے پڑ گئے۔ انیس نے مرثیے میں شعوری طور پر اپنے عہد کے اس غالب رجحان سے انحراف کیا۔ لیکن ناسخیت سے بازی لے جانا بغیر اس کے حربے استعمال کیے ممکن نہ تھا۔ یوں تو فصاحت کا تصور ہر دور میں خاصا مبہم اور وجدانی رہا ہے، نیز ہر جالیاتی تصور کی طرح جتنا اُسے ذوق کی سطح پر محسوس کیا جاسکتا ہے، اتنا اُسے معروضی طور پر مشرح نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم انیس کے ضمن میں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا انیس کی فصاحت ویسی فصاحت تھی جس کا تصور قدامتوسطین کے یہاں ملتا ہے یا انھوں نے مرثیے کی فضا میں قصیدے کی روایت سے

(غیر شعوری طور ہی پر سہی) استفادہ کر کے فصاحت کے مروجہ مفہوم میں نئی جہات کا اضافہ کیا؛ اس طرح گویا ناسخیت کے بعض اجزا کی تقلیب کر کے انہوں نے ناسخیت سے طمکرتی، مرثیے کو نیا جمالیاتی ذائقہ دیا اور بالواسطہ طور پر ناسخیت کی شکست میں ایک تاریخی کردار ادا کیا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کیا اردو کو ان کی سب سے بڑی دین یہی تو نہیں۔ شبلی انیس کے سخن فہم ہیں لیکن یاد رہے کہ وہ ان کے طرف دار بھی ہیں۔ اور اس طرفداری میں انہوں نے انیس کی فصاحت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ غیر مشروط ہے اور شاید اس لحاظ سے اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے جیسا کہ آگے چل کر وضاحت کی جائے گی۔ شبلی کو اس فصاحت کا سراغ خود انیس کے بار بار کے دہرائے ہوئے بیانات میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ تعریف کے جوش میں انہوں نے انیس کے بیانات کو جوں کا توں تسلیم کر لیا، اگرچہ انیس کے مشہور مرثیے / نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری / کے دوسرے مصرعے میں بلاغت کا ذکر بے وجہ نہیں۔ / ناطقے بند ہیں سن کے بلاغت میری / یہاں بلاغت محض برائے بیت نہیں اگرچہ خود انیس کو گہرا احساس اپنی فصاحت ہی کا تھا:

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلم کر دوں

بجر مواجِ فصاحت کا تلاطم کر دوں

اسی مشہور مرثیے میں پورے شاعرانہ شکوہ سے فرمایا ہے:

یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال

معجزہ گرنہ اُسے کہیے تو ہے سحرِ حلال

ایک اور بند میں کہتے ہیں:

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے

سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے زیب ہے خالِ سیہ چہرہ گلِ رو کے لیے

داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد

ہر سخن موقع و ہر نقطہ مقامے دارد

انیس کے مرثیے کے بارے میں اس پہلو کو پوری طرح پرکھنے کی ضرورت ہے کہ انیس جس فصاحت کا دعویٰ کرتے ہیں اور شبلی اور ان کے بعد آنے والے نقاد انیس کی جس فصاحت کی داد دیتے ہیں، کہیں اس کا گہرا تعلق مسدس کے فارم کو انتہائی فن کاری کے ساتھ برتنے میں تو نہیں؟ اور اگر ایسا ہے تو انیس نے مسدس کو اس مقام تک پہنچانے میں اردو کی شعری روایت کے کن اجزا کی تقلیب کی اور کن مسائل کو برتا؟ مسدس انیس کی ایجاد نہیں۔ مرثیے کے لیے مسدس کا فارم انیس سے مدتوں پہلے رائج ہو چکا تھا۔ انیس نے اسے جلا دی اور ایسی فنی بلندی تک پہنچا دیا کہ یہ ہیئت اردو میں لازوال ہو گئی اور اس کے اثرات بعد میں آنے والے نظم گو شاعر بھی قبول کرتے رہے۔

یہ معلوم ہے کہ ہیئت کے اعتبار سے مرثیے کی ساخت اس کے تدریجی ارتقا کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی۔ اظہر علی فاروقی نے لکھا ہے کہ شروع شروع میں مرثیہ، سبزل اور مثنوی کی ہیئت میں نظم ہوتا تھا۔ اس لیے کہ سوز خوانی اور لحن کے طرز میں پڑھنے کے لیے یہ فارم نہایت موزوں تھے (اردو مرثیہ: طبع الہ آباد ۱۹۵۸ء، ص ۸)۔ اسی طرح مربع اور دو بیٹی مرثیے بھی لکھے گئے۔ میر اور سودا کے زمانے تک نظم کی ہر شکل میں مرثیہ کہا گیا (سفارش حسین رضوی: اردو مرثیہ: تاریخ مرثیہ طبع دہلی ۱۹۶۵ء، ص ۱۹۳)۔ اس زمانے میں مرثیے نے دراصل ادبی منصب حاصل نہیں کیا تھا۔ مرثیہ صرف رونے رلانے اور ثواب کمانے کی چیز تھا۔ بگڑا شاعر مرثیہ گو کی کہاوت اسی زمانے سے چلی ہوگی۔ لیکن میر و سودا کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے مرثیہ سے ادبی تقاضے شروع ہو گئے۔ مسیح الزماں کا یہ بیان صحیح ہے کہ سودا کی طبیعت ہمہ گیر تھی (اردو مرثیہ کا ارتقا: طبع لکھنؤ ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۵)

انہوں نے اپنی ذہانت اور جدتِ فکر سے نئے نئے پہلو نکالے اور مرثیے کو ادبی حیثیت دینے کے لیے مختلف راستوں سے چل کر مسدس تک پہنچے۔ اگرچہ سودا نے مخمس، مستزاد، دہرا بند کئی صورتوں میں مرثیے لکھے، لیکن پہلا مسدس مرثیہ کہنے کا سہرا عام طور پر سودا ہی کے سر ہے۔ سودا نے اپنے رسالے ”سبیل ہدایت“ میں محمد تقی تقی کی جو خبر لی ہے اور اس کی تک بندی کا جو مذاق اڑایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مرثیے کی ادبی حیثیت تسلیم کی جانے لگی تھی اور شعرا مرثیے کا مقصد محض رثائیت نہیں سمجھتے تھے بلکہ شعریت کو ضروری تصور کرتے تھے۔ اس وقت تک مرثیے کے لیے قصیدہ، مربع، ترجیع بند، ترکیب بند، مخمس، مستزاد سب آزمائے جا چکے تھے، لیکن جس فنی وسیلے سے مسدس کی مخصوص صوتی کیفیت اور ہنسی ڈرامائیت کی طرف پہلا قدم اٹھایا گیا، وہ ان مرثیوں کا رواج تھا جن میں فارسی یا برج بھاشا کی بیت یا آخری مصرع بطور ٹیپ استعمال ہوتا تھا اور کبھی ہر بند کو مختلف مصرعوں سے پابند کیا جاتا تھا۔ بعض مرثیوں میں یہ صورت بھی نظر آتی ہے کہ چار مصرعے ایک بحر میں ہیں اور بیت دوسری بحر میں۔ مسدس میں چار مصرعوں کے ہم قافیہ ہونے اور پھر بیت میں قافیہ کے بدل جانے یعنی اصوات اور آہنگ کی اس برابر جاری رہنے والی تبدیلی کے زیر و بم میں جو زبردست جمالیاتی اور ڈرامائی امکانات تھے، ان کی کشش شاید سب سے پہلے انہیں تجربوں میں محسوس کر لی گئی تھی۔ بہر حال اتنا معلوم ہے کہ مسدس میرا اور سودا کے زمانے میں رائج ہو چکا تھا۔ اگرچہ میر کے زیادہ تر مرثیے مربع ہیں اور سودا کے بہتر مرثیوں میں نصف سے زیادہ مربع ہیں اور مسدس کی ہنیت میں صرف چھ مرثیے ہیں۔ تاہم سودا کی طباعی اور ان کے متنوع ہنسی تجربوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مرثیے کو مسدس تک پہنچانے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہوگا۔ یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ اردو شاعری نے اپنی تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ سب کی سب فارسی سے لیں، لیکن

مرثیے کی ہنیت مسدس کی شکل میں ہندوستان ہی میں صورت پذیر ہوئی۔ فارسی میں مرثیے کی ابتدا محتشم کاشانی (وفات ۹۹۶ھ) سے ہوئی لیکن ان کے تمام مرثیے اور ان کا مشہور مرثیہ دوازده بند قصیدے کی ہنیت میں ہے۔ (تاریخ نظم و نثر در ایران و در زبان فارسی: سعید نفیسی، طبع ایران ۱۳۲۲ھ شمسی ص ۲۲۳)۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفیق نے تاریخ ادبیات ایران میں لکھا ہے کہ شہیدان کربلا کے مرثیے میں محتشم کاشانی کا ترجیح بند بھی مشہور ہے (طبع ۱۹۵۵ء ص ۲۶۲)۔ غرض اردو مرثیے کا عروضی ڈھانچا وہی سہی، لیکن اس کی معنوی اور شعری اکائی جیسی وہ مسدس کی ہنیت میں اردو میں ظہور پذیر ہوئی، اس کا کوئی نقش نہ عرب میں ملتا ہے نہ ایران میں۔ یہ اردو کی اپنی چیز ہے، اور یہ اردو شاعری کی ایسی جہت ہے جس پر ابھی تک پوری طرح غور نہیں کیا گیا۔

اب ایک اور پہلو کو لیجیے یعنی یہ کہ تحت خوانی کا کیا ہاتھ مسدس کی تشکیل میں ہو سکتا ہے۔ دہلوی دور تک مرثیہ خوانی میں لحن اور آہنگ کا رواج تھا۔ اس لیے شعری تقاضوں سے زیادہ آواز، دھن، لے اور موسیقی پر توجہ تھی۔ اس وقت دہلی میں بہت سے عاشور خانے تھے جن میں مجلسیں ہوتی تھیں۔ درگاہ قلی خاں نے جو ۱۷۳۸ء سے ۱۷۴۱ء تک دہلی میں تھے، مرقع دہلی میں محتشم کاشانی اور حسن کاشی کے فارسی مرثیوں اور روضۃ الشہدا کے مجلسوں میں پڑھے جانے کا ذکر کیا ہے۔ (مرقع دہلی مرتبہ سید مظفر حسین، ص ۵۰ تا ۵۲)۔ قیاس چاہتا ہے کہ جیسے جیسے مرثیہ روایت شعر کا حصہ بننے لگا، لحن و آہنگ کی جگہ تحت خوانی کا رواج ہونے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ مرثیے کے ادبی جوہر بھی نکھرنے لگے۔ تحت خوانی کے لیے غزل یا مربع سے کہیں زیادہ منہس یا مسدس کی ضرورت تھی۔ سودا کے دور میں دوہرے لگانے کا یا ترجیح میں ٹیپ لانے کا رواج تھا ہی، دوہرے برج بھاشا کے اور ٹیپ کی بیت فارسی

کی رائج تھی۔ یہ رواج اردو میں برج اور فارسی کی ”ریختہ“ پیوند کاری کے اس رواج سے مختلف نہیں تھا جس کی جڑیں تصوف کی ہمہ گیر مقبولیت سے سماع کی محفلوں میں پیوست ہو چکی تھیں اور جس کے باقیات الصالحات آج تک قوالیوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

مرثیے میں مسدس کے رواج پا جانے کے سلسلے میں یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ ہماری کلاسیکی شاعری عبارت ہے غزل، قصیدہ، شنوی، رباعی سے۔ جب یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ مرثیہ اردو شاعری کی خالص اپنی ہئیت کا مظہر ہے تو کہیں ایسا تو نہیں کہ مرثیے کے مسدس کی تشکیل میں ان چاروں اصناف کا جوہر تحلیل ہو گیا ہو؟ انیس کے بارے میں مشہور ہے کہ زمانے کے رواج کے تحت وہ سب سے پہلے غزل کی طرف متوجہ ہوئے۔ بعد میں میر خلیق کے مشورے سے آخرت کے ثواب کے لیے انھوں نے اسی غزل کو سلام کر دیا۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ سلام وہ غزل ہے جس میں ائمہ سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اب کربلا کے واقعات پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اس ضمن کے سارے واقعات کا تعلق اولوالعزمی، شجاعت اور استحکام خودی کی اس تاریخی روایت سے ہے جو اسلام اور سامی ذہن کی خصوصیت خاصہ رہی ہے۔ واقعات کے مسلسل بیان کرنے کے لیے ہمارے پاس شنوی تھی، اولوالعزمی اور شجاعت کے بیانات کے لیے ہمارے پاس قصیدہ تھا اور لطیف جذبات کے اظہار کے لیے غزل تھی۔ چنانچہ سخن و آہنگ کے دور تک ان سب فارموں نے مرثیے کا کچھ نہ کچھ ساتھ دیا لیکن مجالس کے تمام تقاضے ان میں سے کسی بھی صنف سے پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ مرثیہ شاہ نامہ یا سکندر نامہ نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ مرثیے میں تمام واقعات کربلا کا اظہار مربوط و مسلسل نہیں ہوتا۔ ان میں تو واقعات کو فرداً فرداً لینا پڑتا تھا تاکہ مرثیہ ایک نشست میں ختم ہو جاتے اور رونے رلانے کے مقصد کو بھی پورا کرے۔

قصیدے میں مدح ہی مدح تھی، جبکہ مرثیے کے مدوح کی شہادت کو صدیاں گزر چکی تھیں اور مقصد اس کے اوصاف کو تازہ کرنا اور اس کے غم میں آنسو بہانا تھا۔ مجلس پڑھتے ہوئے یہ ضروری تھا کہ شہدائے کربلا میں سے کسی ایک کا ذکر کرتے ہوئے بیان کو بندوں میں تقسیم کر لیا جائے۔ ہر بند میں کسی صورت، کسی نقش، کسی پہلو، کسی واقعے، کسی مکالمے یا کسی حادثے کا تاثر ابھارا جائے اور پھر اس سب کو ہر بند کے ساتھ اس طرح سمیٹ لیا جائے کہ سننے والے کے جذبہ و تخیل پر چوٹ پڑے اور وہ مرثیے کے ارتقا کے ساتھ ساتھ درجہ بدرجہ اس تاریخی فضا میں کھو جائے۔ بند کے خاتمے کا مقصد رباعی کے فن کی یاد دلاتا ہے یعنی چوتھے مصرعے میں بات کا نچوڑ پیش کر دیا جائے۔ یہاں فرق یہ تھا کہ بند میں چار مصرعے ہم قافیہ تھے، رباعی کے چوتھے مصرعے کا کام دوہرے یا ٹیپ کے بجائے اب بیت سے لیا جانے لگا جس سے بند کی معنوی فضا کی تکمیل ہو جاتی تھی۔ غرض اس طرح اردو مرثیے کا وہ STANZA وجود میں آیا جسے مسدس کہتے ہیں۔ لیکن یہاں مجھے اتنا اصرار ثنوی اور رباعی کے اجزا پر نہیں۔ ان کا معنیاتی تعلق ہو سکتا ہے۔ لیکن مسدس سے گہرا اسلوبیاتی اور معنیاتی تعلق قصیدے اور غزل کا ہے جس کا تجزیہ آگے چل کر کیا جائے گا۔

انیس تک پہنچتے پہنچتے مسدس خاصا منجھ چکا تھا، دلچسپ بات صرف یہ نہیں کہ انیس کی شعری شخصیت نے اس فارم کو کتنا متاثر کیا بلکہ یہ بھی کہ خود ان کی ”فصاحت“ نے اس فارم کے سانچے میں ڈھل کر کیا شکل اختیار کی۔ اس طرح گویا ان کی شاعری میں وہ اسلوب سامنے آیا جس کے بے مثل ہونے کی سبب قسم کھاتے ہیں، لیکن جس کے اسلوبیاتی اور صوتی عناصر ترکیبی پر آج تک پوری توجہ صرف نہیں کی گئی۔ اس اجمال کے تجزیے کے لیے سب سے پہلے انیس کے اس شاہکار مرثیے کو لیجیے جس کا ذکر اس مضمون کے شروع میں کیا گیا تھا، یعنی ”نہک خوان تکلم ہے فصاحت میری“

چہرے کے حصے سے یہ دو بند ملاحظہ ہوں :

صبح صادق کا ہوا چرخِ چس وقت ظہور زمزمے کرنے لگے یادِ الہی میں طیور
مثلِ خورشید برآمد ہوئے خمیے سے حضور یک بیک پھیل گیا چار طرف دشت میں نور

شش جہت میں رخِ مولا سے ظہورِ حق تھا

صبح کا ذکر ہے کیا چاند کا چہرہ نق تھا

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں وہ بیاباں و سحر دم بدم جھومتے تھے دھند کے عالم میں شجر

اوس نے فرسٹ زبرد پہ بچھائے تھے گہر لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر

دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی

صاف عنخوں کے چلکنے کی صدا آتی تھی

پہلی ہی نظر میں احساس ہوتا ہے کہ دونوں بندوں میں پہلے چار چار مصرعے ”ر“ کی آواز

پر ختم ہوتے ہیں یعنی ظہور، طیور، حضور، نور اور دوسرے میں سحر، شجر، گہر، نظر۔ صوتیات کی

اصطلاح میں ایسے صوتی رکن کو جو کسی حرفِ صحیح، مصمتہ CONSONANT پر ختم ہو CLOSE

SYLLABLE پابند رکن کہتے ہیں اور جو ”الف“، ”واو“، ”سی“ یعنی حرفِ علت، مصوتہ

VOWEL پر ختم ہو، آزاد یا کھلا ہوا رکن OPEN SYLLABLE کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان

دونوں بندوں میں پہلے چار چار مصرعوں کے قوافی پابند ہیں اور ان میں ردیفِ سرے سے

ہے ہی نہیں۔ ان کے مقابلے میں اگر دونوں بندوں کی بیت کو دیکھیے تو نہ صرف یہ کہ

دونوں بیتوں میں ردیف ہے بلکہ ردیف بھی ایسی جس کے آخری رکن آزاد یعنی کھلے

ہوئے ہیں مثلاً ”حق تھا“، ”فق تھا“، اور دوسرے بیت میں ”صبا آتی تھی“، ”صدا آتی تھی“۔

اب ذرا آگے بڑھیے اور ان بندوں کو ملاحظہ فرمائیے :

اے خوشا حسنِ رخِ یوسف کنعانِ حسن راحتِ روحِ حسین ابنِ علی جانِ حسن

جسم میں زورِ علی بلع میں احسانِ حسن ہم تنِ خلقِ حسن، حسنِ حسن، شانِ حسن

تن پہ کرنی تھی نزاکت سے گرانی پوشاک
کیا بھلی لگتی تھی بچپن میں شہانی پوشاک

جب فریضے کو ادا کر چکے وہ خوش کردار کس کے کمروں کو بصد شوق لگائے ہتھیار
جلوہ فرما ہوتے گھوڑے پہ شہِ عرش و قار علم فوج کو عباس نے کھولا اکٹ بار
دشت میں نکہتِ فردوس بریں آنے لگی
عرش تک اس کے پھر ہرے کی ہوا جانے لگی

لہر وہ سبز پھر ہرے کی وہ پنچے کی چمک شرم سے ابر میں چھپ جاتا تھا خوشی فلک
کہتے تھے صلّیٰ علیٰ چرخ پر اٹھا ٹھکے ملک دنگ تھے سب وہ سما سے تھا سماں تاہر سماں
کہیے پتی اسے جو اوج ہمانے دیکھا
وہ سماں پھر نہ کبھی ارض و سماں دیکھا

چمک، فلک، ملک، سماں، یا کنعانِ حسن، جانِ حسن، احسانِ حسن، شانِ حسن وغیرہ الفاظ
جو سب کے سب مصمتوں پر ختم ہوتے ہیں اور پابند ہیں کیا قصیدے کی یاد نہیں دلاتے؟
اب ذرا بیت کو بھی دیکھیے۔ پہلے بند کی بیت سے قطع نظر آخری دونوں بندوں کی بیتیں
کھلی ہوتی ردیف میں ہیں یعنی مصمتوں پر نہیں بلکہ مصوتوں پر ختم ہوتی ہیں۔ ذرا اس بیت
کو پھر پڑھیے:

دشت میں نکہتِ فردوس بریں آنے لگی
عرش تک اس کے پھر ہرے کی ہوا جانے لگی

تو فوراً محسوس ہوتا ہے کہ بیت کے شعروں میں تغزل کی روح بول رہی ہے۔ مرثیے میں چہرہ ہو یا
سرایا، آمد ہو یا رجز، رزم ہو یا شہادت یہ سب اجزا معنًا قصیدے سے مناسبت رکھتے ہیں۔
قصیدہ ایک خاص شکوہ، بلند آہنگی، دبدبے اور شوکت کا اظہار چاہتا ہے اور مرثیے میں
تعریف مقصود تھی ایسے جیالوں اور جانبازوں کی جنہوں نے بڑی سے بڑی قربانی سے

دریغ نہیں کیا تھا۔ گویا مضمون کی علویت جس زور بیان کا تقاضا کرتی تھی وہ قصیدے کی معنوی اور عینی فضا کے قریب تر تھا۔ کسی بھی کامیاب قصیدے کو صوتی اعتبار سے دیکھیے تو پابند قوافی یعنی مصمتوں پر ختم ہونے والے ارکان کی بجٹی ہوتی زنجیر نظر آئے گا۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر انیس کی فصاحت کی انتخابی نظر قصیدے کے اس بنیادی تقاضے سے صرف نظر نہیں کر سکتی تھی۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس بات کا جاننا آسان ہے کہ انیس کا اصل کمال یہ ہے کہ قصیدے کی روح کو اپناتے ہوتے بھی اور پابند قوافی CLOSE RHYMES میں بند کہتے ہوئے بھی انہوں نے زبان کو کہیں بوجھل نہیں ہونے دیا بلکہ شوکت و بلند آہنگی کے ساتھ سلاست و روانی کو بھی بنائے رکھا اور بیت کی غزلیہ لے کی نرم روی سے مرثیے میں قصیدے اور غزل کی آمیزش سے ایک نئی جمالیاتی اور اسلوبیاتی سطح کا اضافہ کیا۔ انیس کی فصاحت اسی نئی اسلوبیاتی سطح سے عبارت ہے۔

یہاں فوری طور پر یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ انیس کے بندوں کے جن پابند قوافی کی طرف اشارہ کیا گیا، یہ کیفیت ان کے تمام مرثیوں میں قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہے یا صرف چند بندوں تک محدود ہے۔ مثلاً مشہور مرثیوں کے جو مصرعے ذہن میں آتے ہیں وہ پابند قوافی والے نظریے کی تردید کرتے ہیں :

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے
 کیا غازیان فوج خدا نام کر گئے
 جب رن میں سر بلند علی کا علم ہوا
 پہلا جو گریباں شب آفت کی سحر نے
 دشت و غامیں نور خدا کا ظہور ہے
 کیا فوج حسینی کے جوانان حسین تھے

جب خاتمہ بخیر ہوا فوج شاہ کا

ان مصرعوں سے یہ خیال ہوتا ہے کہ پابند قوافی کے جس مقدمے کو اوپر پیش کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں، کیونکہ مندرجہ بالا مشہور مراٹی کے مطلعوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ چنانچہ مراٹی انیس کی چاروں نول کشوری جلدوں سے مدد لی گئی تاکہ مندرجہ بالا مقدمے کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں قطعی رائے قائم کی جاسکے۔ ان چاروں جلدوں میں مراٹی کی کل تعداد اور پابند و آزاد اصوات پر ختم ہونے والے قوافی کی تقسیم درج ذیل ہے:

جلد اول	۲۹	۲۲	۲۲
جلد دوم	۲۶	۱۹	۷
جلد سوم	۱۸	۱۵	۳
جلد چہارم	۳۳	۲۶	۷
کل میزان :	۱۰۶	۸۲	۲۴

اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ پابند قوافی والے بندوں کی تعداد ایک چوتھائی سے بھی کم ہے اور مسدس کے بند کی جس پابند ساخت پر ہم زور دے رہے تھے وہ گمراہ کن ہے۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں۔ یہاں ہمیں اس بات سے دھوکا ہوا ہے کہ یہ اوسط صرف ان بندوں کا ہے جن سے مراٹی کا آغاز ہوا ہے۔ بعد میں آنے والے بندوں کا نہیں۔ یہ جان کر حیرت ہوگی کہ بعد میں آنے والے سینکڑوں بندوں کی کیفیت بالکل ڈومری ہے۔ اس گوشوارے سے اتنی بات تو بہر حال ثابت ہو ہی گئی کہ انیس اپنے اکثر مراٹی کی اٹھان کھلے قوافی والے بندوں یعنی مصوتوں سے کرتے ہیں لیکن جیسے جیسے طبیعت زور مارنے لگتی ہے اور تخیل جولانیوں پر آتا ہے تو وہ شعوری یا تحت الشعوری طور پر قصیدے کی روح سے ہم کنار ہو جاتے ہیں اور پابند قوافی یعنی مصمتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کھلے ہوئے قوافی والے بند آتے ہی نہیں،

آتے ہیں اور ضرور آتے ہیں۔ لیکن انیس کا غالب رجحان پابند قوافی یعنی مصمتوں کی طرف ہے۔

مراثی انیس میں بندوں کی ان دو شکلوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا گیا یعنی پابند اور آزاد، ایک شکل اور بھی ملتی ہے یعنی کہنے کو تو یہ بند مردف ہیں لیکن قافیہ ان میں بھی پابند ہے یعنی مصمتے پر ختم ہوتا ہے، جیسا کہ ذیل کے بندوں میں / قامت ، صورت ، صولت ، ہمت / پیکر ، برابر ، پر ، باہر / وغیرہ سے ظاہر ہے:

سر و شرمائے قد اس طرح کا قامت ایسی اسد اللہ کی تصویر تھے صورت ایسی
شیر نعروں سے ہل جاتے تھے صولت ایسی جا کے پانی نہ پیا نہر پہ ہمت ایسی

جان جب تک تھی اطاعت میں ہے بھائی کی

تھے علم دار مگر بچوں کی سقانی کی

ابر ڈھالوں کا اٹھایا تیغ دو پیکر چمکی برقی چھپتی ہے یہ چمکی تو برا بر چمکی
سوے پستی کبھی کوندی کبھی سر پر چمکی کبھی انبوہ کے اندر کبھی باہر چمکی

جس طرف آئی وہ ناگن اسے ڈستے دیکھا

میںھ سروں کا صف دشمن میں پرستے دیکھا

اس طرح کے بند بھی دراصل پابند قوافی ہی کی ذیل میں آتے ہیں۔

اس نظر سے دیکھیے تو زیر نظر مرثیہ ”نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری“ میں پابند و

آزاد بندوں میں ذیل کا تناسب ہے:

کل بند ۱۰۲

پابند قوافی والے بند ۵۵

کھلے / آزاد قوافی والے بند ۴۷

یعنی غالب رجحان پابند قوافی والے بندوں کا ہے۔ لیکن یہ صرف ایک مرثیے کی کیفیت ہے۔

یہ مقدمہ اس وقت تک پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتا جب تک دوسرے مراٹھی سے بھی اس کی توثیق نہ ہو جائے۔ مزید تجزیے کے لیے ہم نے انیس کے ایک اور شاہکار مرثیے ”جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے“ کا انتخاب کیا۔ اس کے تجزیے کے نتائج حسب ذیل ہیں :-

کل بند ۱۹۴

پابند قوافی ۱۴۰

کھلے قوافی ۵۴

اب ان دونوں مرثیوں سے ذیل کا اوسط حاصل ہوا :

کل بند $294 = 194 + 102$

پابند قوافی $195 = 140 + 55$

کھلے قوافی $101 = 54 + 47$

گویا پابند قوافی والے بند کل بندوں کا ۶۶ فیصد یعنی دو تہائی ہوتے۔ یہ دو مشہور مرثیوں کی کیفیت ہے۔ اس مقدمے کو حتمی طور پر ثابت کرنے کے لیے ہم نے نول کشوری مراٹھی انیس کی چاروں جلدوں کی مدد لی اور ہر جلد سے پانچ پانچ مرثیوں کو کہیں کہیں سے بغیر کسی تخصیص کے کھول کے دیکھا۔ اس طرح کے اتفاقی RANDOM اور غیر ارادی تجزیے سے جو نتائج سامنے آئے وہ حسب ذیل ہیں :

جلد اول : ص ۶۲ - ۶۳ = ۱۵ + ۳

ص ۱۹۴ - ۱۹۵ = ۱۰ + ۸

ص ۲۴۰ - ۲۴۱ = ۱۳ + ۵

ص ۳۱۰ - ۳۱۱ = ۹ + ۹

ص ۳۲۸ - ۳۲۹ = ۱۳ + ۵

کل بند ۹۰ = ۴۰ + ۳۰ آزاد

$$۶ + ۱۲ = ۶۵ - ۶۴ \quad \text{ص} \quad \text{جلد دوم:}$$

$$۷ + ۱۱ = ۱۳۱ - ۱۳۰ \quad \text{ص}$$

$$۱۱ + ۷ = ۲۰۱ - ۲۰۰ \quad \text{ص}$$

$$۶ + ۱۲ = ۲۶۳ - ۲۶۲ \quad \text{ص}$$

$$۱۱ + ۷ = ۲۹۹ - ۲۹۸ \quad \text{ص}$$

$$\underline{\underline{۲۹ \text{ پابند} = ۹۰ \text{ کل بند} \text{ ۲۱ آزاد}}}$$

$$۴ + ۱۳ = ۲۱ - ۲۰ \quad \text{ص} \quad \text{جلد سوم}$$

$$۶ + ۱۲ = ۳۳ - ۳۲ \quad \text{ص}$$

$$۱۲ + ۶ = ۴۳ - ۴۲ \quad \text{ص}$$

$$۵ + ۱۳ = ۱۳۷ - ۱۳۶ \quad \text{ص}$$

$$۵ + ۱۳ = ۲۱۱ - ۲۱۰ \quad \text{ص}$$

$$\underline{\underline{۵۸ \text{ پابند} = ۹۰ \text{ کل بند} \text{ ۳۲ آزاد}}}$$

$$۱۲ + ۶ = ۲۹ - ۲۸ \quad \text{ص} \quad \text{جلد چهارم}$$

$$۹ + ۹ = ۱۱۱ - ۱۱۰ \quad \text{ص}$$

$$۹ + ۹ = ۱۳۹ - ۱۳۸ \quad \text{ص}$$

$$۸ + ۱۰ = ۲۰۹ - ۲۰۸ \quad \text{ص}$$

$$۴ + ۱۳ = ۲۷۹ - ۲۷۸ \quad \text{ص}$$

$$\underline{\underline{۳۸ \text{ پابند} = ۹۰ \text{ کل بند} \text{ ۲۲ آزاد}}}$$

۲۲ آزاد	۲۸ پابند
= ۳۲	= ۵۸
= ۴۱	= ۴۹
= ۳۰	= ۴۰

میزان : کل بند ۳۶۰ = ۲۱۵ = ۱۴۵

اوسط = ۴۰ فی صد

نول کشوری جلدوں میں ہر صفحے پر نو بند ہیں۔ گویا آمنے سامنے کے دو صفحاتوں پر اٹھارہ بند ہوتے ہر جلد کو پانچ جگہ سے کھولا گیا۔ گویا $5 \times 18 = 90$ بند ہر جلد سے لیے گئے۔ اس طرح چار جلدوں سے بندوں کی کل تعداد ۳۶۰ ہوتی جن میں ۲۱۵ میں پابند قوافی اور ۱۴۵ میں کھلے قوافی ہیں، ان کا اوسط ۴۰ فی صد کا ہوا۔ گویا ”نکب خوان تکلم ہے فصاحت میری“ اور ”جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے“ کے دو مشہور مرثیوں کے تجزیے کی مدد سے ہم نے جو مقدمہ پیش کیا تھا اب گویا تمام جلدوں سے نمونے کے طور پر لیے گئے اتفاقی تجزیے سے بھی اس مقدمے کی توثیق ہوگئی یعنی مراثنی انیس کے بندوں کا غالب رجحان پابند اصوات یعنی مصمتوں کی طرف ہے یعنی اگر یہ کہا جائے کہ قصیدے کی روح نے انیس کے مراثنی میں ایک نیا قالب اختیار کیا تو بے جا نہ ہوگا۔ اب مسدس کی بیتوں یعنی آخر میں آنے والے دو مصرعوں کو بھی لیجیے جن کی کھلی ردیفوں اور منہ بولتے مصوتوں یا غنیت کا سیدھا سچا رشتہ غزل کے ہیئت فیضان سے جڑ جاتا ہے۔ غزل کا کوئی دیوان اٹھا کر دیکھیے اگر شاعر کا مقصد محض سنگلاخ زمینوں کو پانی کرنا نہیں تو اشعار کی زیادہ تعداد کھلی اصوات یعنی مصوتوں والے قوافی و ردیف میں ملے گی یعنی الف، واو، اور سی / رے کی ذیل میں یا

نون (غنة) میں جو الف، واو اور سی / رے کے ساتھ آتا ہے۔ بعینہ یہی صوتی کیفیت انیس کی بیتوں کی ہے۔ انیس کے جن دو مشہور مرثیوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان کی $۱۹۲ + ۱۰۲ = ۲۹۴$ بیتوں میں سے ایک بھی بیت ایسی نہیں ہے جس میں کھلی یعنی مصوتوں پر ختم ہونے والی ردیف نہ ہو۔ ان بیتوں کے سلسلے میں چند باتیں خصوصیت سے توجہ چاہتی ہیں :

- ۱ - بیت میں ردیف کا التزام ہر جگہ ہے۔
 - ۲ - ردیفوں میں کھلی اصوات کا استعمال کیا گیا ہے۔
 - ۳ - بیت میں افعال لازماً آتے ہیں :
 - ۴ - ردیف اکثر و بیشتر اگر فعل پر نہیں تو حرف جار پر ختم ہوتی ہے۔
- ان نکات کی وضاحت کے لیے ذیل کے بند ملاحظہ ہوں :

کٹ گئی تیغ تلے جب صفِ دشمن آئی یک بیک فصلِ فراقِ سرو گردن آئی
بگڑی اس طرح لڑائی کہ نہ کچھ بن آئی تیغ کیا آئی کہ اڑتی ہوئی ناگن آئی

غل تھا بھاگو کہ یہ ہنگام ٹھہرنے کا نہیں

زہر اس کا جو چڑھے گا تو اترنے کا نہیں

کہہ کے یہ باگ پھرائی طرفِ لشکرِ شام پڑ گیا خیمہ ناموسِ نبی میں کہرام
رن میں گھوڑے کو اڑاتے ہوتے آئے جو اماں رعبے فوج کے دل ہل گئے کانپے اندام

سرحکے ان کے جو کامل تھے زباں دانی میں

اڑ گئے ہوشِ فصیحوں کے بجز خوانی میں

یک بیک طبل بجا فوج میں گر جے بادل کوہ تھمڑائے زہیں ہل گئی گونجا جنگل
پھول ڈھالوں کے چکنے لگے تلواروں کے پھل مرنے والوں کو نظر آنے لگی شکلِ اہل

واں کے چادش بڑھانے لگے دل لشکر کا

فوج اسلام میں نعرہ ہوا یا حیدر کا

اوپر کے تینوں بندوں میں ردیف ہر بیت میں ہے اور ہر جگہ کھلی ہوتی ہے۔ ”نہیں“ او
 ”میں“ میں غنیت ہے۔ اب فعل کو دیکھیے: اوپر کے چار مصرعوں کے افعال کی بندش
 میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلے بند میں ”آئی“ فعل ہے جس کی چاروں مصرعوں
 میں تکرار ہوتی ہے۔ آخری دو مصرعوں کا انداز بالکل دوسرا ہے۔ یہ دونوں مصرعے
 امدادی فعل ”تھا“ پر لکے ہوئے ہیں اور دونوں مصرعوں میں فعل مکمل ہے۔ انیس
 کی اکثر بیتوں میں یہ ہوتا ہے کہ اوپر کے چار مصرعوں میں ’ل‘ کی جو بھی صورت رہی ہو،
 بیت میں آکر وہ اپنی تکمیل کو پہنچتی ہے یا اپنا قالب بدن کے مکمل صورت میں سامنے
 آتی ہے۔ اوپر کی دوسری بیت میں ”سر جھکے“، ”اڑ گئے“ اور تیسری بیت میں ”بڑھانے
 لگے“، ”نعرہ ہوا“ نہ صرف اوپر کے چار چار مصرعوں کی فعلیہ فضا سے اسلوبیاتی طور پر
 مختلف ہیں بلکہ فعلیہ سطح پر ہر لحاظ سے مکمل بھی ہیں اور اس انداز سے نہ صرف بند
 کی معنیاتی فضا کی بلکہ اسلوبیاتی اکائی کی بھی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کا کچھ انداز ذیل
 کی بیتوں کو بندوں کے ساتھ پڑھنے سے ہوگا:

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح گلزارِ شبِ خنزاں ہوا آئی بہارِ صبح

کرنے لگا فلک زرا انجمِ نثارِ صبح سرگرمِ ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح

تھا چرخِ انحضریٰ پہ یہ رنگِ آفتاب کا

کھلتا ہے جیسے پھول چین میں گلاب کا

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمدم مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم

وہ آبِ دنا ب نہروہ موجوں کا بیچ و خم سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم

کھا کھا کے ادس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

با چشمِ نم وہاں سے بڑھے آپ چند گام گویا زمیں کی سیر کو اترا مہ تمام

مثلِ نجومِ گرد تھے حیر کے لالہ نام شکلیں وہ نور کی وہ تجل وہ احتشام

زلفیں ہوا سے ملتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے

لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

ٹھنڈی ہوا میں سبزہ صحرا کی وہ لہک شرمائے جس سے اطلسِ زنگاری فلک

وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک ہر برگ گل پہ قطرہ شبِ نم کی وہ جھلک

ہیرے نجل تھے گوہرِ مکیا نثار تھے

پتے بھی ہر شجر کے جو اہر زنگار تھے

خیمے میں جا کے شہ نے یہ دیکھا حرمِ کاحال چہرے توفیق میں اور کھلے ہیں سرموں کے بال

زینب کی یہ دعا ہے کہ اے ربِّ ذوالجلال بچ جائے اس فساد سے خیر النساء کا لال

بانو سے نیک نام کی کھیتی ہری رہے

صنڈل سے مانگ بچوں سے گودی بھری ہے

ان بیتوں کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا خاتمہ یا تو امدادی

فعل پر ہوتا ہے یا فعل پر یا پھر حروفِ جار پر۔ یہ سب الفاظ (افعال ہوں یا حروفِ جار)

کھلی اصوات پر ختم ہوتے ہیں۔ انیس کے ہاں غیر مردّف بیتیں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ البتہ

اکا دکا پابند ردیفیں آتی ہیں ان کا تناسب یہ ہے: پہلے مرثیے کی کل ۱۰۲ بیتوں میں سے

پابند ردیفیں صرف ۵ ہیں، اسی طرح دوسرے مرثیے کی کل ۱۹۴ بیتوں میں سے پابند

ردیفیں صرف ۱۳ ہیں۔ گویا دونوں مرثیوں کی $۱۰۲ + ۱۹۴ = ۲۹۶$ بیتوں میں سے

صرف $۵ + ۱۳ = ۱۸$ پابند ردیفیں ہیں۔ یہ کل بیتوں کا ۶ فی صد سے زیادہ نہیں۔ اس

اوسط کی مزید تصدیق ہم نے بیس مختلف مراثی کے ان ۳۶۰ بندوں کی بیتوں سے بھی کی، جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ ان کے نتائج سے بھی اسی بات کو توثیق ہوئی۔

پہلی جلد ۶ : ۹۰

دوسری جلد ۵ : ۹۰

تیسری جلد ۷ : ۹۰

چوتھی جلد ۵ : ۹۰

میزان ۳۶۰ : ۲۳ : اوسط ۶ فی صد

یعنی ۳۶۰ بیتوں میں صرف ۲۳ پابند ردیفوں میں ہیں، اور اس اوسط کے پیش نظر اب اس وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی کہ بیتوں کا صوتی رجحان بندوں کے صوتی رجحان کے بالکل برعکس ہے، یعنی وہاں پابند قوافی اور مصمتوں پر زور تھا تو یہاں آزاد قوافی یعنی مصوتوں کی کثرت ہے۔ گویا بالکل دن اور رات کی کیفیت ہے۔ ہر چار مصرعوں کے بعد جب قافیہ بدلتا ہے تو ایک زبردست اندرونی موسیقیت اور ڈرامائیت پیدا ہوتی ہے۔ بندوں میں شوکت، دبدبہ، بلند آہستگی اور جلال ہے تو بیتوں میں جمال، رس اور لطافت ہے۔ بندوں میں اٹھان اور بیان ہے تو بیتوں میں تکلمہ اور خاتمے کی کیفیت ہے۔ بندوں کے مصمتے جب بیتوں کی کھلی آوازوں اور مصوتوں میں ڈھلتے ہیں تو عجب خوش آہنگی اور جمالیاتی کیف کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ہے قصیدے اور غزل کی روح کا وہ ملاپ جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا تھا کہ اس نے انیس کے یہاں ایک اچھوتا اسلوبیاتی پیکر اختیار کیا اور فصاحت کے قدیم تصور کو ایک نئی شعری جہت سے آشنا کیا۔

اس ساری بحث میں اب تک ہم نے دبیر کو نظر انداز کیا ہے۔ ہمارے مقدمے پر ابھی یہ سوال قائم کیا جاسکتا ہے کہ مراثی انیس کی جس امتیازی خصوصیت پر ہم اصرار کر رہے ہیں اور جسے انیس کی فصاحت کے ملفوظی اجزائے ترکیبی کا جزو لازمی قسرار

دے رہے ہیں، وہ کہیں مسدس ہی کی خصوصیت نہ ہو۔ یعنی قصیدے اور غزل کے ہیئت کی عناصر کی آمیزش اور مصمتوں اور مصوتوں کا صوتی ٹکراؤ اور جھنکار کہیں مسدس ہی کے فارم کی بدولت نہ ہو، اور تمام مسدس کہنے والوں میں یہ خصوصیت جزو مشترک **COMMON DENOMINATOR** ہی کی حیثیت نہ رکھتی ہو۔ اس صورت میں اس کا حق تحسین **CREDIT** مسدس کی ہیئت کو ملنا چاہیے نہ کہ انیس کے فن کو۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس ضمن میں انیس کے مسدس کا موازنہ دبیر کے مسدس سے کیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ خصائص مسدس کے ہیں یعنی ان کا وقوع مسدس میں بالقوة موجود **LATENT** ہے تو دونوں میں مشترک ہوں گے اور اس بارے میں انیس کا کچھ امتیاز نہ ہوگا، اور اگر ان کا تعلق شاعر کے جوہر ذاتی اور ذہن تخلیقی سے ہوگا تو دونوں کے یہاں اس ضمن میں جو کچھ بالابتیاز ہوگا، وہ ظاہر ہو کر سامنے آجائے گا۔ اودھ اخبار کی جلدوں یا نول کشوری جلدوں کی غیر موجودگی میں ”شعار دبیر“ مرتبہ مہذب لکھنوی (جس میں دبیر کے چھ بہترین مرثیہ شامل ہیں) اور ”شاعر اعظم مرزا سلامت علی دبیر“ مولفہ ڈاکٹر اکبر حیدری کا شمیری سے مدد لی گئی جس میں دبیر کا مرثیہ ”زرہ ہے آفتاب در بو تراب کا“ شامل ہے۔ ان کی مدد سے مرثیہ دبیر کے تجزیے کی جو کیفیت سامنے آئی درج ذیل ہے:

پابند قوافی والے بند	کل بند	
۳۱	۸۱	: زرہ ہے آفتاب در بو تراب کا
۴۹	۱۵۳	: جب ماہ نے نوافل شب کو ادا کیا
۳۸	۱۳۲	: کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
$\frac{۳۸}{۱۳۸} = ۳۸$ فی صد	$\frac{۱۳۲}{۳۶۶}$	

اتفاقی تجزیہ ”شعار دبیر“

(ہر دسواں صفحہ، کل پندرہ بار، : ۱۵۰ : ۳۱ = ۲۱ فی صد
فی صفحہ پانچ بند)

اب اس تجزیے سے یہ نہایت دلچسپ اور ناقابلِ تردید حقیقت سامنے آتی ہے کہ پابند قوافی والے بندوں کے استعمال پر دبیر کو وہ قدرت نہیں یا ان کی طبیعت کو پابند قوافی والے بندوں سے وہ نسبت نہیں جو انیس کو ہے۔ انیس کے یہاں پابند قوافی والے بندوں کا استعمال ۶۰ سے ۶۶ فی صد یعنی تقریباً دو تہائی ہے جبکہ دبیر کا RANGE ۲۱ فی صد سے ۳۸ فی صد ہے یعنی تقریباً ایک تہائی۔ اسی نسبت سے دونوں کے فن میں علاوہ دوسرے شعری عوامل کے جو بنیادی ہستی اور صوتی فرق ہے، یعنی پابند و آزاد قوافی کے ٹکراؤ، نیز تبدیلی اصوات کے مخصوص زیر و بم اور صوتی جھنکار سے جو جمالیاتی کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ اسی اعتبار سے دبیر کے یہاں کم ہے۔ دبیر کے یہاں یہ خصوصیت اگرچہ موجود ہے، لیکن اس ہمہ گیر اور اعلیٰ پیمانے پر نہیں جیسی انیس کے یہاں ہے۔ نیز اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ پابند قوافی والے بندوں کا استعمال مسدس کے فارم کی ناگزیر کیفیت نہیں، ورنہ دونوں کے یہاں ان کا اوسط کم و بیش ایک جیسا ہوتا۔

اس تجزیے سے انیس و دبیر کے فن کا فرق (صوتی حد تک) تو واضح طور پر سامنے آگیا لیکن جہاں تک مسدس کے فارم کا تعلق ہے، ابھی اس کو مزید جانچنے کی ضرورت ہے۔ بالخصوص مرثیے سے ہٹ کر جن شعرا نے مسدس کو برتا ہے، ان کے یہاں بھی یہ دیکھ لینا چاہیے کہ مسدس کی کیا کیفیت ملتی ہے اور پابند و آزاد قوافی والے بندوں کی کیا نوعیت ہے۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہم نے بوجہ حالی اور چکبست کا انتخاب کیا کیونکہ انیس کے بعد ان دونوں نے مسدس کے فارم کو جس کامیابی سے برتا ہے اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ مسدس حالی چونکہ مسلسل نظم ہے، درحالی طویل، اس لیے بہتر طریقہ یہی تھا کہ اس کا اتفاقی تجزیہ کیا جائے۔ اس سے جو دلچسپ نتائج سامنے آتے درج ذیل ہیں:

پابند توانی والے بندصفحہ

رمدس حالی صدی ایڈیشن

مرتبہ: ڈاکٹر سید عابد حسین

طبع لاہور ۱۹۵۷ء

۲	۸۰
۱	۹۰
۲	۱۰۰
۰	۱۱۰
۲	۱۲۰
۱	۱۳۰
۰	۱۴۰
۲	۱۵۰
۰	۱۶۰
۱	۱۷۰
۱	۱۸۰
۳	۱۸۵
۱	۱۹۵
۲	۱۶۵
۱	۱۵۵

پابند ۱۹ : اوسط ۳۲ فی صدکل بند ۶۰

ہر صفحے پر چار بند ہیں۔ اس طرح پندرہ صفحات پر کل ساٹھ بند ہیں۔ ان میں پابند قوافی والے بند صرف انیس نکلے، یعنی ایک تہائی سے بھی کم۔ یہ انیس کے اوسط سے آدھا ہوا۔ اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ (البتہ اس کی کو حالی ایک اور طرح سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی ان کے یہاں ۶۰ بیتوں میں سے ۱۵ پابند ہیں اور جو بالکل الگ بات ہے۔ انیس کے یہاں بیتیں بالعموم آزاد اور کھلی ہوتی ہیں)۔ اب ذرا چکبست کو ملاحظہ فرمائیے۔ ان کے یہاں ”رامائن کا ایک سین“ سے بہتر مسدس نہیں چنانچہ اسی کو لیا گیا۔ کل بند ۳۳، پابند قوافی ۲۴ اور ۳۳ بیتوں میں سے سوائے ایک کے سب آزاد اور کھلی ہوئی۔ کیا اس کے بعد یہ بتانے کی ضرورت باقی ہے کہ چکبست کا مسدس انیس سے کتنا قریب ہے، اور چکبست کے بارے میں وہ بات جو تاثراتی یا جمالیاتی طور پر کہی جاتی ہے کہ چکبست کا فن انیس سے شدید طور پر متاثر ہے، اس کی کیسی واضح معروضی بنیاد اس تجزیے سے سامنے آجاتی ہے۔ نیز اب اس بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ پابند قوافی والے بندوں کا کوئی مقررہ فی صد مسدس کے فارم کے لیے ناگزیر نہیں۔ مسدس کو برتنے والے مختلف شعرا کے یہاں اس کا اوسط مختلف ہے، یعنی کسی خاص تعداد میں پابند قوافی والے پہلے چار مصرعوں کا وقوع مسدس کے فارم کا COMMON DENOMINATOR نہیں۔ دوسرا اور حالی کے یہاں ان کا وقوع بالعموم ایک تہائی ہے جبکہ انیس کے یہاں دو تہائی۔ یہ فرق معمولی فرق نہیں، اور یہ امتیاز مسدس کو برتنے والے تمام شعرا میں صرف انیس کو حاصل ہے۔ انیس نے ایک جگہ کیا اچھا اشارہ کیا ہے:

بزم کا رنگ جدا رزم کا میلاں ہے جدا یہ چین اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا

فہم کامل ہو تو ہر نامے کا عنوان ہے جدا مختصر پڑھ کے رلا دینے کا سماں ہے جدا

دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں تو صیف بھی ہو

دل بھی محفوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

انیس "بزم" اور "رزم" کے رمز آتھ تھے۔ بین ویکا کو انھوں نے "مختصر پڑھ کے رلا دینے" تک محدود رکھا۔ "مصائب" اور "رقت" کے ساتھ ساتھ انھیں اس بات کا بطور خاص خیال تھا کہ "دل بھی محفوظ ہوں" جو غزل کا وصف ہے، اور "دبدبہ" بھی ہو "توصیف" بھی ہو اور "تعریف" بھی، جو قصیدے کا منصب ہے۔ انیس نے یہ سب کام مسدس سے لیا۔ اوپر کی بحث سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ انیس جس فصاحت کا دعویٰ کرتے ہیں، یا شبلی اور ان کے بعد آنے والے نقاد انیس کی جس فصاحت کی داد دیتے ہیں، اُس کا گہرا تعلق مسدس کے فارم کو انتہائی فن کاری کے ساتھ برتنے سے بھی ہے، اور غزل اور قصیدے کی شعری روح کو جذب کر کے اس کی تقلیب کرنے سے بھی۔ انیس کی فصاحت فریب نظر کا سامان ضرور فراہم کرتی ہے، لیکن دراصل یہ ویسی فصاحت نہیں جس کا تصور قدما یا متوسطین کے یہاں ملتا ہے۔ انیس نے مرثیے کی فضائیں قصیدے کی روایت سے استفادہ کر کے فصاحت کے مروجہ مفہوم میں نئی وسعت پیدا کی۔ ممکن ہے ایسا غیر شعوری طور پر ہوا ہو، تاہم اس سے یہ بات بھی واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ انیس نے ناسمجت ہی کے بعض اجزا کی تقلیب کر کے ناسمجت سے نکمر لی، اور مرثیے کو ایک نئی خوش آہنگی اور جالیاتی حسن عطا کر کے بالواسطہ طور پر ناسمجت کی شکست میں ایک زبردست تاریخی کردار ادا کیا۔ انیس نے جس طرح بند کے پہلے چار مصرعوں میں قصیدے کے زور بیان اور دبدبے اور بیتوں میں غزل کی لطافت اور نرمی کو باہم مربوط کر کے مرثیے کو جو نیا اسلوبیاتی پیکر دیا، وہ ان کے فن سے مخصوص ہے، اور یہ جزو لاینفک ہے اُس فصاحت کا جس کے قدیم مفہوم کو انھوں نے وسعت دی، اور جس کا اثر بعد کی اردو شاعری پر برابر محسوس ہوتا رہا ہے۔

اُسْلُوبِیَاتِ اِقْبَال

اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام

اقبال کی شاعری اسلوبیاتی مطالعے کے لیے خاصا دلچسپ مواد فراہم کرتی ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اسلوبیات لسانیات کی وہ شاخ ہے جس کا ایک سرا لسانیات سے اور دوسرا سرا ادب سے جڑا ہوا ہے۔ ادب کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ موضوعی اور جمالیاتی چیز ہے جبکہ لسانیات سماجی سائنس ہے، اور ہر سائنس معروضی اور تجرباتی ہوتی ہے۔ ادبی تنقید کا معاملہ دوسرا ہے۔ ادبی تنقید موضوعی بھی ہوتی ہے اور معروضی بھی، اس لیے کہ تنقید کا منصب ادب شناسی ہے، اور ادب شناسی کا عمل خواہ وہ ذوقی اور جمالیاتی ہو یا معنیاتی، حقیقتاً تمام مباحث اُس لسانی اور لفظی پیکر کے حوالے سے پیدا ہوتے ہیں جس سے کسی بھی فن پارے کا بحیثیت فن پارے کے وجود قائم ہوتا ہے۔ اسلوبیات اس موضوع کا معروض ہے، گویا یہ ادبی تنقید کا عملی حربہ ہے۔ اسلوبیات طریقہ کار ہے، کل تنقید نہیں۔ کوئی بھی طریقہ کار کل تنقید نہیں ہو سکتا۔ اسلوبیات اس کا دعویٰ بھی نہیں کرتی۔ یہ دوسرے طریقوں کی نفی بھی نہیں کرتی، چنانچہ اس کو اپنے طور پر بھی برتا جا سکتا ہے اور دوسرے طریقوں سے ملا کر بھی۔ لیکن اسلوبیات کوئی بات بغیر ثبوت کے نہیں کہتی۔ یہ تنقیدی آرا کی صحت یا عدم صحت کے لیے ٹھوس تجرباتی بنیادیں فراہم کرتی ہے، اور اس طرح ادب کے سر بستہ اظہاری رازوں کی گہری کھول سکتی ہے، یا تخلیقی عمل کے بعض پراسرار گوشوں پر روشنی

ڈال سکتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس بارے میں ایسے ثبوت بھی پیش کر سکتی ہے جنہیں رد نہیں کیا جاسکتا۔ اسلوبیات کے بارے میں یہ بات خاطر نشان رہنی چاہیے کہ اسلوبیاتی مطالعے میں رہنما نظر (GUIDING INSIGHT) ادبی اور جمالیاتی ذوق یعنی تنقید ہی سے ملتی ہے لیکن اکثر و بیشتر ایسا بھی ہوتا ہے کہ تجرباتی ذہنی رویے کے دوران ایسے ایسے امور پر نظر پڑتی ہے یا ایسے ایسے نکتے سوجھ جاتے ہیں جن کی مدد سے تنقید کی نئی راہیں سامنے آتی ہیں۔ تنقید اور اسلوبیات میں ادبی ذوق اور سائنسی رویے کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے سے ماہی لین دین جاری رہتا ہے، اور اس طرح اسلوبیات تنقید سے جو کچھ لیتی ہے اس سے کئی گنا کر کے تنقید کو لوٹا دیتی ہے۔

ادب کا رشتہ یوں تو تمام انسانی علوم سے ہے۔ ادب انسانیت کی روح اسی لیے ہے کہ اس میں اسان کی تمام ذہنی کاوشوں کی پرچھائیاں دکھی جاسکتی ہیں اور ہر طرح کے اثرات کا عمل دخل جاری رہتا ہے۔ چنانچہ ادبی تنقید میں جمالیاتی اور ادبی معیاروں کی بنیادی اہمیت کے باوصف مختلف علوم سے مدد لی جاتی رہی ہے، مثلاً فلسفہ، مذہبیات، نفسیات، سیاسیات، عمرانیات وغیرہ سے ادبی تنقید کے مختلف دبستانوں میں مدد لی جاتی ہے، اس بارے میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ لیکن ان علوم اور اسلوبیات میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ ان میں سے کسی کا موضوع براہ راست ادب یا ادب کا وسیلہ اظہار یعنی زبان نہیں ہے، جبکہ اسلوبیات کا موضوع ہی زبان اور اس کا تخلیقی استعمال ہے، یعنی وہ سانی اظہاری سپیکر جس کے ذریعے ادب بطور ادب کے مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے ادبی تنقید میں جو مدد اسلوبیات سے مل سکتی ہے، کسی دوسرے ضابطہ علم سے نہیں مل سکتی، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اسلوبیات ادبی تنقید کا سب سے کارگر حربہ ہے یا یہ کہ اسلوبیات ادبی تنقید کی عملی بنیاد ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

زیر نظر مضمون میں اقبال کی اردو شاعری کے اسلوبیاتی مطالعے کے صرف ایک پہلو یعنی صوتیاتی نظام کو لیا جائے گا۔ اسلوبیاتی مطالعے کی کئی سطحیں اور کئی پہلو ہو سکتے ہیں، مثلاً کوئی بھی فن پارہ اظہاری اکائی کے طور پر وجود میں آتا ہے۔ یہ

اکائی کلموں سے مل کر بنتی ہے جسے اظہار کی نحوی سطح کہہ سکتے ہیں۔ کلمے، لفظوں یا لفظوں کے قلیل ترین حصوں یعنی صرفیوں (MORPHEMES) سے مل کر بنتے ہیں، جنہیں اظہار کی لفظیاتی یا صرفیاتی سطح کہہ سکتے ہیں اور یہ صرفیے بجائے خود اصوات کا مجموعہ ہوتے ہیں جنہیں اظہار کی صوتیاتی سطح کہہ سکتے ہیں۔ اس مضمون میں اظہار کی سب سے بنیادی سطح یعنی صوتیاتی سطح ہی کے بارے میں غور و خوض کیا جائے گا۔

صوت کے ضمن میں یہ بدیہی بات ہے کہ صوت کے معنی نہیں ہوتے۔ معنی کا عمل اس سے اوپری سطح یعنی صرفیاتی سطح سے شروع ہو جاتا ہے اور کلمے کی نحوی سطح سے گزر کر فن پارے کی معنیاتی اکائی کے درجے تک پہنچ کر مکمل ہوتا ہے۔ صوت کی سطح خالص آہنگ کی سطح ہے۔ لیکن اگر اس سے یہ فرض کر لیا جائے کہ آہنگ سے مراد معنی کی کلی نفی ہے تو یہ بھی غلط ہوگا، کیونکہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آہنگ سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے فضا سازی یا سماں بندی میں مدد ملتی ہے اور یہ فضا سازی کسی بھی معنیاتی تاثر کو ہلکا، گہرا یا تیکھا کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اقبال کے ابتدائی دور کی نظم ”ایک شام“ (دریائے نیلر ہائیڈل برگ کے کنارے پر) ملاحظہ ہو:

خاموش ہے چاندنی تیسر کی	شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوافسروش خاموش	کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے	آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسون ہے	نیکر کا خیرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے	یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا	قدرت ہے مراقبے میں گویا

اے دل! تو بھی خموش ہو جا

آغوش میں نعم کو لے کے سو جا

اس نظم کو پڑھتے ہی احساس ہوتا ہے کہ اس میں سناٹے اور تنہائی کی کیفیت بعض خاص خاص آوازوں کی تکرار سے بھی ابھاری گئی ہے۔ بادی النظر ہی میں معلوم

ہوجاتا ہے کہ یہ آوازیں س، ش، خ اور ف کی ہیں جو سات شعروں کی اس مختصر سی نظم میں ۳۵ بار آتی ہیں۔ کسی فن پارے میں خاص خاص آوازوں کا بغیر کسی شعوری اہتمام کے درآنا اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر میر تقی میر کی غزل:

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے

یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

یا غالب کی غزل:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

میں صوتیاتی سطح پر آخر ایسی کون سی بات ہے کہ یہ غزلیں گلوکاروں میں ہمیشہ بے حد مقبول رہی ہیں، اور بعض نے تو ان کے ذریعے اپنی آواز کا ایسا جادو جگایا ہے کہ باید و شاید۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان غزلوں میں طویل مصوتوں اور غنائی مصوتوں کے در و بست سے موسیقی کا ایسا امکان ہاتھ آگیا ہے جو عام طور پر میسر نہیں آتا ایسی مثالیں تقریباً ہر بڑے شاعر کے یہاں مل جائیں گی، لیکن ان کی بنا پر کسی شاعر کے پورے صوتیاتی نظام کے بارے میں حکم نہیں لگایا جاسکتا، صوتیاتی آہنگ کا تعلق بہت کچھ شاعر کی افتادِ طبع اور اس کے شعری مزاج سے ہے جس کی تشکیل بڑی حد تک غیر شعوری طور پر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر میر کی درد و سوز میں ڈوبی ہوئی نرم لے، درد مندی اور گھلتے رہنے کی کیفیت ان آوازوں سے متعلق نہیں ہوسکتی جن کے ذریعے غالب اپنی معنی آفرینی، فکری تہداری یا نفسیاتی ژرف بینی یا اسرارِ ازل کی گرہ کشائی کا جادو جگاتے ہیں۔ اسی طرح اقبال کا فردیت پر اصرار، عمل کی گرم جوشی، جرأت مندی، آفاق کی وسعتوں میں پرواز کا حوصلہ اور بے پایاں تحریک بھی ایک ایسے صوتیاتی نظام کا تقاضا کرتا ہے جو اس کی معنیاتی فضا سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ اس نظام کی اہمیت اس میں ہے کہ اگر اس میں باطنی ارتباط نہ ہو تو شاعری کی ساری معنیاتی فضا درہم برہم ہوجائے، اور وہ رنگ نہ بن سکے جسے شاعر کی آواز یا اس کے شعری مزاج سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال کے بارے

میں یہ بات عام طور پر محسوس کی جاتی ہے کہ ان کی آواز میں ایک ایسا جادو، ایسی کشش اور نغمگی ہے جو پوری اردو شاعری میں کہیں اور نہیں ملتی۔ ان کے لہجے میں ایسا شکوہ، توانائی، بے پایانی اور گونج کی ایسی کیفیت ہے جیسے کوئی چیز گنبدِ افلاک میں ابھرتی اور پھیلتی ہوتی جلی جائے۔ اس میں دل نشینی اور دلآویزی کے ساتھ ساتھ ایک ایسی برش، روانی، تندی اور چستی ہے جیسے سرود کے کسے ہوتے تاروں سے کوئی نغمہ پھوٹ بہا ہو یا کوئی پہاڑی چشمہ ابل رہا ہو۔ آخر اس فطری نغمگی کا صوتیاتی راز کیا ہے یا اس کا تعلق کن خاص آوازوں سے ہے۔ یہ راز اگر ہاتھ آجائے تو اس سے اقبال کے پورے صوتیاتی نظام کی گرہ کھل سکتی ہے، لیکن اس کوشش میں :

شکستی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی کمتی پریت میں ہے

یا

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہیتا ہے

یا ”پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن“ کے آخری اشعار میں من کی دنیا، تن کی دنیا اور دھن دولت کی دھوپ چھاؤں والے اسلوب کو نظر انداز کرنا ہوگا کیونکہ یہ اقبال کے شعری اسلوب کا ایک رُخ یا ایک پہلو تو ہے، کل اسلوب نہیں۔ چنانچہ پوری شاعری کے صوتیاتی مزاج کے تجزیے کے لیے اقبال کے اس کلام کو سامنے رکھنا چاہیے جس سے اقبال کے شعری مزاج کی پہچان ہوتی ہے یا پھر پورے کلام کا تجزیہ مختلف جگہوں سے یوں کرنا چاہیے کہ اس کی صوتیاتی روح تک ہماری رسائی ہو سکے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر سب سے پہلے اقبال کی بعض شاہکار نظموں مثلاً مسجدِ قرطبہ، ذوق و شوق اور خضرِ راہ کو لیا جائے، اور دیکھا جائے کہ کیا صوتیاتی سطح پر ان میں کوئی چیز قدرِ مشترک کا درجہ رکھتی ہے :

سلسلہ روز و شب، نقشِ گرِ حادثات
سلسلہ روز و شب، اصل حیاتِ دمات

سلسلہ روز و شب، تارِ حریرِ دو رنگ
 جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبلے صفات
 سلسلہ روز و شب، سازِ ازل کی فغاں
 جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بزمِ کمکات
 تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
 سلسلہ روز و شب، صیسنی کائنات
 تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
 موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات
 تیرے شب و روز کی اور حقیقت کیا ہے
 ایک زمانے کی رو، جس میں نہ دن ہے نہ رات!
 آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
 کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات!
 اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
 نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

اس بند کی وہ یک نوعی آوازیں جو ذہن میں ایک چمک سی پیدا کرتی ہیں اور

دیر پا اثر چھوڑتی ہیں درج ذیل ہیں:

س	ل	س	ل	ر	ز	ش	ش	ح	ث
س	ل	س	ل	ر	ز	ش	ص	ل	ح
س	ل	س	ل	ر	ز	ش	ر	ح	ر
س	س	ہ	ذ	ز			ص	ف	
س	ل	س	ل	ر	ز	ش	س	ر	ز
س	س	ہ	ذ	ز			ر		
		ر		ہ			ر	ہ	

س	ل	س	ل	ر	ز	ش	ص	ر	ف
ہ	ر	ر	ہ	ر	ہ	ر	ر	ر	
ہ	ر	ر	ہ	ر	ہ	ر	ر	ر	
ش	ر	ز	ر	ح	ہ				
ز	ر	س	ہ	ر	ہ				
ف	ز		ہ	ہ					
ر	ہ	ث	ر	ہ	ث				
خ	ر	ف	ظ	ر	ف				
ش	ہ	ہ	ز	ل	خ	ر	ف		

= گُل ۱۱۸ بار

ادپر کے گوشوارے سے ظاہر ہے کہ ان میں زیادہ تر صفیری آوازیں ہیں یعنی ف س ش ز
 خ ہ۔ (ث ص ذ ص ظ یا ح کی آوازیں وہی ہیں جو س، زیادہ کی ہیں جو سب صفیری ہیں،
 ان کے علاوہ دونوں مصوتی مصمتوں یعنی ل اور ر کو بھی اس میں لے لیا گیا ہے کیونکہ یہ
 سب کے سب VOCALIC یعنی مصوتی مصمتے یا مسلسل مصمتے کہلاتے ہیں، اس لیے کہ ان
 میں مصوتوں کی طرح تسلسل کی اور جاری رہنے اور پھیلنے کی کیفیت ہے۔ اس بند میں
 اگرچہ بندشی آوازوں میں سے ت کی تکرار قافیے کی وجہ سے ہوتی ہے اور ب اور ک کا
 نیزم اور ن کا بھی استعمال ملتا ہے، لیکن ان آوازوں کی تکرار اس پیمانے پر نہیں جس
 پیمانے پر صفیری یا مسلسل آوازوں کی تکرار ملتی ہے۔ بندشی آوازیں ہوا کی بندش سے پیدا
 ہوتی ہیں۔ ان کے مقابلے پر صفیری اور مسلسل آوازوں میں فرادانی اور بے کرانی کا تاثر
 پیدا کرنے کی کہیں زیادہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ ضروری
 ہے کہ اردو مصمتوں میں بندشی آوازوں کی تعداد نصف سے بھی زیادہ ہے۔ ان میں
 سے آدھے مصمتے سادہ ہیں اور آدھے ہکار۔ سادہ آوازیں اکثر زبانوں میں ملتی ہیں اور
 بڑی حد تک مشترک ہیں۔ لیکن اردو کا امتیاز ہکار اور معکوسی آوازوں سے پیدا ہوتا ہے

جو تعداد میں چودہ ہیں اور ان کے مقابلے میں صفیری اور مسلسل آوازیں تعداد میں صرف نو ہیں۔ اب اس روشنی میں اقبال کے یہاں یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اوپر کے سولہ مصرعوں میں ہرکار آوازیں صرف پانچ بار آئی ہیں جبکہ صفیری اور مسلسل آوازیں ایک سو اٹھارہ بار استعمال ہوئی ہیں! گویا ہرکار آوازوں کا چلن نہ ہونے کے برابر ہے، اور وہ بھی صرف دو شعروں میں :

ع جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و کم ملکات

ع تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ

یعنی ہرکار آوازیں وہیں آئی ہیں جہاں ان کا استعمال ناگزیر تھا یعنی ضمیر میں یا فعل میں۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ اردو کے افعال و ضمائر کا ڈھانچا سرتا سر زمینی ہے۔ اس بند کے نتائج پر یہ سوال بہر حال قائم کیا جاسکتا ہے کہ ہمیں اس بند میں ان آوازوں کا وقوع کسی خاص وجہ سے تو نہیں، یا یہ محض اتفاقی تو نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمیں دھوکا ہو رہا ہو اور اقبال کے کلی صوتیاتی آہنگ سے ان نتائج کا کوئی بڑا تعلق نہ ہو۔ اس کا جواب دینے سے پہلے نظم کے دوسرے بندوں کے نتائج معلوم کر لینے چاہئیں :

بند	صفیری و مسلسل آوازیں	ہرکار و معکوسی آوازیں
پہلا بند	۱۱۸	۵
دوسرا بند	۱۰۹	۲
تیسرا بند	۱۶۸	۳
چوتھا بند	۱۲۳	۴
پانچواں بند	۱۱۲	۳
چھٹا بند	۱۲۳	۷
ساتواں بند	۱۱۶	۹

صفیری آوازوں کے استعمال کی یہ صوتیاتی لے آخری بند تک میں ملتی ہے۔ یہاں ان اشارے کے پیش کرنے سے مراد یہی ہے کہ مصرعوں کو پڑھتے ہوئے ان آوازوں پر نظر رکھی

جائے جو اس نظم کے صوتیاتی آہنگ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں اور جن کے در و بست نے اس نظم کو معنیاتی اور صوتیاتی ہم آہنگی کا عجیب و غریب مرقع بنا دیا ہے ذیل کے بند میں صفیری آوازیں ۱۱۳ بار اور ہکار آوازیں صرف ۶ بار آتی ہیں :

دادی کہسار میں غسرقِ شفق ہے سحاب
 لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب !
 سادہ و پُر سوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
 کشتیِ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب !
 آپ روانِ کبیر ! تیسرے کنارے کوئی
 دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
 عالمِ نو ہے ابھی پردہٴ تفتیر میں
 میری زنگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب
 پردہ اٹھا دوں اگر چہرہٴ افکار سے
 لانا کے گا فرنگِ میری نواؤں کی تاب
 جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
 روحِ امم کی حیاتِ کٹکٹش انقلاب !
 صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
 کرتی ہے جو ہرناں اپنے عمل کا حساب

نقش ہیں سب ناتمام انوں ہجر کے بغیر نغمہ ہے سوداے حام، خونِ جگر کے بغیر !

(۶:۱۱۳)

اس پوری نظم کا صوتیاتی تناسب حسب ذیل ہے :

ہکار و معکوس آوازیں

صفیری و مسلسل آوازیں

تعداد اشعار

۳۹

۹۳۱

۶۱۷

گویا صغیری اور مسلسل آوازیں جو اردو میں ہرکار و معکوس آوازوں سے تعداد میں خاصی کم ہیں (۹: ۱۴) اقبال کے یہاں بین گنا سے بھی زیادہ استعمال ہوئی ہیں۔ اس تجزیے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ صغیری اور مسلسل آوازوں کی کثرت اور ہرکار و معکوسی آوازوں کا انتہائی قلیل استعمال ہی شاید وہ کلید ہے جس سے اقبال کے نہاں خانہ آہنگ تک رسائی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اب اقبال کی بعض دوسری شاہکار نظموں پر بھی نظر ڈالنی ضروری ہے۔ ذوق و شوق کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں:

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمہ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں!
حسن ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردہ وجود
دل کے لیے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں!
سُرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب!
کوہِ اضم کو دے گیا رنگِ برنگِ طلساں!
گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دھل گئے
ریگِ نواج کا ظمِ نرم ہے مثلِ پرنیاں!
آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طنابِ ادھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں!

آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی
ان اشعار سے بھی اسی بات کی توثیق ہوتی ہے جو پہلے کہی جا چکی ہے۔ ہرکار آوازیں صرف
وہیں آتی ہیں جہاں فعل کی مجبوری ہے یا ایسے حروف میں جو اردو کی بنیادی لفظیات کا
حصہ ہیں اور جن سے مفرد نہیں۔ اس نظم کے باقی حصوں سے بھی اس مفروضے کی تصدیق
ہو جاتی ہے جس کا ذکر ہم پہلے سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔

ذوق و شوق

ہیکار و معکوسی

۲۳

صفری و مسلسل

۲۵۱

تعداد اشعار

۳۰

یہ دونوں نظمیں بال جبریل سے تھیں۔ نامناسب نہ ہوگا اگر پہلے مجموعے بانگ درا سے خضر راہ کو بھی دیکھ لیا جائے جو ان نظموں سے بارہ تیرہ سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس کا آغاز شاعر اور خضر کے مکالمے سے ہوتا ہے جس کے بعد مختلف عنوانات قائم کر دیے گئے ہیں۔ پہلے ایک بند پر نظر ڈال لی جائے۔ اس کے بعد پورا تجزیہ پیش کیا جائے گا:

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محو نظر

گوشہ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر

تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب !

جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار

موجِ مضطرب تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب !

رات کے افسوں سے طائرِ آشیانوں میں اسیر

انجم کم صنو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب !

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیمانِ خضر

جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویاے اسرارِ ازل

چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب !

دل میں یہ سن کر بپا ہنگامہ محشر ہوا میں شہیدِ جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

حضرتِ راہ

تعداد اشعار	صفری و مسلسل	ہرکار و معکوسی
۸۵	۱۲۱۵	۸۷

اقبال کی دوسری مشہور نظموں میں ”طلوعِ اسلام“، ”لینن خدا کے حضور میں“، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ“ اور ”شعاعِ امید“ میں بھی یہی کیفیت ملتی ہے۔ حضرتِ راہ، مسجدِ قرطبہ اور ذوق و شوق کی طرح طلوعِ اسلام بھی ترکیبِ بند ہے۔ لینن خدا کے حضور میں مسلسل اور شعاعِ امید اور ابلیس کی مجلسِ شوریٰ بندوں میں منقسم نظمیں ہیں۔ ”ساتی نامہ“ البتہ مثنوی ہے جس میں مصرعوں کے ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے افعال کا استعمال بڑھ گیا ہے، جس سے ہرکار و معکوسی آوازوں کی تعداد پر بھی اثر پڑا ہے۔ اگرچہ یہ پوری مثنوی کی کیفیت نہیں ہے، تاہم ہرکار و معکوسی آوازیں کہیں قافیہ ردیف کی مجبوری کی وجہ سے تو کہیں بیان کی روانی کو برقرار رکھنے کے لیے در آئی ہیں۔ یوں بھی ”پھر“، ”بھی“، ”مجھ“، ”کچھ“، ”تھا“، ”تھی“ بنیادی لفظوں کا استعمال مسلسل کلموں میں ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ آوازیں اقبال کے یہاں غزل کے شعروں میں بھی کہیں کہیں ناگزیر طور پر وارد ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کے مصرعے ملاحظہ ہوں :

گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں	ع
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ بحرِ فیضی	ع
بُرا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اُسے	ع
تو آججو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں	ع
خودی میں ڈوبتے ہیں پھر اُبھر بھی آتے ہیں	ع
خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں	ع
اٹھا میں مدد سے و خانقاہ سے نمناک	ع
تری نگاہ فردِ مایہ ہاتھ ہے کوتاہ	ع

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا	۶
خدا بندے سے خود پوچھے بات تیری رضا کیا ہے	۶
جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی	۶
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد	۶
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی	۶
مسائلِ نظری میں الجھ گیا ہے خطیب	۶

اقبال کے یہاں ہنکار اور معکوسی آوازوں کے قلیل استعمال کی خصوصیت کو ذہن نشین کرنے کے لیے اقبال کا تقابل کسی ایسے شاعر سے کرنا ضروری ہے جس کا پیرایہ بیان بول چال کی زبان سے قریب ہو اور جس کے یہاں ہنکار اور معکوسی آوازوں کا استعمال فطری طور پر ہوا ہو۔ اس سے یہ اندازہ بھی کیا جاسکے گا کہ اردو میں ان آوازوں کے فطری استعمال کا اوسط کیا ہے اور کیا اقبال کے یہاں اس سے واقعی کوئی انحراف ملتا ہے۔ اس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ ہمارے بڑے شاعروں میں بول چال کی زبان سے قریب ہونے کا شرف میر تقی میر کو حاصل ہے۔ ان کے یہاں سینکڑوں غزلیں ایسی ہیں جن کے ردیف و توانی میں بھی ہنکار و معکوسی آوازیں آزادانہ استعمال ہوتی ہیں :

ہم تو اک آدھ گھڑی اٹھ کے جدا بیٹھیں گے ... کھا بیٹھیں گے، چھپا بیٹھیں گے
 میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ ... سمجھا کچھ، ٹھہرا کچھ
 بود نقش و نگار سا ہے کچھ ... اعتبار سا ہے کچھ، پیار سا ہے کچھ
 موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا ... دفتر نکلا
 خوش وہ کہ اٹھ گئے ہیں داماں جھٹک جھٹک کر ... کھٹک کھٹک کر، ٹٹک ٹٹک کر
 دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا ... کوٹا گیا، چھوٹا گیا
 بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا ... توڑا، تھوڑا
 میر کے یہاں ایسی غزلیں بھی ہیں جو ٹپریاٹ پر ختم ہوتی ہیں :
 آٹوب دیکھ چشم تری سر رہے ہیں جوڑ ... موڑ موڑ، پھوڑ پھوڑ

ہوا ہے خواب سونا آہ اس کروٹ سے اس کروٹ ... لٹ لٹ ، کھٹ کھٹ
 دل لین ہیں یوں کہ ہرگز ہوتی نہیں ہے آہٹ ... نٹ کھٹ ، جگھٹ
 لیکن اگر صرف ایسی غزلوں کو سامنے رکھا جائے تو نتائج مبالغہ آمیز نکلیں گے۔ کیونکہ
 اول تو قافیے اور ردیف میں آوازوں کے استعمال کے شعوری ہونے کا امکان ہوتا ہے ،
 دوسرے یہ کہ ایک بار جب ایسی آوازیں مطلع کے قافیے ردیف میں آئیں تو باقی اشعار
 میں ان کا التزام واجب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اگر صرف ایسی غزلوں کا تجزیہ کیا جائے تو میر
 کے کلام میں ان آوازوں کے تناسب کی نہایت مبالغہ آمیز تصویر سامنے آئے گی۔ بہتر یہ
 ہے کہ بعض دوسری غزلوں کو لیا جائے اور ہکار و معکوسی آوازوں کے استعمال کو ردیف
 و قافیے سے ہٹ کر دیکھا جائے :

تعداد اشعار	ہکار و معکوسی آوازیں
۱۵	۲۴
۹	۱۴
۹	۲۷
<u>۳۳</u>	<u>۶۵</u>

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میر کے یہاں ہکار و معکوسی آوازوں کا تناسب تقریباً دو
 آوازیں شعر ہے۔ پورے کلیات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ تناسب کچھ زیادہ ہی نکلے گا، اس سے
 کم ہرگز نہیں۔ اس سلسلے میں کلام غالب کو دیکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، اختصار کی
 خاطر ہم نے غالب کی غزلوں کے اتفاقی تجزیے پر اکتفا کیا جس کی تفصیل حاشیے میں درج ہے

لہ دیوان غالب طبع برلن	تعداد اشعار	ہکار و معکوسی آوازیں
ص ۳۱	۱۳	۲۱
۵۳	۱۱	۱۱
۶۵	۵	۵
۱۰۱	۱۴	۱۴
۱۲۳	۱۴	۱۴
۱۶۱	۱۵	۱۵
۲۰۱	۶	۶
	<u>۸۹</u>	<u>۸۹</u>

اس تجزیے سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ غالب کے اکیانوںے اشعار میں معکوسی اور ہرکار آوازیں نواسی بار آئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غالب کے یہاں بھی جنہیں اپنے گفتہ فارسی اور مستعار "نقش ہائے رنگ رنگ" پر ناز تھا، ان آوازوں کے استعمال کا تناسب تقریباً ایک آوازی شعر ہے۔ میر اور غالب کے اس تناظر میں دیکھیے تو ان آوازوں کے استعمال کے سلسلے میں اقبال کی صوتی انفرادیت کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے:

میر : ہرکار و معکوسی آوازیں فی شعر ۳

غالب : ہرکار و معکوسی آوازیں فی شعر ۱

اقبال : ہرکار و معکوسی آوازیں فی شعر ایک سے کم

ان نتائج سے ظاہر ہے کہ میر جن کے ہاں ہرکار و معکوسی آوازوں کا استعمال تقریباً فطری ہے، ان کی بہ نسبت غالب کے یہاں ان آوازوں کا استعمال آدھا اور اقبال کے یہاں سب سے کم ہے۔ ان نتائج کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاید اقبال کے یہاں ہرکار و معکوسی آوازوں کے استعمال کا تناسب اردو شاعری میں سب سے قلیل ہے۔ اب اس کو صیفری و مسلسل آوازوں کے استعمال سے ملا کر دیکھیے تو حیرت ہوتی ہے کہ عربی فارسی لفظیات کا ذخیرہ جو اقبال کا سرمایہ امتیاز ہے، وہی غالب کے لیے بھی وجہ افتخار تھا، لیکن مشترک سرچشمہ لفظیات کے باوصف دونوں کے یہاں اس کے پہلو بہ پہلو ہرکار و معکوسی آوازوں کے استعمال کی کیفیت میں خاصا فرق ہے۔

غالب کے صوتی آہنگ کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر مسعود حسین نے ان کے یہاں صیفری آوازوں کے استعمال پر بجا طور پر زور دیا ہے۔ ان کا بیان ہے "ان (غالب) کی فارسی گوئی اور فارسی دانی کا اثر ان کے ریختے پر بھی نمایاں ہے۔ اردو شعر کی زبان کو انہوں نے ذوق کی محاورہ بندی سے نکال کر عجیبی لالہ زاروں میں لاکھڑا کیا"۔

۱۔ مسعود حسین خاں "غالب کے اردو کلام کا صوتی آہنگ" مشمولہ بین الاقوامی غالب سیمینار

غالب اور اقبال میں یہ خصوصیت مشترک ہے۔ اقبال کے رموز و علامت میں بڑی تعداد ایسے الفاظ کی ہے جن میں صفیری اور مسلسل آوازیں نمایاں طور پر استعمال ہوتی ہیں، یا پھر ایسی آوازیں آتی ہیں جو منہ کے اگلے حصوں سے ادا ہوتی ہیں :

شاہن مشرق شمع و شاعر شعاع روشنی شفق شعلہ فقر
فرشتے فرمان فقیہہ خودی و خدا عقل و عشق ارض و سما ذوق و شوق
زمان و مکاں سوز و ساز درد و داغ جستجو و آرزو شہید و جستجو شکرو
شکایت تسلیم و رضا اہلیں و آدم نیان و صدف زلیت مسجد ملا
مدرسہ صوفی خانقاہ کلیسا مرد مومن شمشیر و سنان طاؤس و باب
زرگس نالہ بلبل لالہ صحرا چراغ لالہ

اس خصوصیت کی توثیق ان لفظوں سے بھی ہوتی ہے جہاں اقبال کئی لفظوں کے معنوی سیٹ میں ایک کا انتخاب کرتے ہیں، مثلاً وہ شہباز اور عقاب پر شاہین کو ترجیح دیتے ہیں، یا جنت، بہشت اور فردوس میں سے فردوس کا زیادہ استعمال کرتے ہیں، یا شمس، خورشید اور آفتاب میں سے وہ زیادہ آفتاب کے حق میں ہیں۔ (اگرچہ اس انتخاب میں طویل مصوتوں اور غنائی مصوتوں کا بھی ہاتھ ہے جس کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا)۔ یہاں اس بات کی وضاحت مقصود ہے کہ صفیری و مسلسل آوازوں کا استعمال تو غالب کے یہاں بھی کثرت سے ہوا ہے، لیکن اقبال کی لئے حرکی اور رجائی ہے جبکہ غالب کا تفکر حزنیہ ہے اور اس میں الم ناکی کی کیفیت ہے۔ اس کیفیت کے اظہار میں منہ کے اگلے حصوں سے ادا ہونے والی آوازوں کے بجائے منہ کے پچھلے حصوں سے ادا ہونے والی آوازوں یا مسموع آوازوں سے مدد ملی ہے، مثلاً ذیل کے اجزائے کلام غالب کے پسندیدہ الفاظ ہیں اور ان میں گ، ج، د، غ، ب اور م کی جو نمایاں حیثیت ہے وہ ظاہر ہے :

دل و جگر زخم جگر جگر داری کا دعویٰ دعوتِ مرگیاں نگاہ بے محابا

بت بیدادگر ستم گر جاں غم گسار غارت گر جنس وفا دردِ چراغِ محفل

داغِ دل دردِ بے دوا مرگِ تمنا رگِ جاں رگِ سنگ سنگِ گراں

بوئے گل گل نغمہ موج محیط بے خودی سیلاب گریہ سیلاب بلا حلقہ گرداب
 بند غم ساغرے خانہ نیرنگ رنجِ نوسیدی جاوید تغافل ہٹے ساقی عم آدارگی
 ہٹے صبا

غالب اور اقبال کے صوتیاتی آہنگ کا بنیادی فرق مصوتوں سے زیادہ مصوتوں کے استعمال میں کھلتا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین نے صحیح اشارہ کیا ہے ”غالب کا کمال لفظ اور ترکیب میں ظاہر ہوتا ہے صوتی آہنگ میں نہیں۔ وہ لفظ کی تہ داری اور ترکیب کی پہلوداری سے اکثر اوقات صوتی آہنگ کی کمی کو چھپالے جاتے ہیں۔“ اقبال کے یہاں یہ کیفیت نہیں۔ ان کے یہاں صوتی آہنگ کی کمی کا احساس قطعاً نہیں ہوتا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ ان کے اشعار کو کہیں سے پڑھیے، ان میں عجیب و غریب نغمگی کا احساس ہوگا، گویا لفظوں میں موسیقی سموی ہوتی ہے۔ آخر غالب کے صوتی آہنگ کی وہ کون سی کمی ہے جو اقبال کی آواز تک پہنچ کر دور ہو گئی ہے۔ اتنی بات معلوم ہے کہ غالب کا فن معنی آفرینی کا رمزیہ فن ہے۔ ان کا فنی سانچا غزل کا شعر یعنی دو مصرعوں کی محض ذرا سی زمین ہے جس میں وہ جہان معنی آباد کر دیتے ہیں۔ اگرچہ اقبال کی شاعری بھی رمزیہ امکانات رکھتی ہے لیکن ترغیبِ عمل کی پیغامی شاعری ہونے کی وجہ سے اس کے فنی سانچے وسیع ہیں۔ اقبال کی اکثر غزلوں میں بھی نظموں کے تسلسل کا لطف ہے۔ غالب کے یہاں رمزیہ فنی روئیے کی وجہ سے نحوی ڈھانچے میں خاصی تخفیف ہو گئی ہے اور افعال تو خاصے نچڑ کر سامنے آتے ہیں۔ اس اختصار و تخفیف کا منفی اثر خاص طور پر طویل مصوتوں اور غنائی مصوتوں پر ہوا ہے۔ اقبال کے یہاں اظہاری وسعت اور ربطِ بیان کی وجہ سے اکثر فعل اور کلمے کے دیگر لوازم بغیر تخفیف کے نظم ہوتے ہیں، اور ان کی وجہ سے طویل مصوتوں کی فرادانی پیدا ہو گئی ہے۔ مثال کے طور پر کلیاتِ اقبال سے ایک اتفاقی تجزیے کے بیس اشعار میں طویل یا غنائی مصوتے ۳۳۶ بار آئے ہیں۔

۱۴ مسعود حسین خاں ”غالب کے اردو کلام کا صوتی آہنگ“ مشمولہ بین الاقوامی غالب

گویا غالب کے یہاں طویل مصوتوں کے وقوع کا امکان گیارہ سے بارہ طویل مصوتے فی شعر سے زیادہ کا نہیں۔ غالب کی جس کم آہنگی کا ذکر پروفیسر مسعود حسین نے کیا ہے، عین ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ طویل مصوتوں کی کفایت ہو۔ لیکن ابھی اس بارے میں پوری تصویر سامنے نہیں آئی۔ غالب کے یہاں طویل مصوتوں کی کفایت اور اقبال کے یہاں ان کی فراوانی کا پورا اندازہ اسی وقت لگایا جاسکتا ہے جب اس بارے میں میر کا اوسط بھی سامنے ہو :

۲۸۲	:	طویل مصوتے	۱۵	:	اشعار	۰۰	:	لٹی ہو گئیں سب تدبیریں
۱۰۱	:	" "	۹	:	" "	۰۰	:	کچھ کرو فکر
۱۴۰	:	" "	۹	:	" "	۰۰	:	سختیاں کھینچیں سو کھینچیں
<u>۵۲۳</u>			<u>۳۳</u>					

اوسط فی شعر ۱۶

اب ان تینوں شاعروں کے یہاں طویل مصوتوں کے استعمال کی جو تصویر مرتب

ہوتی ہے وہ یوں ہے :

۱۶	:	طویل مصوتے فی شعر	میر
۱۱	:	" "	غالب
۱۶	:	" "	اقبال

اس تقابلی تجزیے سے یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ طویل مصوتوں کے معاملے میں اقبال غالب سے خاصے آگے ہیں اور میر کے ہم پلہ ہیں۔ اتنی بات واضح ہے کہ جہاں طویل مصوتوں کی فراوانی ہوگی، غنائی مصوتوں کی کثرت بھی وہیں ہوگی، کیونکہ اردو کا ایک عام رجحان ہے کہ غنیت صرف طویل مصوتوں ہی کے ساتھ وارد ہوتی ہے۔ نغمگی کے لیے طویل مصوتوں کے ساتھ ساتھ غنائی مصوتوں کی جواہریت ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ اقبال کا کمال جس نے ان کے صوتیاتی آہنگ کو اردو شعریات کا عجوبہ بنا دیا ہے

در اصل یہ ہے کہ طویل و غنائی مصوتوں کی زمینی کیفیات اقبال کے یہاں زنائے دار صفیری و سلسلہ دار "مسل" آوازوں کی آسانی کیفیات کے ساتھ مربوط و ممزوج ہو کر سامنے آتی ہیں۔ اقبال کے یہاں صفیری و مسل آوازوں اور طویل و غنائی مصوتوں کا یہ ربط و امتزاج ایک ایسی صوتیاتی سطح پیش کرتا ہے جس کی دوسری نظیر اردو میں نہیں ملتی۔ اصوات کی اس خوش امتزاجی نے اقبال کے صوتیاتی آہنگ کو ایسی دلآویزی، توانائی، شکوہ اور آفاق میں سلسلہ در سلسلہ پھیلنے والی ایسی گونج عطا کی ہے جو اپنے تحرک و تموج اور امنگ و ولولے کے اعتبار سے بجا طور پر یزداں گیر کہی جاسکتی ہے۔

(۱۹۷۷)

اسلوبیاتِ اقبال

نظریہ اسمیت اور فعلیت کی روشنی میں

صرفیاتی و نحویاتی نظام

اقبال کے صوتیاتی نظام کا مطالعہ ہم اس سے پہلے پیش کر چکے ہیں۔ اقبال کے صرفی و نحوی امتیازات بھی اتنے ہی اہم ہیں، اور شعرِ اقبال کے اسلوبیاتی مطالعہ کا ضروری حصہ ہیں۔ ذیل کے مضمون میں اقبال کے صرفی و نحوی امتیازات کے صرف ایک پہلو یعنی اسمیت NOMINALIZATION اور فعلیت VERBALISATION کو لیا جائے گا۔ صرفیات MORPHOLOGY اور نحویات SYNTAX میں یوں تو ہر اس چیز کی اہمیت ہے جس سے صاحبِ تخلیق کا اختصاص ثابت ہو، لیکن اسم اور فعل کی مرکزیت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ الفاظ کی دو سب سے بڑی شقیں اسم اور فعل ہی ہیں۔ افلاطون اور ارسطو نے تو اصل اجزائے کلام مانا ہی اسم اور فعل کو ہے، اور اس حد تک کہ بعد میں پلوٹارچ کو اس کا دفاع پیش کرنا پڑا۔ ہمارے بڑے فنکار اپنے تخلیقی سفر میں لفظیات کی ان شقوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ترجیحات کیسے قائم کرتے ہیں، اور ان کے جہانِ معنی سے ان کا کیا تعلق ہے، یہ خاصے دلچسپ سوال ہیں۔ میں اقبال کے بارے میں اکثر سوچتا رہا کہ ان کا اسلوب شعر اسمیت کا ساتھ دیتا ہے یا فعلیت کا۔ بظاہر ان کی لے مجازی ہے۔ وہ نطقِ اعرابی اور شکوہ ترکمانی کے قائل بھی معلوم ہوتے ہیں۔ ہماری لفظیات کا وہ تمام حصہ جو عربی فارسی سے مستعار ہے، وہ اسم اور تعلیقاتِ اسم ہی سے متعلق ہے۔ اس سے یہ توقع ہوتی ہے کہ

اقبال کے یہاں اسمیت کا پلہ بھاری ہوگا۔ بخلاف اسم کے ہمارے فعل پر عربی فارسی کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے، یعنی ہمارا فعل ننانوے فی صد یا شاید اس سے بھی زیادہ پر اکرتی ہے یعنی آریائی ذخیرے سے آیا ہے۔ اقبال کے یہاں ملتِ اسلامی کی شیرازہ بندی کی جو تڑپ ملتی ہے، جس طرح وہ اپنی نواے شوق سے حریمِ ذات اور گنبدِ افلاک میں غلغلہ برپا کرنا چاہتے ہیں، یا جس طرح ان کی ہمتِ مردانہ یزداں پر کند ڈالتی ہے، اور کارِ جہاں کی درازی کے باعث ذاتِ باری کو منتظر چاہتی ہے۔ یا جس طرح وہ عروجِ آدمِ خاک کی بشارت دیتے ہیں، اور سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو کو منتہا قرار دیتے ہیں یا ان کی فکر کو غزالی اور ابنِ عربی سے جو نسبت ہے، یا وہ میخانہٴ شیراز کا ذکر جس ذوق و شوق سے کرتے ہیں، یا ما از پئے سنائی و عطارِ آدمیم پر فخر کرتے ہیں، یا وہ جس طرح پیرِ رومی و حافظِ شیرازی سے کسبِ فیض کرتے ہیں، اور اس سبکے ساتھ ساتھ ان کے یہاں جلال و طنطنے، حرکت و حرارت، قوت و شوکت اور ولولہٴ حیات کی جو کیفیت ملتی ہے، اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کے شعری اسلوب میں اسمیت NOMINALIZATION کا وفور ہوگا، اور ان کے یہاں صرفی و نحوی استعمال کا جھکاؤ اسمیت کی طرف ہوگا ہمارے اس تاثر کو مزید تقویت ملتی ہے اقبال کے اس طرح کے اشعار سے :

سلسلہ روز و شب، نقشِ گرِ حادثات
 سلسلہ روز و شب، اصلِ حیات و مہمات
 سلسلہ روز و شب، تارِ حریرِ دو رنگ
 جس سے بناتی ہے ذاتِ اپنی قبائے صفات
 سلسلہ روز و شب سازِ ازل کی نغماں
 جس سے دکھاتی ہے ذاتِ زیرِ وجمِ ممکنات
 تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
 سلسلہ روز و شب صیرنی کائنات

تو ہو اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار
 موت ہے تیری برات موت ہے مری برات
 تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
 ایک زمانے کی رو، جس میں نہ دن ہے نہ رات
 آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
 کارِ جہاں بے ثبات کارِ جہاں لے ثبات
 اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
 نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

یا غزل کے یہ چند اشعار دیکھیے :

فقر کے ہیں معجزات آج و سریر و سپاہ
 فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
 علم فقیہہ و حکیم، فقر ہے مسیح و کلیم
 علم ہے جو یائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
 فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر
 فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ

مسجدِ قرطب کے پہلے بند میں اگرچہ یہ محسوس نہیں ہوتا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ افعال کا بڑی حد تک
 حذف ہوا ہے۔ پہلے تینوں مصرعوں

سلسلہ روز و شب، نقشِ گر حادثات
 سلسلہ روز و شب، اصلِ حیات و ممات
 سلسلہ روز و شب، تارِ حریرِ دو رنگ

میں کوئی بھی فعل نہیں ہے، اور جتنے الفاظ ہیں، سب اسم ہی اسم ہیں، SUBSTANTIVES
 یعنی اسم بشمول اسم صفت کے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ مصرعے فارسی صرفی و نحوی مزاج
 کے بھی عین مطابق ہیں، اور انھیں فارسی بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے، لیکن جیسے ہی ہم چونکے

مصرعے پر پہنچے ہیں :

جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

ہم اردو کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں، اور / جس سے بناتی ہے / کے ٹکڑے سے جس کا صرفی NUCLEUS فعل / بناتی / ہے، پہلے کے تینوں مصرعے بھی اردو کے لسانی سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ / سلسلہ روز و شب، نقش گر حادثات / اپنی جگہ اردو کا بھی مکمل کلمہ ہے۔ لیکن فعل کے بغیر کلمہ مکمل نہیں ہوتا، اگرچہ ضروری نہیں کہ فعل کا استعمال ظاہر ہو یعنی فعل ظاہری ساخت SURFACE STRUCTURE میں نہ ہو، مگر داخلی ساخت DEEP STRUCTURE میں تو موجود ہوگا ہی۔

اب دیکھیے :

سلسلہ روز و شب، نقش گر حادثات

سلسلہ روز و شب، اصل حیات و مات

سلسلہ روز و شب، تارِ حریر دو رنگ

میں کس فعل کا حذف ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مصرعے بیان STATEMENT پر مبنی ہیں اور داخلی ساخت DEEP STRUCTURE میں جس فعل کا حذف ہوا ہے وہ فعل ہونا "TO BE" کی شکل "ہے" ہے، یعنی سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات ہے یا سلسلہ روز و شب تارِ حریر دو رنگ ہے وغیرہ۔ اس سے یہ دلچسپ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ / ہے / یا / است / کے حذف کی خصوصیت اردو اور فارسی میں مشترک ہے۔ معاملہ صرف / ہے / تک محدود نہیں ہے "TO BE" بنیادی صیغہ اور زمانہ ہے، جب بنیادی صیغے کی یہ کیفیت ہے تو حذف کا یہ عمل دوسرے صیغوں اور زمانوں پر بھی وارد ہوگا۔ لیکن یہ خصوصیت صرف اردو اور فارسی کی نہیں۔ جرمن اسکالر PETER HARTMANN نے سنسکرت کی اسمیت کا دقیق نظر سے مطالعہ کیا ہے :

(NOMINALE AUSDRUCKSFORMEN IN WISSENSCHAFTLICHEN

SANSKRIT. HEIDELBERG, 1955)

اس کا بیان ہے کہ سنسکرت میں "TO BE" / استی / کی تمام شکلوں کا یعنی تمام

صیغوں کا اور زمانوں کا انخذاں ممکن ہے۔ سنسکرت اور پہلوی یعنی فارسی قدیم بہنیں ہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ خصوصیت ہند ایرانی اور ہند آریائی میں مشترک رہی ہوگی، اور وہیں سے جدید آریائی زبانوں بالخصوص اردو میں آئی ہوگی۔ مسجد قرطبہ کے پہلے بند کے باقی مصرعوں میں بھی فعل کے انخذاں کی تاک جھانک نظر آتی ہے، اور یہ پورے بند کو اسمیت کے رنگ میں رنگے دے رہی ہے۔ سولہ مصرعوں کے اس بند میں / بناتی / کے علاوہ فعل صرف دو جگہ آیا ہے۔ / دکھاتی ہے ذات / یا / تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ / یا پھر امدادی / ہے / ہوں / ہے، ورنہ عام نقشہ فعل کے انخذاں کا ہے :

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات
اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

ان مصرعوں میں کہیں کوئی فعل نہیں۔ یہی حال غزل کے ان اشعار کا بھی ہے جو اوپر پیش کیے گئے، امدادی افعال / ہیں / ہے / کی جھلک تو ہے، اصل فعل کہیں نظر نہیں آتا، نیز ایسے اشعار میں

فقر مقامِ نظر علم مقامِ خبر
فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ

میں صرف حرف "ہیں" کی وجہ سے اردو کا بھرم قائم ہے، ورنہ فعل کے انخذاں کا وہی عالم ہے جو اوپر پیش کیے گئے باقی تمام اشعار میں ملتا ہے۔

اسمیت اور فعلیت کے اس رشتے سے بعض بنیادی سوال ابھرتے ہیں۔ کیا زبان میں اسمیت اور فعلیت دو متبادل چیزیں ہیں؟ یا ان کا فرق محض درجہ استعمال کا فرق ہے؟ نیز یہ کہ کسی بھی متن میں اسما اور افعال میں کیا تناسب ہونا چاہیے؟ یا اس بارے میں ہر زبان اپنا مزاج رکھتی ہے جو اس تناسب پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس کو گھٹاتا بڑھاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس بحث میں اسم سے کیا مراد ہے؟ کیا اسمائے صفت

اور ضما تر کا شمار اسم کے ساتھ نہیں ہوگا۔ نیز کیا پورے کلمہ اسمیہ یعنی سلسلہ روز و شب / یا ساز ازل کی فغاں / کو ایک اسم تسلیم کیا جائے گا، یا تین اسم ؟ اسی طرح فعل سے مراد کیا ہے ؟ یا مصادر و مضارع جو اسما کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں، اسم شمار ہوں گے یا فعل ؟ یا جار ہا ہوگا، چلا جاتا ہوگا، اٹھتے ہی چل پڑا تھا۔ یہ فعلیہ کلمے ایک فعل ہیں یا کئی ؟ نیز فعل امدادی، فعل ناقص اور فعل تام میں بھی تمیز ضروری ہے۔ RULON WELLS نے

اپنے مضمون NOMINAL AND VERBAL STYLE میں ایسے بعض مسائل سے بحث کی ہے اور

بعض دلچسپ نتائج اخذ کیے ہیں۔ وہ شاعر کے لہجے DICTON اور اسلوب STYLE

میں فرق کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر زبان اس بارہ خاص میں شاعر کو انتخاب کا حق دیتی ہے کہ وہ اپنی ترجیحات طے کرے یعنی کسی پہلو کو رد یا کسی کو قبول کرے تو اس سے

اسلوب مرتب ہوتا ہے، ورنہ جو کچھ ہے وہ زبان DICTON ہے، اسلوب نہیں۔ اگرچہ بعض

زبانوں کا جھکاؤ اسمیت کی طرف اور بعض کا فعلیت کی طرف ہوتا ہے، لیکن ایک ہی بات جو

اسمیہ طور پر کہی جاسکتی ہے، اس کو فعلیہ انداز سے بھی کہا جاسکتا ہے اور اس سے اسلوب میں

تنوع پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ موضوع سے اسلوب متاثر ہوتا ہے، لیکن

اسمیت اور فعلیت کے تناظر میں یہ صرف ایک حد تک ہی قابل قبول ہے، ورنہ بعض موضوعات

صرف اسمیہ پیرایے میں ادا ہو سکیں گے اور بعض کا اظہار صرف فعلیہ پیرایے میں ممکن ہوگا

RULON WELLS اس بارے میں موضوع کی جبریت کا بالکل قائل نہیں۔ اس کا کہنا ہے :

"MERE VARIATION OF STYLE IS MADE NOT TO ALTER THE SUBSTANCE

OR CONTENT OF WHAT IS EXPRESSED BUT ONLY THE WAY OF

EXPRESSING IT; UNDERLYING THE VERY NOTION OF STYLE IS A

POSTULATE OF INDEPENDENCE OF MATTER FROM MANNER. IF A

GIVEN MATTER DICTATES A PARTICULAR MANNER, THAT MANNER

SHOULD NOT BE CALLED A STYLE, AT LEAST NOT IN THE SENSE

THAT I HAVE BEEN SPEAKING OF. BUT THIS POSTULATE DOES NOT

PRECLUDE THAT A CERTAIN MATTER SHALL FAVOUR OR 'CALL FOR'

A CERTAIN MANNER-THE SO CALLED FITNESS OF MANNER TO MATTER,

OR CONSONANCE WITH IT." (P.215)

اسمیت سے فعلیت کی طرف آتے ہوئے جملے کی پوری ساخت بدل جاتی ہے، فعل کے در آنے سے حروف جار، اور ظرف و تمیز بھی کلمے میں آجاتے ہیں، اور تمام نحوی مناسبتوں پر بھی اثر پڑتا ہے۔ انگریزی کے بارے میں RULON WELLS نے ثابت کیا ہے کہ اسمیت سے جملے طویل ہوتے ہیں، فعلیت سے مختصر۔ ہمارا خیال ہے سنسکرت، فارسی اردو اور ہندی میں ان کا بالعکس صحیح ہے یعنی اسمیت سے اختصار اور فعلیت سے جملے میں پھیلاؤ آتا ہے۔ البتہ اس بارے میں ذیل کے نتائج اہم ہیں :

(الف) اسما بذاتہ جامد اور کم جاندار ہوتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی بلند آہنگ اور پر شکوہ کیوں نہ ہوں، جبکہ افعال میں تازہ کاری کے عناصر کہیں زیادہ پاتے جاتے ہیں۔
(ب) فعلیت سے ترسیل معانی میں زیادہ مدد ملتی ہے۔

(ج) اسمیت میں اسلوبیاتی تنوع کا زیادہ امکان نہیں، فعلیت میں تنوع کے امکانات نامحدود ہیں، اور کوئی بھی اچھا اسلوب ان امکانات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

(د) اسمیت بول چال کی زبان کی ضد ہے۔ اس سے ایک غیر شخصی اور آسمانی لہجہ پیدا ہوتا ہے جسے آفاقی بھی کہا جاسکتا ہے۔

(۴) فعلیت زیادہ پُر تاثیر ہے۔

(۵) سچے فعلیہ اسلوب کی تخلیق سچے اسمیہ اسلوب کی تخلیق سے زیادہ مشکل ہے۔ اس میں تہ داری اور معنی آفرینی کی گنجائش زیادہ ہے۔

سنسکرت کے جامد اور نرس ہو جانے کی ایک وجہ ہی اسمیت کا حد سے بڑھا ہوا استعمال تھا۔ نہ صرف یہ کہ "استی" اپنے دونوں معنی میں حذف ہو سکتا تھا یعنی ہے کے معنی میں بھی اور وجود کے معنی میں بھی، بلکہ سنسکرت میں ایسے سابقے اور لاحقے بہت بڑی تعداد میں ہیں جن کی مدد سے افعال کو اور کلام کے کسی بھی جزو کو اسم میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ یہ سہولت یونانی زبان میں بھی تھی لیکن اس حد تک نہیں۔ نتیجتاً سنسکرت میں وہ اسلوب سامنے آیا جو اسمیت کا شاہ کار تھا جس میں تمام سوتر لکھے گئے اور "سوتر اسلوب" کہلاتا ہے۔ پانینی کی گرامر اسی اسلوب میں ہے۔ یہ اختصار اور اجمال کی آخری حد ہے۔ اس کی ایک وجہ

اشعار کو حفظ کرنے کی ضرورت بھی تھی، متن جتنا مختصر ہوگا یاد کرنے میں اتنی ہی سہولت ہوگی سنسکرت اور فارسی ترکیبی SYNTHETIC زبانیں ہیں، یعنی ان میں الفاظ ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں، اور ان کی اپنی وحدت زائل ہو جاتی ہے۔ اردو اور ہندی اور کئی دوسری جدید آریائی زبانیں ترکیبی نہیں بلکہ تصریفی ANALYTICAL ہیں، ان میں نحوی مناسبتوں کی وجہ سے تصریف تو ہوتی ہے لیکن الفاظ کی ملفوظی وحدتیں زائل نہیں ہوتیں۔ یہ کیفیت ہند آریائی زبانوں بالخصوص اردو کے اسمیت سے فعلیت کی طرف تاریخی ارتقا اور گریز کی صورت کو ظاہر کرتی ہے۔

اس روشنی میں اقبال کے کلام کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اب تک اقبال کی اسلوبیاتی اسمیت کے بارے میں جو تاثر ہم نے قائم کیا ہے، وہ خاصا عارضی TENTATIVE اور ادھورا ہے، اور اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس کا کچھ احساس تو مسجد قرطبہ کے باقی بندوں کے مطالعہ ہی سے ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال جب مجرد تصورات کے بارے میں فکر کرتے ہیں، یعنی زمان و مکاں، یا عقل و عشق یا خودی و سرمستی، یا فقر و قلندری، تو ان کا لہجہ خاصا غیر شخصی ہوتا ہے اور اسمیت کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ مسجد قرطبہ کے پہلے، دوسرے، تیسرے اور پانچویں بند میں یہی کیفیت ہے۔ چوتھے اور چھٹے بند میں جہاں خطاب کا انداز ہے، افعال کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ ساتواں بند جس میں تاریخی صورتِ حال کا بیان ہے، اس میں افعال اور زیادہ استعمال ہوئے ہیں، اور آخری بند جس میں منظر کاری بھی ہے، وہ پہلے بند کی اسمیت سے بالکل متضاد کیفیت رکھتا ہے۔ اس بند کے ہر شعر میں فعل کا عمل دخل دیکھا جا سکتا ہے:

دادی کہسار میں غسرقِ شفق ہے سحاب
 لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
 سادہ دپڑ سوز ہے دخترِ دہقان کا گیت
 کشتیِ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شہاب
 آبِ روانِ کبیر تیسرے کنارے کوئی

دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
 عالمِ نو ہے ابھی پردہٴ تقدیر میں
 میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
 پردہ اٹھا دوں اگر چہرہٴ انکار سے
 لانا سکے گا فرنگِ میری نواؤں کی تاب
 جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
 روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب
 صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
 کرتی ہے جو ہر زمان اپنے عمل کا حساب
 نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
 نغمہ ہے سوداے خاتمِ خونِ جگر کے بغیر

فعلیت کی یہی کیفیت ذوق و شوق میں بھی ملتی ہے۔ اگرچہ پہلے دونوں مصرعوں میں
 فعل کا حذف ہے، لیکن / دشت میں صبح کا سماں / اور / چشمہٴ آفتاب سے نور کی ندیاں
 رواں / کی کیفیت کے بیان میں افعال سے بچنا تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ حسنِ ازل کی نمود کے
 سلسلے میں سحابِ شب کا ذکر ہے جو سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا ہے، ہوا گرد سے پاک ہے،
 برگِ نخیل دھل گئے ہیں اور ریگِ نواح کا ظمہ مشلِ پرنیاں نرم ہے :

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
 چشمہٴ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
 حسنِ ازل کی ہے نمود، چاکسے پردہٴ وجود
 دل کے لیے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں
 سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
 کوہِ اضم کو دے گیا رنگِ برنگِ طیلساں
 گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دھل گئے

ریگِ نواج کاظمِ نرم ہے مثلِ پرنیاں
 آگ بجھی ہوتی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
 کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں
 آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
 اہل فسراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اقبال کی شاعری ترغیبِ عمل کی شاعری ہے۔ اس میں مرکزیت اثباتِ ذات اور استحکامِ خودی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ زندگی کو کھلے ذہن سے قبول کرتی ہے اور عمل کے ذریعے اسے بامعنی بنانے کی طرف راجح کرتی ہے۔ اس خصوصیت کے پیش نظر یہ توقع پیدا ہوتی ہے کہ شعرِ اقبال کی فعلیت کی شیرازہ بندی میں کلمہ حصر یعنی صیغہ امر کا ہاتھ ہوگا۔ مثال کے طور پر ذیل کے اشعار میں جو خط کشیدہ افعال آئے ہیں وہ ترغیبِ عمل کا پیغام دیتے ہیں اور کچھ نہ کچھ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مثلاً روشن چراغِ آرزو کر دے، شہیدِ جستجو کر دے، جاوداں ہو جا، قیدِ مقام سے گزر، قلبِ نظر شکار کر، تسخیرِ مقامِ رنگ و بو کر یا ضربِ کلیم پیدا کر، یا کھول آنکھ زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ کا لہجہ واضح طور پر امریہ ہے اور شد و مد سے عمل کی تلقین کرتا ہے۔

خودی میں ڈوب جا غافل، یہ سترِ زندگانی ہے
 نکل کر حلقہٴ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
 چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے

تو ابھی رہ گزر ہیں ہے قیدِ مقام سے گزر

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر

گیسے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوٹ و خرد شکار کر قلب نظر شکار کر

فطرت کو خرد کے رو برو کر

خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

وہی جام گردش میں لا سا قیا	شراب کہن پھر پلا سا قیا
جوانوں کو پیروں کا استاد کر	خرد کو غلامی سے آزاد کر
دل مرتضیٰ سوزِ صدیق دے	ترہنے پھر کنے کی توفیق دے
تمنا کو سینوں میں بیدار کر	جگر سے وہی تیر پھر پار کر
زمینوں کے شب زندہ داڑوں کی خیر	ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
مرا عشق میسری نظر بخش دے	جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر	مری ناؤ گرداب سے پار کر
گمانوں کے لشکر یقین کا ثبات	مرا دل مری رزم گاہِ حیات
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر	یہ، کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے

لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے

لیکن اقبال کی پوری شاعری پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مثالیں زیادہ نہیں۔ کم از کم فعل کے استعمال کا یہ انداز غالب راجان کی حیثیت نہیں رکھتا، یعنی صیغہ امر کا استعمال اقبال کا انداز نہیں۔ اگرچہ یہ بات اقبال کی حرکی و پیغامی لے سے مناسبت نہیں رکھتی، لیکن افعال کے اعداد و شمار سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کے یہاں براہِ راست کلمہ حصر کا استعمال زیادہ نہیں ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کی شاعری

حرکی اور عملی شاعری ہونے کے باوجود اگر اپنی صرفی غذا صیغہ امر سے حاصل نہیں کرتی تو پھر اس کی شیرازہ بندی کن اجزا سے ہوتی ہے اور اس کے اظہاری وسائل کیا ہیں۔ اس سوال کے جواب کے لیے ہم پھر ذوق و شوق سے رجوع کرتے ہیں اور بات کو وہیں سے لیتے ہیں جہاں پر اُسے چھوڑا تھا :

آیہ کائنات کا معنی دیر یاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہارے رنگ بو،
فرصت کشمکش مدہ این دل بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوے تابدار را

یہ نظم نعتیہ ہے اور رسول اللہ کی محبت و عقیدت سے سرشار ہے۔ یہاں توجہ افعال کے استعمال کی طرف نہیں بلکہ ضمائر کی طرف دلانا مقصود ہے یعنی صیغہ واحد حاضر یہاں ضمیر "تو" میں اُس سوال کا جواب ڈھونڈا جاسکتا ہے جو اقبال کی شعریات میں فعلیت کی ترفیبات ذہنی کے بارے میں اوپر اٹھایا گیا۔ کیا مخاطب کا یہ انداز شعر اقبال کی بنیادی اسلوبیاتی جہت نہیں ہے شاید خطاب کی خواہش اقبال کی سب سے بڑی خواہش ہے، غالباً اس بارے میں دو رائیں نہیں کہ یہ خواہش مقصود بالذات نہیں بلکہ ذریعہ دوسرے معنیاتی مقاصد کو پانے کا یعنی عام انسانی بیداری اور تشکیلِ جدیدِ فکرِ اسلامیہ کا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اقبال زمینی اور آسمانی، جسمانی اور روحانی، کئی سطحوں پر خطاب کرتے ہیں اور مخاطب کا انداز ان کی مرکزی اسلوبیاتی خصوصیت کے طور پر ابھرتا ہے۔ مخاطب میں کام صرف کلمہ اسمیہ سے نہیں چلتا، بات کو پوری طرح کہنے کے لیے یا ترسیل معنی کے لیے گفتگو میں فعلیت ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مخاطب کے باعث اقبال کی شاعری میں فعلیت کے بروے کار آنے کے لیے راہ کھُل جاتی ہے۔ اقبال کی ابتدائی شاعری میں فعلیت کے امکانات کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ اور وہ ہے مناظرِ فطرت سے ہم کلامی کی شدید خواہش۔ اقبال فطرت کی روح میں اترنا، اسے سمجھنا اور اس سے ایک با معنی رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں، گویا مخاطب فطرت یا فطرت کے مناظر یا اس کی روح سے ہے اور اس ہم کلامی

COMMUNICATION میں گفتگو کا یہ پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ البتہ ابتدائی شاعری میں فطرت سے مخاطب کی لئے شدید ہے، بعد میں یہ کچھ کم ہوگئی۔ بعد کی شاعری میں فطرت کا کہیں ذکر آیا بھی ہے تو پس منظر کے طور پر یا فضا آفرینی کے لیے یا نظم کے مرکزی خیال کو REINFORCE کرنے یا اس کا تاثر بڑھانے کے لیے، جس کی اچھی مثالیں ذوق و شوق اور ساقی نامہ کے پہلے حصے میں یا مسجد قرطبہ کے آخری بند میں ملتی ہیں۔

اقبال کے یہاں مخاطب کی لئے کے وسعت اختیار کرنے کی کئی وجہیں ہیں۔ ان کے کئی منطقے، کئی دائرے اور کئی رُخ ہیں۔ آل احمد سرور نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایلپیٹ نے شاعری کی جن تین آوازوں کا ذکر کیا ہے، اقبال کی شاعری میں وہ تینوں آوازیں ملتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال کے یہاں شاعر خود سے بھی بات کرتا ہے، دوسروں سے بھی بات کرتا ہے اور اپنے ڈرامائی کرداروں کے ذریعے بھی بات کرتا ہے جو شاعری کی غیر شخصی جہت ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اقبال کے یہاں پہلی آواز کمزور ہے اور دوسری اور تیسری آوازوں کی کار فرمائی نسبتاً زیادہ ہے۔ اکثر و بیشتر اقبال دوسروں سے بات کرتے ہیں یا دوسروں کے ذریعے بات کرتے ہیں۔ دوسری آواز کا رُخ اگرچہ خارج کی طرف ہے، لیکن کلام کا سرچشمہ چونکہ خود شاعر کی ذات ہے، اس لیے اس سے مخاطب کا انداز پیدا ہوتا ہے، اور تیسری آواز میں چونکہ بات تختیلی، تاریخی یا ڈرامائی کردار یا کرداروں کے ذریعے کرائی جاتی ہے، اس لیے اس سے مکالمے کا انداز پیدا ہوتا ہے۔ ان دونوں پیرایوں یعنی مخاطب اور مکالمے میں ذرا سا فرق ہے۔ اگرچہ مخاطب میں بھی مکالمہ ہے لیکن ایک طرف، یعنی اس میں کہنے کی جہت ہے سننے کی نہیں، یعنی کوئی دوسرا نہیں بولتا۔ جبکہ مکالمہ دو یا دو سے زیادہ آوازوں کی مدد سے تشکیل پاتا ہے، البتہ فعلیت دونوں میں ناگزیر ہے۔ اقبال کے یہاں بالخصوص دوسری اور تیسری آوازیں مختلف النوع اور مختلف المعانی ہیں۔ ان میں باری تعالیٰ، پیغمبر، فرشتے، انسان، بزرگانِ دین اور اشیا اور فطری مناظر سب شامل ہیں۔ اقبال کو فخر ہے کہ حضرت یزداں میں بھی وہ چپ نہ رہ سکے اور کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند نہ کر سکا۔ وہ خدا کو اربابِ وفا کا شکوہ بھی سناتے ہیں اور اسے مجبور بھی کرتے ہیں کچ

وہ شوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے۔ باری تعالیٰ سے مخاطب کی یہ کیفیت بہت سی غزلوں اور نظموں کا مرکزی احساس ہے۔ اکثر جگہ اس سے چیلنج کی فضا ابھرتی ہے، اور باری تعالیٰ کے حضور میں نہ صرف طرح طرح کے سوال اٹھائے جاتے ہیں، بلکہ انسان کی بے مائیگی کے باوجود اس کے وجود پر شدید ترین اصرار کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ اس بارے میں صرف بالِ جبیریل کی ابتدائی غزلوں کے چند اشعار دیکھ لینا کافی ہوگا :

اگر کج رو ہیں انجسم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں مو، جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہلے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا
محمد بھی ترا، جبیریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں تر جہاں تیرا ہے یا میرا
اسی کو کب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

بانعِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر
روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

میری نوائے شوق سے شورِ حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدہٴ صفات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینہٴ کائنات میں

یارب یہ جہانِ گزراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردانِ صفائش و ہنرمند
چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

اقبال کی بعض نظموں میں ساقی سے بھی خطاب ہے، عام معنی میں بھی اور روحانی معنی میں بھی / لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی / ان میں محبت و عقیدت کی ایک لطیف و دلآویز کیفیت ہے۔ ویسے کلامِ اقبال میں ایسی منظومات کی کمی نہیں جن کے عنوان یا پہلے مصرعے ہی سے ان کی مخاطبت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان میں خاص خاص شخصیتوں یا کرداروں سے خطاب کیا گیا ہے۔ اقبال کے اسلوبیاتی مطالعے میں خطاب کی اس تسدید خواہش کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس بارے میں ذیل کی نظموں کے صرف عنوان دیکھ لینا کافی ہوگا:

امراے عرب سے، صوفی سے، اے پیرِ حرم، شیخِ مکتب سے، فلسطینی عربی سے،
اہلِ مصر سے، خطاب بہ جوانانِ اسلام،

پنجاب کے دہقان۔ پنجاب کے پیر زادوں سے،

ماہرِ نفسیات سے، اہلِ ہنر سے، اپنے شعر سے، ناظرین سے، پھول کا تحفہ عطا
ہونے پر، ایک نوجوان کے نام، نصیحت، جاوید کے نام، جاوید سے، ایک فلسفہ
زدہ سید زادے کے نام، عبدالقادر کے نام، ... کی گود میں بتی دیکھ کر، طلبہ
علی گڑھ کے نام۔

اب بعض نظموں کا یہ آغاز دیکھیے :

اے ہمالہ /	اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستان
گلِ پژمردہ /	کس زباں سے اے گلِ پژمردہ تجھ کو گل کہوں
صداے درد /	ہاں دُبودے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
چاند /	اے چاندِ حسن تیرا فطرت کی آبرو ہے

صبح کا ستارہ / لطف ہسانگی شمس و قمر کو چھوڑوں
 نیا سوال / سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
 بلال / چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا
 رخصت اے بزم جہاں / سوے وطن جاتا ہوں میں
 دردِ عشق / اے دردِ عشق ہے گہرِ آبِ دار تو
 سوامی رام تیرتھ / ہم بغلِ دریا سے ہے اے قطرہ بے تاب تو
 کنارِ راوی / نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی

قطع نظر ان منظومات کے جن میں مخاطب خاص شخصیات سے یا مناظر یا اشیا سے ہے جن کو نام زد کر دیا گیا ہے، شعرِ اقبال کی عام کیفیت ایک ایسے مخاطب کی ہے جس کو عمومی مخاطب کہنا مناسب ہوگا۔ یہ مخاطب بنی نوع انسان سے، رسالت مآب سے، اہل ہند سے، جو انان قوم سے، یا ملت اسلامیہ سے ہے۔ عمومی مخاطب کی یہ کیفیت اقبال کی پوری شاعری میں موجِ تہ نشیں کی طرح جاری و ساری ہے۔ مسائل کیسے ہوں، اقبال اکثر و بیشتر انھیں مخاطب کے پیرایے میں پیش کرتے ہیں:

ہے مریدوں کو تو حق بات گوارا لیکن
 شیخ و ملا کو بُری لگتی ہے درویش کی بات (حکومت)

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
 خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری (تصویر درد)

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
 تو ابھی رہگذر میں ہے قیدِ مقام سے گزر
 ترا علاجِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں
 مصدر و حجاز سے گزر پارں و شام سے گزر

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے (طالب علم)

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ توبے پاک نہیں ہے

تری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ

تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود (تیا تر)

اے اہل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن (فنون لطیف)

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود (وجود)

غلط نگر ہے تری چشمِ نیم باز اب تک (رومی)

فاطاب ہاری تعالیٰ سے ہو، حضور رسالت مآب سے، یا عام انسان سے، اس میں نسبت مزو تو کی ہے یعنی متکلم بہ حاضر گویا سرچشمہ اقبال کی ذات ہے اور خطاب کسی دوسرے سے ہے۔ یہ مکالمے کی صرف ایک جہت ہے یعنی نجی اور شخصی، جن میں کلام ایک طرف نہ ہوتا ہے یعنی متکلم کی طرف سے۔ دوسرے لفظوں میں یہ گفتگو یک طرفہ ہے۔ اقبال کے ہاں مکالمے کی اس شخصی اور یک طرفہ جہت کے علاوہ غیر شخصی جہتیں بھی ہیں جن میں گفتگو دو طرفہ ہے، یا مکالمے میں دو سے بھی زیادہ آوازیں ہیں۔ اس سے وہ مکالماتی فائز ہوتی ہے جو اقبال کے اسلوب میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں غائب بہ غیب یعنی زید بنام احمد، یا جاندار بنام غیر جاندار یا غیر جاندار بنام جاندار یا غائب بہ حضر یا حاضر با غائب یہ سب صورتیں ملتی ہیں۔ اس انداز کی ابتدا ان نظموں سے ہوتی ہے جن اقبال کوئی سبق آموز حکایت یا تاریخی واقعہ یا ایسی واردات بیان کرنا چاہتے ہیں۔ وہ فلسفے یا اخلاق و روحانیت کا کوئی نکتہ اخذ کر سکیں۔ مثلاً

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا / یا اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہ ہاں
 (رہہ اور رندی) یا / آتے جو قیراں میں دو ستارے / کہنے لگا ایک دوسرے سے /
 (دو ستارے) یا کلی سے کہہ رہی تھی ایک دن شبنم گلستاں میں / (پھولوں کی ٹہنزا دی)
 لیکن بعد میں مکالمے کی یہ حکایتی کیفیت مدہم ہو جاتی ہے اور اس میں اُن الہی، اساطیری
 اور تاریخی جہات کا اضافہ ہوتا ہے جو ایک یعنی رزمیہ شاعری کے شناخت نامے سے
 تعلق رکھتی ہیں۔ اقبال کے یہاں ڈرامائیت اور مکالماتی لہجے سے نہ صرف معنی کی نئی جہات
 روشن ہوتی ہیں بلکہ رفعت کے نئے امکانات زیرِ دام آگئے ہیں۔ ظاہر ہے اس مکالماتی
 لہجے کی تکمیل فعلیت سے ہٹ کر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس بات سے ایک غلط فہمی کا امکان
 ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جہاں مخاطب اور مکالماتی فضا ہوگی، فعلیت ضرور ہوگی لیکن اس
 کا برعکس صحیح نہیں۔ یعنی ضروری نہیں کہ جہاں فعلیت ہو وہاں مخاطبت اور مکالمہ بھی ہو۔
 مخاطب اور مکالمے کے لیے فعلیت شرط ہے۔ فعلیت کے لیے مخاطب یا مکالمہ شرط نہیں، وہ
 اس لیے کہ فعلیت بت ہزار شیوہ ہے مخاطبت کے بغیر بھی وہ کار فرما رہتی ہے، جیسا کہ
 میر تقی میر کے یہاں ہوا ہے یا غالب کے یہاں ہے، جہاں فعلیت اجمال کے ساتھ ابہام کا
 پہلو بھی رکھتی ہے جو معنی آفرینی یا تہ داری کا بھی ساتھ دیتا ہے۔ یا ایک فعلیت وہ ہے
 جو آزادی کے بعد جدید غزل اور جدید نظم میں ملتی ہے جس میں تازہ کاری کے ساتھ ساتھ
 نئی پسیر تراشی اور علامت سازی بھی ملتی ہے، اور شعر کی نئی گرامر خلق کرے کی کوشش
 بھی۔ بہر حال یہ موضوع اس وقت بحث سے خارج ہے۔

اقبال کی مکالماتی شاعری میں کہیں ہماری ملاقات ابلیس و جبریل سے ہوتی ہے
 تو کہیں خضر و موسیٰ و ابراہیم و اسماعیل و الیاس و رام و رام تیرتھ و گوتم ہانک و شو و
 دشوا متر سے۔ ان میں سکندر و نوشیرواں و ہارون و غزنوی و غوری و شیرازہ و ڈیپو سلطان
 کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں، اور افلاطون و رازی و فارابی و بوعلی سینا و غزالی
 و ابن عربی سے ملاقات بھی ہوتی ہے۔ کہیں فردوسی و نظامی و عطار و سن جو گفتگو
 ہیں تو کہیں ہم خسرو کے نغمہ شیریں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اقبال مکالماتی محفل

میں بھرتی ہری و فیضی و عرفی و خوشحال خٹک و صائب د کلیم و بیدل و غالب بھی نظر آتے ہیں اور شکسپیر اور گوٹے، نطشے، سپنوزا، نپولین، ہیگل، مارکس، لینن، مسولینی اور مصطفیٰ کمال کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ یہاں منصور حلاج، بوعلی قلندر، خواجہ معین الدین اجمیری حشتی بھی ہیں اور مجدد الف ثانی اور مظہر جانِ جاناں بھی۔ اس سے شعرِ اقبال کی نہ صرف معنیاتی وسعتوں کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس بات کا بھی کہ ان کی شعریات میں مکالمے کیسی مرکزیت حاصل ہے۔ ذیل کے مصرعوں میں کہنا، کہا، کہتا، کہتے، پوچھا وغیرہ افعال کی جو تکرار ملتی ہے، وہ شعرِ اقبال کے مکالماتی لہجے کی تفہیم میں نظر انداز نہیں کی جاسکتی :

(مومن)	کہتے ہیں فرشتے کہ دلاویز ہے مومن
(قلندر کی پہچان)	کہتا ہے زمانے سے یہ درویشِ حواں مرد
(اذان)	اک رات ستاروں سے کہا نجمِ سحر نے
(قطعہ)	کل اپنے مریدوں سے کہا پیرِ مغاں نے
(امتحان)	کہا پہاڑ کی ندی نے سنگِ یزے سے
(علم و عشق)	علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
(نصیحت)	اک مردِ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے
(شفاخانہ حجاز)	اک پیشواے قوم نے اقبال سے کہا
(کفر و اسلام)	ایک دن اقبال نے پوچھا کلیم طور سے
(فردوس میں ایک مکالمہ)	ہاتف نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز
(سوال)	اک مفلس خود دار یہ کہتا تھا خدا سے
(عقل و دل)	عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا

اقبال کے یہاں ایسی نظموں کی کمی نہیں جن کی بنیاد ہی مکالمے پر ہے۔ یہ مکالمہ مذہبی کرداروں، اشخاص یا اشیاء کے مابین ہے۔ ایسی نظمیں تمام و کمال مکالماتی ہیں۔ ان میں مکالمے کے دو نقطے ہیں اور دونوں کلام میں برابر کے شریک ہیں۔ ان مکالماتی نظموں کے محض عنوانات ہی پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا :

پہاڑ اور گلہری، مکڑا اور مکھی، گائے اور بکری، چوٹی اور عقاب، رات اور شاعر،
 شمع و شاعر، شمع و پروانہ، پروانہ اور جگنو، بچہ اور شمع، شبنم اور ستارے،
 پھل اور شبنم (صبح چن)، نسیم و شبنم، تصویر و مصوّر، سلطان ٹیپو کی وصیت،
 خوشحال خاں کی وصیت، ہارون کی آخری نصیحت، بڈھے بلوچ کی نصیحت
 بیٹے کو، قید خانے میں معتمد کی فریاد، فرمانِ خدا فرشتوں سے، پرندے کی فریاد،
 خفتگانِ خاک سے استفسار، جبریل اور ابلیس، ابلیس و یزداں، ابلیس کی مجلسِ
 شربی، ابلیس کی عرضداشت، ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام،
 ایک بکری فزاق اور سکندر، مریدِ ہندی و پیرِ رومی۔

حضرتِ راہ بھی اسی نوعیت کی نظم ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہ راصل
 مکالمہ ہے مابین شاعر و خضر۔ شاعر رات کے وقت گوشہٴ دل میں اک جہانِ اضطراب کو
 چھپائے ساحلِ دریا پر محورِ نظر ہے :

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
 تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
 رات کے افسوں سے طائرِ آشیانوں میں اسیر
 انجم کم صنو گوشتِ طلسمِ ماہتاب

اس منظر کشی کے بعد شاعر کیا دیکھتا ہے :

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پہا خضر
 جس کی پیری میں ہے مانندِ سحرنگِ شباب
 کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویاے امراہِ ازلی
 چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب
 دل میں یہ سن کر بپا ہنگامہٴ محشر ہوا
 میں شہیدِ جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

اس کے بعد باقاعدہ گفتگو کا آغاز ہوتا ہے، سوال و جواب کا سلسلہ ہے جس کے

ذریعے صحرا نوردی، زندگی، سلطنت، سرمایہ و محنت اور دنیا نے اسلام کے آثار و کوائف پر اظہار خیال ہے۔ اس مکالماتی کیفیت کی جھلک بال جبریل کی اور بعد کی کئی غزلوں میں بھی ملتی ہے اور بعض غزلیں تو تمام و کمال اسی پیرایے میں ہیں۔ اس کی ایک بہت اچھی مثال / پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہِ دامن / ہے۔ شروع کے چند اشعار منظر یہ ہیں:

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہِ دامن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اددے اددے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبِ نیم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
اور اس کے فوراً بعد وہی مخاطب کا انداز اور مکالماتی فضا ہے:
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

اقبال کی تمام اچھی نظموں میں مخاطب اور مکالمے کی یہ ساختی کیفیت کسی نہ کسی شکل میں ضرور ابھرتی ہے اور اسلوبیاتی اعتبار سے قدرِ مشترک کا درجہ رکھتی ہے، طلوعِ اسلام ہو یا خضرِ راہ، مسجدِ قرطبہ یا ذوق و شوق ہو، ساقی نامہ ہو، لالہ صحرا یا شاعرِ امید، سب میں مخاطب یا مکالمے کی ساختی فضا ہے اور صرفی و نحوی التزامِ گفتگو ہی کا ہے، فعلیت جس کے لیے ناگزیر ہے۔ شاعرِ اُمید کے ان اشعار پر بات کو ختم کیا جاسکتا ہے:

اک شوخِ کرن، شوخِ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغِ صفتِ جوہرِ سیما
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویرِ عطا ہو
بنتک۔ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

اد پر کی اس بحث سے ظاہر ہے کہ اقبال اگرچہ اسمیت سے کام لیتے ہیں اور ایک مضبوط تخلیقی حربے کے طور پر اس کو استعمال کرتے ہیں، لیکن اس کے تحدید یا امکانات کی کمی کے خطروں کا بھی انھیں وجدانی طور پر احساس تھا، اس لیے اس سے گریز بھی کرتے ہیں اور جلد اس تنگ نائے سے باہر فعلیت کی کھلی فضا میں آجاتے ہیں۔ ان کے موضوعی محرکات اور کشاکش خیال یعنی DISCOURSE کے تقاضے بھی اسی کے حق میں ہیں۔ شعر اقبال کی حرکی اور پیغامی لے اسلوبیاتی اعمتبار سے فعلیہ احساس ہی کے ذریعے صورت پذیر ہو سکتی تھی، لیکن یہ بات اہم ہے کہ اس میں کلمہ حصریہ کا عمل دخل زیادہ نہیں ہے بلکہ اس کی ساختی (STRUCTURAL) نوعیت مخاطب اور مکالمے کی ہے۔ اقبال کے یہاں مکالماتی منطوقوں میں بڑی وسعت ہے اور ان کی تعمیر تشکیل کئی طرح سے ہوتی ہے۔ ابتدائی منظومات میں انسان بہ فطرت یا فطرت بہ انسان نیز واقعہ گوئی، بیان واردات یا حکایت سرائی کو بھی دخل ہے، لیکن بعد کا غالب مکالماتی رجحان بندہ بہ خدا، بندہ بہ پیغمبر، بندہ بہ فرشتگان اور شاعر بہ بنی نوع انسان، شاعر بہ ملت اور شاعر بہ جوانانِ قوم سے بہرت ہے۔ نیز انسان بہ اشیا یا اشیا بہ اشیا یا شاعر بہ بزرگانِ دین یا شاعر بہ ائمہ فن کے مکالماتی سلسلے بھی دائرہ در دائرہ پھیلے ہیں جن میں شاعر نے حیات و کائنات اور عشق و خودی اور فقر و بستی کے اسرار و رموز کے جہانِ معنی آباد کر دیے ہیں، جس سے فعلیت کے امکانات کو بروئے کار آنے کا موقع مل گیا ہے۔ یہ فعلیت مخاطب اور مکالمے کے زیادہ استعمال کی وجہ سے جہاں جہاں توضیح و تشریح کی حدود تک پہنچ گئی ہے، شعر کا درجہ متاثر ہوا ہے، ورنہ جہاں جہاں اسے فنکارانہ طور پر برتا گیا ہے، حُسن و کشش، کیف و سُرستی، نیز تازہ کاری اور معنی آفرینی کا حق ادا کرنے میں مدد ملی ہے۔ فعل کا استعمال اقبال کے یہاں غیر رسمی NON-CONVENTIONAL نہیں ہے، اور اگرچہ نئی گماڑ خلق

کرنے کی کوشش نہیں ملتی، لیکن یہ بات اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے کہ اقبال نے معنیاتی
 وسعتوں کی پیمائش میں فعلیت کے گونا گوں امکانات سے کام لیا، اور لہجے کی حجازیت
 اور عجمیت کے باوصف اسی فعلیت نے اردو سے ان کے ہر در تہ تخلیقی رشتے کو
 استوار رکھنے میں مدد دی۔

۶۱۹۸۰

فیض کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام

(۱)

شاعری کی اہمیت و عظمت کا اصل فیصلہ وقت کرتا ہے۔ میر وغالب اپنے عہد میں ناقدری زمانہ کی برابر شکایت کرتے رہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی عظمتوں کا نقش روشن ہوتا گیا۔ اس معنی میں وقت یا زمانہ کوئی مجرد تصور نہیں، بلکہ کسی بھی معاشرے میں کسی شعری روایت سے فیض یاب ہونے والے صاحب الرائے حضرات کی پسند و ناپسند کا حاصل ضرب ہے۔ اس کے ذریعے بازیافت، تحسین و تفہیم اور تعین قدر کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے، اس نظر سے دیکھیے تو بیسویں صدی میں اقبال کے بعد فیض واحد شخصیت ہیں جن کی اہمیت کا بالعموم اعتراف کیا گیا ہے۔ ان کے معاصرین میں دوسری اہم شخصیتیں بھی ہیں، لیکن ان میں سے کسی کو وہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی نصیب نہیں ہوئی جو

فیض کے حصے میں آئی۔ اگرچہ مقبولیت ہی اہمیت کا واحد معیار نہیں۔ لطفِ سخن اور قبولِ عام کو خداداد کہا گیا ہے، مگر اس میں بڑا ہاتھ شاعر کے جوہر ذاتی کا ہوتا ہے۔ فیض کی شاعری نے اپنی حیثیت کو آہستہ آہستہ منوایا۔ نقش فریادی کے بعد دوسرا مجموعہ دستِ صبا اگرچہ ایک جست کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس کے وجوہ محض سوانحی یا تاریخی نہیں، تخلیقی بھی تھے۔ تاہم اس زمانے کے تنقیدی مضامین میں فیض کا نام بارھویں پندرھویں نمبر پر لیا جاتا تھا۔ پھر ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب فیض کے شعری ابہام اور غنائی لہجے کو ہدفِ ملامت بنایا گیا، اور کھل کر اعتراض کیے گئے۔ لیکن اس کے باوجود فیض کی اہمیت روز بروز بڑھتی گئی، اور رفتہ رفتہ یہ آواز پوری اردو شاعری پر چھا گئی۔ دوسروں کے چراغ یا تو ماند پڑ گئے یا بجھ گئے اور فیض کی آواز اپنے عہد کی آواز تسلیم کی جانے لگی۔

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں کھڑی ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں کھڑی ہے
دستِ صبا دیکھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بوئے گل کھڑی، نہ بلبل کی زباں کھڑی ہے
ہم نے جو طرزِ نغماں کی ہے نفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں کھڑی ہے

تخلیق کا راستہ جس طرح پزیر اور پراسرار ہے، اسی طرح تنقید میں بھی شعری اہمیت کی گہرائی کھولنا نہایت دشوار اور وقت طلب ہے۔ ہر بڑی شاعری دراصل اپنا پیمانہ خود ہوتی ہے۔ بڑا شاعر یا تو کسی روایت کا خاتمہ ہوتا ہے یا کسی طرزِ نو کا موجد ہوتا ہے۔ وہ بہر حال باقی ہوتا ہے۔ فرسودہ روایات پر کاری ضرب لگاتا ہے، اظہار کے لیے نئے پیمانے تراشتا ہے، اور نئی شعری گرامر خلق کرتا ہے۔

وہ یا تو اپنے زمانے سے آگے ہوتا ہے یا اپنے عہد کے درد و داغ و سوز و ساز و جستجو و آرزو کی ایسی ترجمانی کرتا ہے کہ اپنے وقت کی آواز بن جاتا ہے۔ فیض کا کارنامہ کیا ہے؟ فیض کی شاعری کو اس تناظر میں دیکھیں تو کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ کیا وہ باغی شاعر تھے؟ شاید نہیں۔ کیا وہ اپنے وقت سے آگے تھے؟ اس کا جواب بھی اثبات میں نہیں ملے گا۔ ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہو چکی تھی۔ خود فیض نے کئی جگہ کہا ہے کہ انھیں اس راہ پر ڈاکٹر رشید جہاں نے لگایا۔ جہاں تک ڈکشن کا تعلق ہے، فیض کا ڈکشن غالب اور اقبال کے ڈکشن کی توسیع ہے۔ فیض کی تمام لفظیات فارسی اور کلاسیکی شعری روایت کی لفظیات سے مستعار ہے، یا پھر اس کا ایک حصہ ایسا ہے جو تمام ترقی پسند شاعروں کے تصرف میں رہا ہے جس میں فیض کی اپنی کوئی انفرادیت نہیں۔ یہ سب باتیں جتنی صحیح ہیں، اتنا ہی یہ بھی صحیح ہے کہ فیض کی شاعری میں کچھ ایسی نرمی اور دل آویزی، کچھ ایسی کشش اور جاذبیت، کچھ ایسا لطف و اثر، کچھ ایسی درد مندی اور دل آسانی اور کچھ ایسی قوتِ شفا ہے، جو ان کے معاصرین میں کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ آخر اس کا راز کیا ہے؟ سماجی سیاسی احساس، سامراج دشمنی، عوام کے دکھ درد کی ترجمانی، سرمایہ داری کے خلاف نبرد آزمانی، جبر و استبداد، استحصال اور ظلم و بے انصافی کے خلاف احتجاج، امن عالم، بہتر معاشرے کی آرزو مندی، یہ سب ایسے موضوعات ہیں جن پر کسی کا اجارہ نہیں۔ یہ عالمی موضوعات ہیں اور سرمایہ داری اور نوآبادیت کے خلاف دنیا بھر کی عوامی تحریکوں میں ان کا ذکر عام ہے۔ اُردو ہی میں دیکھیے تو سب ترقی پسند شعراء کے یہاں یہ موضوعات قدرِ مشترک کے طور پر ملیں گے۔ فیض کا نظریہ حیات اور ان کی فکر وہی ہے جو دوسرے ترقی پسند شعراء کی ہے، یعنی ان کے موضوعات دوسرے ترقی پسند شعراء کے موضوعات سے الگ نہیں، تو پھر فیض کی انفرادیت اور اہمیت کس بات میں ہے؟ یعنی فکری یا موضوعاتی سطح پر اگر ان میں کوئی ایسی خاص

بات نہیں، جو ان کو دوسروں سے ممتاز اور ممتاز کر سکے تو پھر وہ شعری طور پر دوسروں سے الگ اور ان سے ممتاز کیوں کر ہوئے، اس سوال کے جواب کی ایک صورت یہ ہے کہ شاعری میں نظریاتی یا فکری یکسانیت دراصل شعری یکسانیت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ فکری یکسانیت اور تخلیقی یا معنیاتی یکسانیت میں فرق ہے۔ کسی بھی شاعر کا معنیاتی نظام کوئی مجرّد وجود نہیں رکھتا۔ یہ اپنے اظہار کے لیے زبان کا محتاج ہوتا ہے۔ ہر بڑا شاعر اس معنی میں نئی زبان خلق کرتا ہے، کہ خواہ وہ نئے لفظ بڑی تعداد میں ایجاد نہ کرے، اور تمام اظہاری سانچے کلاسیکی روایت سے مستعار لے تاہم اگر وہ ان کو ایک نئی لذت اور کیفیت سے سرشار کر دیتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں وہ ان میں نئی معنیاتی شان پیدا کر دیتا ہے تو اس کا اسلوبیاتی امتیاز ثابت ہے۔ چنانچہ اسلوبیاتی امتیاز ثابت ہے تو معنیاتی امتیاز بھی لازم ہے کیونکہ اسلوب مجرّد ہیئت نہیں۔ جو حضرات ایسا سمجھتے ہیں، وہ اسلوب کو محدود طور پر لیتے ہیں اور اس کی صحیح تعبیر نہیں کرتے۔ اس لیے کہ اسلوبیاتی خصائص معنیاتی خصائص کے منظر میں، ان سے الگ نہیں۔ پس اگر شعری اظہارات الگ ہیں تو معنیاتی نظام بھی دوسروں سے الگ ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ فیض احمد فیض نے اردو شاعری میں نئے الفاظ کا اضافہ نہیں کیا، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے نئے اظہاری پیرایے وضع کیے، اور سینکڑوں ہزاروں لفظوں، ترکیبوں، اور اظہاری سانچوں کو ان کے صدیوں پرانے منہا، ہم سے ہٹا کر بالکل نئے معنیاتی نظام کے لیے برتا، اور یہ اظہاری پیرایے اور ان سے پیدا ہونے والا معنیاتی نظام بڑی حد تک فیض کا اپنا ہے۔ اگر اس بات کو ثابت کر سکتے ہیں تو فیض کی انفرادیت اور اہمیت خود بخود ثابت ہو جاتی ہے۔

یہ سامنے کی بات ہے کہ فیض نے کلاسیکی شعری روایت کے سرچشمہ فیضان سے پورا پورا استفادہ کیا۔ ان کی لفظیات کلاسیکی روایت کی لفظیات ہے، لیکن اپنی تخلیقیت کے جادوئی لمس سے وہ کس طرح نئے معنی کی تخلیق کرتے ہیں، یہ دیکھنے

سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ تنقید جو صرف نظریے یا موضوع پر انحصار کرتی ہے، اوفتی استعارہ، تازہ کارانہ احساس، اور اظہاری کمالات پر نظر نہیں رکھتی، فیض کے لطفِ سخن کے رازوں کو نہیں پاسکتی۔ آئیے اس بات کی وضاحت کے لیے زنداں نامہ کی ایک بھی نظم ”ملاقات“ پر نظر ڈالیں:

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بجھ ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور، رو گئے ہیں
یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

اس نظم کی بنیاد جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے رات اور صبح کے تصورات پر ہے۔ رات، درد و غم یا ظلم و بے انصافی کا استعارہ ہے اور صبح کا روشن افق فتنہ جزی کی نشانی ہے۔ تاریکی اور روشنی کا یہ تلازمہ اور اس کا سماجی سیاسی مفہوم فکری اعتبار سے کوئی انوکھی بات نہیں۔ رات اور صبح کا سماجی سیاسی تصور دنیا بھر کی شاعری میں ملتا ہے اور معنیاتی اعتبار سے غیر معمولی نہیں۔ لیکن شاید ہی کسی کو اس بات سے انکار ہو کہ فیض کی نظم معمولی نہیں ہے۔ یہ لطف و اثر کا مرقع ہے۔ اگرچہ ان علامت میں جن پر اس نظم کی بنیاد ہے کوئی ندرت نہیں، لیکن نظم کے اظہاری پیرایے اور معنیاتی نظام میں ندرت ہے۔ ظاہر ہے اس ندرت تک ہماری رسائی اُن

اٹھاری پیرایوں ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے جو شاعر نے استعمال کیے ہیں۔ شاعر نے رات کو 'درد کا شجر' کہا ہے جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے۔ عظیم تر اس لیے کہ اس کی شاخوں میں لاکھوں مشعل بجف ستاروں کے کارواں، گھر کے کھوکھے ہیں۔ نیز ہزاروں مہتاب اس کے سائے میں اپنا سب نور رو گئے ہیں۔ رات، درد اور شجر پرانے لفظ ہیں لیکن رات کو درد کا شجر کہنا نادریہ پیرایہ اٹھارہ ہے۔ چنانچہ رات کا شجر، ستاروں کے کارواں، اور مہتاب سے مل کر جو امیجری مرتب ہوتی ہے، وہ حد درجہ پر تاثیر ہے۔ نیز ستاروں کے کاروانوں کا کھوجانا یا مہتابوں کا اپنا نور روجانا استعاراتی پیرایہ اٹھارہ ہے جو درد کی کیفیت کو اسخ کر دیتا ہے۔ درد کو مجھ سے تجھ سے عظیم تر کہنا ذاتی نوعیت کا تجربہ نہیں بلکہ اس کا تعلق پوری انسانیت سے ہے۔ دوسرے بند میں فیض نظم کو معیناتی موڑ دیتے ہیں:

مگر اسی رات کے شجر سے
 یہ چند لمحوں کے زرد پتے
 گرے ہیں، اور تیرے گیسوؤں میں
 اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
 اسی کی شبنم سے خامشی کے
 یہ چند قطرے، تری جبیں پر
 برس کے، ہیرے پرو گئے ہیں

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
 اسی سیاہی میں رونا
 وہ نہرِ حوں جو مری صدا ہے

اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موج زر جو تری نظر ہے

لمحوں کو زرد پتے کہنا واضح طور پر مغربی شاعری کا اثر ہے جو فیض کی امیجری میں جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے، لیکن گیسو، گلنار، شبنم، قطرے، جبیں، ہیرے سب کے سب اردو کی کلاسیکی روایت سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے، پہلے بند کی امیجری کو دوسرے بند کی امیجری سے آمیز کر کے فیض نے جس معنیاتی فضا کی تخلیق کی ہے، کیا وہ ذہن کو نئی جمالیاتی کیفیت سے سرشار نہیں کرتی؟ فیض کے کمال فن کا ایک سامنے کا پہلو یہ ہے کہ وہ انقلابی فکر کو جمالیاتی احساس سے اور جمالیاتی احساس کو انقلابی فکر سے الگ نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ اپنے تخلیقی لمس سے دونوں کو آمیز کر کے ایک ایسی شعری لذت اور کیفیت کو خلق کرتے ہیں جو مخصوص جمالیاتی شان رکھتی ہے، اور جس کی نظیر عہدِ حاضر کی اردو شاعری میں نہیں ملتی۔

نظم کے دو حصے میں یہی جمالیاتی کیفیت جاری رہتی ہے۔ درد کی رات بہت سیم ہے، لیکن محبوب کی نظر جس کو موج زر کہا ہے، اسی کے سائے میں نور گر ہے۔ کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو رات کے بعد صبح کے تصور کو سطحی رجائیت میں بدل کے رکھ دیتا۔ نظم کے پورے معنیاتی نظام اور ہر مصرعے سے فیض کی ذہنی سطح اپنے عہد کے دوسرے شعراء سے الگ نظر آتی ہے۔ آخری حصے میں شاعر، سحر کے عام رو مانی تصور کو رد کرتا ہے کہ الم نصیبوں، جگر نگاروں کی صبح افلاک پر نہیں ہوتی، بلکہ :

جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے

یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں!

فیض کا انفرادی نظم اور غزل دونوں میں ثابت ہے۔ نظم کے بعد اب
ایک نظم نما غزل "طوق و دار کا موسم" سے یہ اشعار دیکھیے:

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم

یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم

یہی جنوں کا، یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

صبا کی مست خرامی تہہ کس نہ نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروعِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

انتظار کی کیفیت فیض کی بنیادی تخلیقی کیفیات میں سے ایک ہے جس کا ذکر آگے آئے گا، یہاں صرف بعض کلیدی الفاظ کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ ریش، بہار، موسم، دل کے داغ، ہجران یار، جبر و اختیار، جنوں، طوق و دار، نفس، چین، آتش گل، فروغ گلشن، صوت ہزار، صبا کی مست خرامی، یہ سب کے سب الفاظ، تراکیب اور تصورات، غزلیہ شاعری کی یاد دلاتے ہیں۔ لیکن یہاں انتظار کا موسم، یا بہار کا موسم، رومانی شاعری سے ہٹ کر، ایک الگ سماجی سیاسی معنیاتی نظام رکھتے ہیں۔ طوق و دار کی رعایت سے اب جنوں، حب الوطنی، سامراج دشمنی یا عوام دوستی کی ترجمانی کرتا ہے۔ جبر و اختیار کے معنی کی بھی تقلیب ہو گئی ہے۔ اب نفس قید کی کوٹھری یا زنداں ہے۔ یہی وطنی قومی احساس، فروغ گلشن، صبا کی مست خرامی اور چین میں آتش گل کے نکھار کی معنیاتی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ واضح سماجی سیاسی مفاہیم کے لیے ان اسلوبیاتی سانچوں کے استعمال پر اب تقریباً چار دہائیاں گزر چکی ہیں، اور ان کا معنیاتی نظام، سامنے کی بات معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ اس معنیاتی تشکیل کے اس سفر میں اردو شاعری نے خاصا زمانہ صرف کیا ہے، اور بعض لوگوں نے تو عمریں کھپائی ہیں۔ دستِ صبا ہی سے یہ قطعہ ملاحظہ ہو :

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی نجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاج شہی
ہمیں سے سنت منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

صاف ظاہر ہے کہ کلاسیکی روایت کے بنیادی علامہ ایک نیا معنیاتی چولا بدل رہے ہیں، عبائے شیخ، قبائے امیر و تاج شہی، اب مخصوص لغوی معنی میں استعمال نہیں

ہوئے، بلکہ اپنے ایمانی رشتوں کی بدولت استحصالی قوتوں کے استعارے بن کر آئے ہیں۔ یہی معاملہ گل دامنی و کج کلہی کا ہے۔ سنت منصور و قیس بھی اہل جنوں سے اسی لیے زندہ ہے کہ موجودہ دور میں حق گوئی و ایثار و قربانی کے تقاضوں کو پورا کرنے کا تقاضا اہل جنوں ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

(۲)

راقم الحروف نے چند برس پہلے فیض کی شاعری کے بارے میں اپنے مضمون

TRADITION & INNOVATION IN URDU POETRY:
FIRAQ GORAKHPURI & FAIZ AHMAD FAIZ
(IN POETRY & RENAISSANCE, MADRAS 1974)

میں جو کچھ لکھا تھا اس میں فیض کی شاعری کے معنیاتی نظام کی ساختیاتی بنیادوں پر بھی غور کیا تھا۔ یہ مضمون چونکہ انگریزی میں تھا اور بالعموم اردو والوں کی نظر سے نہیں گزرا، اس لیے اس امر کی وضاحت نامناسب معلوم نہیں ہوتی کہ اس میں میر انبیادی معروضہ یہ تھا کہ ساختیاتی اعتبار سے اردو کی شعری روایت میں اظہاری پیرایوں کی ایک یا دو سطحیں نہیں، بلکہ تین خاص سطحیں ملتی ہیں۔ کلاسیکی غزل کی لفظیات جس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ دراصل وجود میں آئی تھی، جسم و جمال کے تذکرے اور عشق و عاشقی کے مضامین کے لیے۔ لیکن چند صدیوں کے ارتقائی عمل میں اس لفظیات میں ایک نئی روحانی، متصوفانہ، سطح کا اضافہ ہوا اور مزید تہ داری پیدا ہو گئی۔ فارسی اور اردو غزل کی مثالی آزاد خیالی، وسیع المشربی، کٹر پین کی مخالفت اور انسان دوستی کے تصورات کی آبیاری میں، اس روحانی متصوفانہ معنیاتی سطح کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ یعنی عشق و سرستی و زندگی و رسوائی، شیخ و شراب، گل و بلبل، شمع و پروانہ اور ایسے سینکڑوں اظہارات مابعد الطبیعیاتی ماورائی معنی میں استعمال ہونے لگے۔ ان دو سطحوں کے ساتھ ساتھ تیسری سطح کا اضافہ اس وقت ہوا جب اردو شاعری سیاسی و قومی شعور کی بیداری کے دور

میں داخل ہونے لگی۔ کلاسیکی شعری لفظیات کی اس تیسری سطح کو سماجی سیاسی احساس کی سطح کہا جاسکتا ہے۔ یوں تو اردو میں اس کا پہلا بھرپور اظہار، راجہ رام نرائن موزوں کے اس شعر میں ملتا ہے جو سراج الدولہ کے قتل پر کہا گیا تھا، لیکن میر و سودا، مصحفی و جبرأت، غالب و مومن، تمام کلاسیکی شعراء کے یہاں غزل کے پیرایے میں اس نوع کے اظہار کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ خواجہ منظور حسین نے تو غزل کی اس معنیاتی جہت پر پوری کتاب اردو غزل کا خارجی روپ بہروپ لکھ دی ہے۔ بہر حال بیسویں صدی میں حسرت، جوہر، اقبال، جگر، فراق اور بعد میں ترقی پسند شعراء کے یہاں سیاسی سماجی احساس کی یہ سطح عام طور پر ملنے لگتی ہے۔ اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ عاشقانہ شاعری کی بنیاد معنیاتی تشلیث پر ہے، یعنی عاشق معشوق اور رقیب دو عناصر میں باہمی ربط اور تیسرے عنصر سے تضاد کا رشتہ جو تخلیقی اظہار میں تناؤ پیدا کرتا ہے اور جان ڈالتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس تشلیث کا معنیاتی تفاعل شعری روایت کے ساختیاتی نظام کی تینوں سطحوں پر ملتا ہے، یعنی عاشقانہ سطح پر، متصوفانہ سطح پر، اور سماجی سیاسی سطح پر بھی۔ اس تہہ در تہہ معنیاتی نظام کے بنیادی ساختیاتی، راقم الحروف کے نزدیک اٹھارہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض کی شاعری کے تناظر میں عاشقانہ اور متصوفانہ یعنی پہلے دو معنیاتی نظام کے سیاسی سماجی یعنی تیسرے معنیاتی نظام میں منقلب ہونے کے ارتقائی عمل کو دکھانے کے لیے ان ساختیوں کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ چھ بنیادی سٹ جن میں سے ہر ایک تشلیث کی شان رکھتا ہے، نیچے درج کیے گئے ہیں۔ پہلی سطر میں عام معنی دیے گئے ہیں، ان کے نیچے سماجی سیاسی تو سمیعی معنی تو سین میں درج کیے گئے ہیں۔ یہ محض اشاراتی ہیں، تمام معنیاتی ابعاد انھیں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر افقی سطر ایک سٹ ہے۔ یعنی ہر معنی پورے معنیاتی نظام میں اپنے وجود کے مفہوم کے لیے دو کے تمام معنیاتی عناصر سے اپنے تضاد اور ربط کے رشتے کا محتاج ہے۔ اور بالذات یعنی محض اپنے طور پر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اردو

میں ساختیے یعنی STRUCTURE کے معنی بالعموم غلط لیے جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ اسٹرکچر STRUCTURE کا ظاہری ساخت یا ہیئت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چونکہ کم لوگوں کو یہ فرق معلوم ہے اس لیے اس مختصر وضاحت کی ضرورت ہے کہ ساختیات اسٹرکچرل ازم STRUCTURALISM کی وہ شاخ ہے جو تخلیقی اظہار کی اوپری سطح یعنی محض زبان یا ہیئت سے نہیں، بلکہ اس کی داخلی سطح یعنی معنیاتی نظام سے بحث کرتی ہے۔ معنیاتی نظام انتہائی مبہم اور گرفت میں نہ آنے والی چیز ہے۔ بحث و مباحثہ کی سہولت کے لیے اسے چند الفاظ میں مقید تو کیا جاسکتا ہے لیکن تمام معنیاتی کیفیات کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس بحث میں الفاظ کو محض اشاریہ سمجھنا چاہیے اس کلی معنیاتی نظام کا جو ان گنت استعاراتی اور ایمانی رشتوں سے عبارت ہے، اور لامحدود امکانات رکھتا ہے، جنہیں تخلیقی طور پر محسوس تو کیا جاسکتا ہے، لیکن منطقی طور پر دو اور دو چار کی زبان میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ فیض کے معنیاتی نظام کے بنیادی ساختیے درج ذیل ہیں۔ بعض حضرات یسٹن کرچس بہ جبیں ہوں گے مگر یہ حقیقت ہے کہ فیض کی شاعری کا کوئی مفہوم یا معنی کی کوئی پرت ان اظہارہ ساختیوں سے باہر نہیں ہے۔ پورے معنیاتی نظام کے ساختیوں کو ان چھ سطروں میں سمیٹا جاسکتا ہے۔ البتہ ان کے شاعرانہ اظہار کی ان گنت شکلیں اور پیرایے ہیں۔ ساختیہ کی بنیادی پہچان یہ ہے کہ کوئی ساختیہ بالذات کوئی معنی نہیں رکھتا۔ معنی کا تصور تضاد سے پیدا ہوتا ہے۔ تضاد نہ ہو تو مختلف معنی قائم ہی نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ تضاد بھی مجرد یا بالذات نہیں کیونکہ یہ زبان کے کلی نظام (یہاں پر شاعری کے کلی نظام) کے تحت رونما ہوتا ہے۔ اس نظام میں ہر عنصر دو کے عنصر سے تضاد ہے اس لیے مختلف ہے، تاہم چونکہ ایک نظام کے تحت ہے اس لیے ربط کا رشتہ بھی رکھتا ہے۔ گویا معنیاتی امکانات ایک کلی نظام کے تحت ربط و تضاد کے باہمی رشتوں کی عمل آوری سے پیدا ہوتے ہیں یعنی کوئی لفظ بالذات طور پر یا معنی نہیں ہے، چنانچہ کسی لفظ کی مجرد تعریف ممکن نہیں۔ ذیل میں ہر سطر کو اسی نظر سے دیکھنا

چاہیے۔ ان میں جو نئے نئے معنیاتی امکانات پیدا ہوتے ہیں، وہ شاعر کے ذہن کی خلائی
کا کارنامہ ہیں۔

۱۔ عاشق

(مجاہد / انقلابی)

معشوق

(وطن / عوام)

رقیب

(سامراج / سرمایہ داری)

۲۔ عشق

(انقلابی ولولہ / جذبہ حریت)

وصل

(انقلاب / آزادی / حریت /
سماجی تبدیلی)

بجر، فراق

(جبر / ظلم / استحصال کی
حالت ایسا انقلابی دوری)

۳۔ رند

(مجاہد / انقلابی / باغی)

محتسب، شیخ

(سامراجی نظام / سرمایہ دارانہ
ریاست / عوام دشمن حکومت /
رجت پسندانہ نظام / ظلمت
پسند یا زوال آمادہ ذہنیت)

شراب، مینجانہ، پیالہ، ساقی

(سماجی اور سیاسی بیداری
کے ذرائع)

۴۔ جنون

(سماجی انصاف / انقلاب
کی خواہش / تڑپ)

حُسن، حق

(سماجی انصاف / انقلاب /
سماجی سچائی)

عقل

(مصلحت کوئی، منفعت
اندیشی / جاہر نظام، دفتر
شاہی، یا عسکری نظام سے
سمجھوتہ بازی)

۵۔ مجاہد
(مجاہد آزادی / انقلابی)

زندال، دارورسن
(سیاسی قید / بھپانسی / جان کی قربانی)

حاکم
(سامراج / سرمایہ داری / تاناشاہی / عسکری نظام)

۶۔ کلیل، عنذلیب
(جذبہ قومیت، حریت سے سرشار شاعر / انقلابی)

گل
(سیاسی آدرش / نصب العین)

گلچیں، قفس
(سیاسی نصب العین کے حصول میں رکاوٹ / یار رکاوٹ ڈالنے والے عوامل)

۱۰۔ اوپر جلی حروف میں جو الفاظ درج کیے گئے ہیں، اردو کی عشقیہ شاعری کے صدیوں پرانے الفاظ ہیں۔ نیچے قوسین میں سماجی سیاسی مفاہیم کے امکانات کے اشاریے درج کر دیے گئے ہیں۔ عہد وسطیٰ میں جگمانہ اور منصفانہ شاعری میں بھی انھیں علام سے مدد لی گئی ہے اور مذہبی اجارہ داری، ریاکاری اور منافقت کے خلاف بھی انھیں الفاظ کے ذریعہ باغیانہ آواز اٹھانی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صدیوں کے چلن سے یہ الفاظ بڑی حد تک فرسودہ ہو چکے ہیں اور ان کی حیثیت بالعموم کلیشے کی ہے تاہم ان میں زیر سطح معنیات کا ایک زبردست نظام پوشیدہ ہے۔ تبھی تو موجودہ دور میں بھی قومی و سیاسی بیداری کے ساتھ ابھرنے والے نئے انقلابی مفاہیم بھی انھیں علام کے ذریعے ادا کیے گئے۔ جہاں تک ان علام کے استعمال محض کا تعلق ہے، یہ فیض احمد فیض اور اس دور کے متعدد ترقی پسند اور دیگر شعراء میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن فیض نے انھیں کو برتتے ہوئے انفرادی شان کس طرح پیدا کی، اور معنی آفرینی اور حسن کاری کا حق کس طرح ادا کیا، اس کی طرف کچھ اشارہ شروع میں کیا گیا،

مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

(۳)

فیض کی شاعری کے معنیاتی ساختیوں پر نظر ڈال لینے کے بعد یعنی یہ جان لینے کے بعد کہ معنیاتی طور پر کون سے عناصر کلیدی ہیں، وہ کن دو کے عناصر سے منسلک ہیں، اور کن عناصر سے برسرِ پیکار ہو کر نئے نئے معنی کی تخلیق کرتے ہیں، یا نئی نئی جمالیاتی جہات کو راہ دیتے ہیں، آئیے اب دیکھیں کہ فیض کی دنیا کے شعر کی اصل کیفیات کیا ہیں، یعنی وہ جمالیاتی فضا اور وہ بنیادی کیفیت جو خاص فیض کی اپنی ہے، اور کسی دو کے شاعر کے یہاں اس کی پرچھا میں بھی نہیں ملتی۔ وہ ان ساختیوں کے ذریعے کیا رنگ پیدا کرتی ہے —
نقش فریادی میں ”سرودِ شبانہ“ کے عنوان سے دو نظمیں ملتی ہیں۔ ان میں سے دوسری نظم کا شمار فیض کی بہترین نظموں میں کیا جا سکتا ہے:

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفلِ مست و لہو و ویراں ہے
پیکرِ التحسین ہے خاموشی
بزمِ انجمِ فسردہ سا ماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے
چار سو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا
ساری دنیا سراب ہے گویا

سورہی مے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وانگا ہوں سے
کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
سازدول کے نموش تاروں سے
چھن رہا مے خمارِ کیف آگیاں
آرزو، خواب، تیرا روئے حسین

نظم میں رات کے پس منظر میں انتہائی موضوعی ذہنی کیفیت کا بیان ہے۔ پوری نظم امیجری کا شاہ کار ہے۔ یہ امیجری بھی شب اور نیم شب کی موضوعی کیفیتوں سے جڑی ہوئی ہے۔ نیم شب، چاند، بزمِ انجم، آبشارِ سکوت، چاندنی کی تھکی ہوئی آواز کا گھنے درختوں پر سونا، کہکشاں کا نیم وانگا ہوں سے حدیثِ شوقِ نیاز کہنا، سازدول کے نموش تاروں سے خمارِ کیف آگیاں کا چھننا، اور روئے حسین کی آرزو کا سلسلہ جاریہ۔ یہ ہے وہ امیجری جو پوری نظم کو لطف و اثر کی ایسی سطح عطا کرتی ہے جو اعلیٰ شاعری کی پہلی شرط ہے۔ ظاہر ہے کہ فیض کے جمالیاتی احساس کو شب اور نیم شب کے احساسات اور ان سے جڑی ہوئی کیفیات سے ایک خاص مناسبت ہے۔ اس سے پہلے جو نظم ”ملاقات“ پیش کی گئی تھی اس میں رات کی امیجری سیاسی سماجی ابعاد بھی رکھتی تھی۔ ”سرودِ شبانہ“ خالص شخصی موضوعی نظم ہے، تاہم پہلی نظم کی طرح یہ بھی اعلیٰ درجے کی نظم ہے۔ ظاہر ہے کہ فیض کے یہاں سماجی سیاسی احساس کی شاعری بھی ہے اور شخصی اظہار کی بھی، لیکن یہاں اس کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ فیض کے یہاں سماجی سیاسی اظہار دراصل گہرے جمالیاتی احساس سے جڑا ہوا ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی دیکھتے چلیے کہ امیجری میں دو طرح کے عناصر بالمقابل ہیں۔ مرنی اور غیر مرنی، نیم شب اور چاند مرنی ہیں

خود فراموشی اور محفل ہست و بود کا دیران ہونا غیر مرئی۔۔۔۔۔ بزم انجم مرئی ہے، اور خاموشی کا پیکر التجا ہونا غیر مرئی۔ اسی طرح آبشار سکوت مرئی ہے اور چار سو بخودی سی طاری ہے، غیر مرئی۔ یہ سلسلہ نظم کے آخر تک چلا گیا ہے، زندگی اور سراب کے مقابلے میں چاندنی کی تھکی ہوئی آواز، یا کہکشاں کے مقابلے میں حدیثِ شوقِ نیاز، یا سازِ دل کے مقابلے میں خمارِ کیف آگیاں۔۔۔۔۔ امیجری کی یہ بانٹ اگرچہ بڑی حد تک غیر شعوری ہے، لیکن جمالیاتی احساس سے خود بخود ایک ڈیزائن بنتا چلا گیا ہے۔ آخری مصرعے سے اس کی مزید توثیق ہو جاتی ہے، یعنی آرزو اور خواب غیر مرئی ہیں اور محبوب کا رُوئے حسین مرئی ہے۔ ہو سکتا ہے بعض حضرات اس نظم کی تعریف میں کہنا چاہیں کہ شاعر فطرت سے ہم کلام ہے یا اس میں روحِ کائنات بول رہی ہے وغیرہ وغیرہ، لیکن حقیقتاً یہ منظر یہ شاعری نہیں۔ اس کو یوں دیکھنا چاہیے کہ اس میں ایک شدید جمالیاتی کیفیت کا اظہار ہوا ہے، جو فیض کے رومانی ذہن کو سمجھنے کے لیے کلید کا درجہ رکھتی ہے۔ اس نوع کی شدید حسن کارانہ امیجری فیض کی شاعری کا امتیازی نشان ہے۔ فیض کی شاعری میں شام، رات، شب، نیم شب، چاندنی، رُوئے حسین، محض پیکر نہیں ہیں، یہ شدید نوعیت کے تخلیقی محرکات ہیں جو ایک خاص جمالیاتی فضا کی تشکیل کرتے ہیں۔ گھنے درختوں پر چاندنی کی تھکی ہوئی آواز سو رہی ہے، کہکشاں نیم وانگا ہوں سے حدیثِ شوقِ نیاز سن رہی ہے، سازِ دل کے خموش تاروں سے خمارِ کیف آگیاں بھین رہا ہے، اور رُوئے حسین کی آرزو اس پوری کیفیت کا منہ تھا ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بنیادی جمالیاتی کیفیت شروع میں تو نمایاں ہے، نقشِ فریادی کے بعد جب انقلابیت کا اثر بڑھتے لگا تو جمالیاتی کیفیت دب گئی۔ یہ صحیح نہیں۔ میرے نزدیک اس کا سلسلہ نقشِ فریادی، دستِ صبا اور زنداں نامہ سے ہوتا ہوا آخری مجموعوں تک چلا گیا ہے۔ ذیل کی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

نقش فریادی

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
 دُھل کے نکلے گی ابھی چشمہ بہتا ہے رات
 اور مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی
 اور ان ہاتھوں سے سس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہاتھ

ان کا آنچل ہے، کہ رخسار، کہ پیراہن ہے
 کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
 جانے اس زلف کی موم گھنی پھاؤں میں
 ٹٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

آج پھر حُسنِ دلِ راکِ وہی دھج ہوگی
 وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لیر
 رنگِ رخسار پہ لبکا سا وہ ترازے کا غبار
 صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حسا کی تحریر
 اپنے افکار کی، اشعار کی، دنیا ہے یہی
 جانِ غمموں ہے یہی، شاہدِ معنی ہے یہی

یہ بھی ہیں، ایسے کہنی اور بھی مضمون ہوں گے
 لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ

ہائے اس جسم کے کبخت دل آویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوع سخن ان کے سوا اور نہیں
طبع شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں
(موضوع سخن)

تہہ نجوم، کہیں چاندنی کے دامن میں
ہجوم شوق سے اک دل ہے بے قرار بھی

ضیائے مہ میں دکھتا ہے رنگ پیراہن
ادا کے عجز سے آنچل اڑا رہی ہے نسیم
چھلک رہی ہے جوانی ہراک بن موئے
رواں ہو برگ گل تر سے جیسے سیل شمیم

دراز قد کی لچک سے گداز پیہ ہے
ادا کے ناز سے رنگ نریاز پیدا ہے
اداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں
دل حزیں میں کسی جاں بلب دعائیں ہیں

(تہہ نجوم)

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ
(آج کی رات)

چاند کا دکھ بھرا فسانہ نور
شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی!
ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کمتاں

(ایک منظر)

اس سلسلے کی ایک اہم نظم ”تنہائی“ ہے۔ یہ بھی اگرچہ شدید طور پر ذہنی و فنی نوعی نظم ہے، لیکن اس میں بھی ایک ذاتی انفرادی تجربہ ایک وسیع تر انسانی آفاقی کیفیت میں ڈھل جاتا ہے، اور ذہن و روح کو اپنی حزنیہ کیفیت سے شدید طور پر متاثر کرتا ہے:

پھر کوئی آیا دل زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
رہ گھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
جنسی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل نرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاع
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

دل زار، راہرو، تارے، خوابیدہ چراغ، راہ گزار، قدموں کے سراغ، یا شمع و مے و مینا و ایاع، غزل کی شاعری کے پرانے الفاظ ہیں جن میں کوئی تازگی نہیں۔ لیکن

دیکھیے کہ فیض کی تخلیقی جس نے ان ہی پرانے الفاظ کی مدد سے کیسی تازہ کارانہ جمالیاتی اور معنیاتی فضا تخلیق کی ہے، اور کلاسیکی روایت کے ان ہی فرسودہ عناصر کو کیسی تازگی اور لطافت سے سرشار کر دیا ہے۔ اس تخلیقی تقلیب کے جمالیاتی لطف و اثر سے کوئی بھی صاحب ذوق انکار نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ جمالیاتی کیفیت فیض زیادہ تر اپنی امیجری سے پیدا کرتے ہیں، ڈھلتی ہوئی رات میں تاروں کا غبار بکھرنے لگا ہے اور ایوانوں میں خوابیدہ چراغ لڑکھڑاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ”رہ گزار“ اک معمولی لفظ ہے۔ لیکن راستہ تک تک کے ہر اک ’رہ گزار‘ کا سو جانا کچھ اور ہی لطف رکھتا ہے۔ اسی طرح خاک کو اجنبی کہنا اور اس اجنبی خاک کا قدموں کے سراغ کو دھندلا دینا، یا کوڑوں کو بے خواب کہنا، یا شمعوں کو گل کر کے مے و مینا و ایام کو بڑھا دینا، پرانے علامت کی مدد سے نئی امیجری کا جادو جگانا ہے۔ فیض کی امیجری نہ صرف انتہائی حسن کارانہ ہے بلکہ طاقت ور بھی ہے۔ چند مصرعوں کی مدد سے فیض ایسی رنگیں بساط بچھا دیتے ہیں کہ جو اس اس کے طلسم میں کھو جاتے ہیں۔ زیر نظر نظم ”تنہائی“ کی اس توجیہ سے، جو فیض کے مترجم اوکٹر کیرن نے پیش کی ہے، میرے معروضات پر کوئی حرف نہیں آتا۔ جن اظہاری بنیادوں کی طرف خاکسار نے اشارہ کیا ہے، ان کو ذہن نشیں کر لیا جائے تو کیرن کی یہ تعبیر زیادہ معنی خیز معلوم ہوتی ہے کہ یہ نظم شاید فرسودہ کلیجہ، یا بکھرتے ہوئے سماجی ڈھانچے کے زوال کا اشارہ ہے / سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار / بقول کیرن کے ان ناکامیوں کا نوحہ ہے، جن سے برصغیر کی تحریک آزادی اس وقت دوچار تھی۔

’اجنبی خاک‘ سے مراد نوآبادیاتی نظام ہے۔ نظم امید سے شروع ہوتی ہے / پھر کوئی آیا دل زار / لیکن مایوسی پر ختم ہوتی ہے / اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا / گویا نظم اس یاس انگیز موڈ کو پیش کرتی ہے جو چوکتھی دہائی میں ملک میں پایا جاتا تھا۔

اس مضموعی موڈ کو جو ملکی ملکی اداسی، آرزوئے شوق، شام، ستارہ شام، نجوم،

تہہ نجوم، چشمہ مہتاب، میتی ہوئی راتوں کی کسک، شب، نیم شب وغیرہ سے عبارت ہے،
میں نے فیض کے بنیادی تخلیقی موڈ کا نام دیا ہے۔ اس کی مزید شکلیں نقش فریادی کے
بعد کے مجموعوں سے دیکھیے اور ان کلیدی الفاظ پر غور کیجیے جن کا ذکر کیا جا رہا ہے :

دستِ صبا

شفق کی راکھ میں جل جھج گیا ستارہ شام
شبِ فراق کے گیسوِ فضا میں لہرائے
کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے
فلک کو قافلہ روز و شام بٹھرائے
صبا نے پھر در زنداں یہ آ کے دی دستک
سحرِ قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

”زنداں کی ایک شام“ اور ”زنداں کی ایک صبح“ دونوں سیاسی
نظمیں ہیں۔ ان میں بھی اسی بنیادی جمالیاتی کیفیت اور اس سے جرطی ہوئی
ایجری کو دیکھیے اور غور کیجیے کہ اس کی بدولت نظم کس قدر حسین ہو گئی ہے اور
اس کی اثر انگیزی اور لطافت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے :

شام کے بیچ و خم ستاروں سے
زمینہ زمینہ اتر رہی ہے رات
یوں صبا پاکس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار

سرنگوں، محو ہیں بنانے میں،
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار

شانہ بام پر دکھتا ہے!
مہرباں چاندنی کا دست جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرشِ کانیل

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پیل
ظلم کا زہر گھولنے والے!
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی تمہیں
وہ بھجا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جائیں

موضوع کی رعایت سے یہاں فیض نے رات کے حوالے سے چاند کے استعارے کو مرکزیت دی ہے۔ / شانہ بام پر دکھتا ہے، مہرباں چاندنی کا دست جمیل / چاند روشنی کی تبدیل ہے اور روشنی زندگی کا استعارہ ہے / ظلم کا زہر گھولنے والے، چاند کو گل کریں تو ہم جائیں / ظاہر ہے کہ آخری بند کی معنویت اور لطافت، شروع کے بند کے ان مصرعوں سے جڑی ہوئی ہے جن کا محرک وہ جمالیاتی سرشاری ہے جسے میں نے فیض کی بنیادی تخلیقی قوت کہا ہے —
”زندوں کی ایک صبح“ بھی ”زندوں کی ایک شام“ کی طرح واضح طور پر سیاسی

نظم ہے، لیکن دیکھیے، فیض کا تخلیقی احساس کیا کیفیتیں پیدا کرتا ہے :

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا ”جاگ سحر آئی ہے
جاگ اس شب جوئے، خواب ترا حصہ تھی
جام کے لب سے تیرا جام اتر آئی ہے
عکس جاناں کو وداع کر کے اٹھی میری نظر
شب کے کھمبے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جا بجا رتس میں آنے لگے چاندی کے پنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر کر گر
ڈوہیتے، تیرتے، مڑھاتے رہے، کھلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

مجھے یقین ہے بہت سے صاحبانِ ذوق اس بند کا شمار فیض کے بہترین شعری پاروں
میں کرتے ہوں گے۔ زنداں نامہ سے یہ انتہائی پُر لطف غزل دیکھیے :

زنداں نامہ

شامِ فراق، اب نہ پوچھو، آئی اور آ کے مل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں مہنتی کہ پھر سنبھل گئی

بزمِ خیال میں ترے حُسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بچھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے
 رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کہ ہمدرد تپکلی گئی

دستِ تہہ سنگ

شام
 اس طرح ہے کہ ہر اک پیر کوئی مندر ہے . . . رخ
 (شام)

جھے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بچھ گئے ہیں
 سبھے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سے شام بچھ گئے ہیں
 وہ تیرگی ہے رہ بتاں میں چراغِ رخ ہے نہ سمجھ وعدہ
 کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بچھ گئے ہیں . . . رخ

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
 سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی . . . رخ

سروادی سینا

چاند نکلے کسی جانب تری زیبائی کا
 رنگ بد لے کسی صورت شبِ تنہائی کا

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کارنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا میرے ہمراز کارنگ

بالیں پہ کہیں رات ڈھل رہی ہے
یا شمع بجھل رہی ہے
پہلو میں کوئی چیز بجل رہی ہے
تم ہو کہ مری جاں نکل رہی ہے

شام شہریاں

اے شام مہرباں ہو
اے شام شہریاں
مم یہ مہرباں ہو . . . الخ

میرے دل میرے مسافر

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخر شب
کون کرتا ہے وفا عہد وفا آخر شب
... الخ

جیسا کہ وضاحت کی گئی رات کی معنیاتی کیفیات سے وابستہ ایسجری فیض کے بنیادی تخلیقی موڈ کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔ ان حوالوں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس تو ہوا ہوگا کہ یہ کیفیات رات کے بطن سے پیدا ہونے والی دوسری موضوعی ذہنی کیفیات مثلاً انتظار اور یاد کی کیفیات سے کھل بل گئی ہیں۔ مندرجہ بالا حوالوں میں کہیں کہیں تو یہ ربط خاصا واضح ہے، اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ رات کی ایسجری ان کیفیتوں سے اور یہ کیفیتیں، شب یا نیم شب کی بنیادی کیفیتوں سے جمالیاتی معنی خیزی کا رس حاصل کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں فیض کی ایک اور شاہ کار نظم ”یاد“ کلیدی درجہ رکھتی ہے، اور جس کی داد اس زمانے میں اثر لکھنوی نے بھی دی تھی۔ غزلوں میں اس کیفیت کی بہترین ترجمانی ”تم آئے ہونہ شب انتظار گزری ہے“ یا ”رنگ پراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام“ کرتی ہیں، لیکن انھیں پر موقوف نہیں۔ یاد کی ٹیس یا انتظار کی کسک فیض کا مستقل موضوع ہے جس کا اظہار طرح طرح سے ہوا ہے۔ بسیوں نظموں اور غزلوں میں یاد اور انتظار کی پرچھائیاں تیرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور حسن کاری کے عمل کو شدید سے شدید تر بناتی ہیں۔ پہلے ”یاد“ پر نظر ڈال لیجیے :

دشت تنہائی میں، اے جان جہاں، الرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب
دشت تنہائی میں، دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں، ترے پہلو کے کسمن اور گلاب

اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آہ
 اپنی خوشبو میں شلگتی ہوئی مدھم مدھم
 دُور۔ افق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
 گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبِ بنم

اس قدر پیار سے، اے جان جہاں، رکھا ہے
 دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
 یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
 ڈھل گیا، ہجر کا دن، ابھی گئی وصل کی رات

اس سلسلے میں مزید دیکھیے :

نہ پوچھ جب سے ترا انتظار کتنا ہے . . . الخ
 (قطعہ) دستِ صبا
 صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی . . . الخ
 (قطعہ) دستِ صبا
 ترا جمال نگاہوں میں لے کے اٹھا ہوں . . . الخ
 (قطعہ) دستِ صبا

تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
 کسی بہانے تمھیں یاد کرنے لگتے ہیں
 (غزل) دستِ صبا

اگرچہ تنگ ہیں اوقات سخت ہیں آلام
تمھاری یاد سے شیریں ہے تلخی آیام

(سلام لکھتا ہے شاعر تمھارے حُسن کے نام)
دستِ صبا

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب، بھر کی کوئی رات نہیں
(غزل) زنداں نامہ

تری اُمید، تُو انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے
(غزل) زنداں نامہ

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کار و بار چلے
(غزل) زنداں نامہ

یہ جفا ئے غم کا چارہ وہ نجاتِ دل کا عالم
تُو احسن دستِ عیسیٰ تری یاد روئے مریم

(غزل) دستِ تہہ سنگ

رہگزر، سائے، شجر، منزل و در، حلقہ، بام
 بام پر سینہ، مہتاب کھلا، آہستہ
 جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا، آہستہ
 حلقہ، بام تلے، سایوں کا کھڑا ہوا نیل
 نیل کی جھیل

جھیل میں چپکے سے تیرا، کسی پتے کا حباب
 ایک پل تیرا، چلا، پھوٹ گیا، آہستہ
 بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک زنگِ شراب
 میرے شیشے میں ڈھلا، آہستہ
 شیشہ و جام، صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب
 جس طرح دور کسی خواب کا نقش
 آپ ہی آپ بنا اور بنا آہستہ

دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا، آہستہ
 تم نے کہا، "آہستہ"
 چاند نے جھبک کے کہا
 "اور ذرا آہستہ"

(منظر) دستِ تہہ سنگ

تم مرے پاس رہو
 میرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاس رہو
 جس گھر ہی رات چلے،

آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے
 مرہم مُشک لیے، نشتر الماس لیے
 بین کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
 درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے . . .

جس گھڑی رات چلے
 جس گھڑی ماتمی، سنسان، سیہ رات چلے
 پاس رہو
 میرے قائل، میرے دلدار میرے پاس رہو

(پاس رہو) دست تہہ سنگ

(۵)

یہاں تک آتے آتے رات، انتظار اور یاد کی ان بنیادی کیفیات سے
 ملی ہوئی آگ اور کیفیت کی طرف بھی ذہن ضرور راجح ہوا ہوگا۔ فیض کی شاعری کی
 جمالیاتی فضا میں بعض کیفیتیں اتنی ملی جلی اور ایک دوسرے میں پیوست ہیں کہ
 تانے بانے میں ان کو الگ الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ رات، آرزو، انتظار اور یاد
 سے ملی ہوئی یہ کیفیت دھیمے دھیمے سلگتے ہوئے درد کی ہے جس نے پوری شاعری کو
 ایک مدہم حزنیہ لے عطا کر دی ہے۔ یہ کیفیت نظم ”ملاقات“ میں جس کا اس
 مضمون میں سب سے پہلے ذکر کیا گیا تھا، رات کی امیجری سے گندھی ہوئی موجود
 ہے، اور بعد کے تمام حوالوں میں بھی دھیمے دھیمے سلگتے ہوئے درد کی یہ کیفیت موج
 تہہ نشیں کی طرح جاری و ساری ہے۔ یہ رات اُس درد کا شجر ہے، میں درد ہی مرکزی

حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی نظموں سے اگر درد کے تصور کو خارج کر دیں تو ان کا پورا مضیاتی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ کیفیت، فیض کی کم و بیش تمام شاعری میں پائی جاتی ہے۔ اس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ فیض کے یہاں درد کا احساس بھی ایک شدید تخلیقی محرک ہے۔ دھیمی دھیمی آہ یا سلگنے کی کیفیت جس نے پوری شاعری میں سوگواری کی کیفیت پیدا کر دی ہے، اور جو رات، یاد، اور انتظار کی حسن کارانہ امیجری کے ساتھ مل کر انتہائی پُرکشش ہو جاتی ہے اور تاثیر کا جادو جگاتی ہے۔ اس سلسلے میں نظم ”درد آئے گا دے پاؤں“ ”کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہرائے“ (غبارِ خاطر محفل) یا ”مرے درد کو جو زباں ملے“ جیسی نظموں کو بھی دیکھ لیا جائے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ درد کی یہ کیفیت کلاسیکی غزل کے رسمی فراق یا رسمی ہجر کی کیفیت سے ملتی جلتی ہے یا اس سے الگ ہے۔ میرا خیال ہے مزاجاً یہ اُس سے بالکل مختلف ہے اور کچھ اور ہی کیفیت ہے:

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمھارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب سہرے رگزار چلے گئے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے کبھی اختیار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رنج و فدا، یہ رسن یہ دار کر دے گیا
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

یہ درد ایک لذت ہے، یہ تخلیقی خلش بھی ہے اور قوت بھی، کیونکہ گناہ گاروں کو جو عیش پر ناز ہے، اور محرومی اور رسوائی لائق فخر ہے۔ گویا یہ شوق کی فرادانی اور آرزوئے رُوئے جمیل کا لازمہ بھی ہے۔ یہ انداز اگرچہ کلاسیکی روایت میں بھی ملتا ہے لیکن فیض کا موقف قدرے مختلف ہے وہ یہ کہ غم کی شام اگرچہ لمبی ہے، ”مگر شام ہی تو ہے“ یعنی گزر جائے گی۔ جی جلانے یا دل بُرا کرنے کی ضرورت نہیں۔ غم کی شام کے ساتھ جینا بھی لازمہ جہدِ حیات ہے۔ غرض فیض کے یہاں درد کا جو تصور ہے وہ کوئی محدود شخصی درد نہیں بلکہ ایک شدید تخلیقی قوت ہے جو وسیع انسانی آفاقی ابعاد رکھتی ہے۔ یہ دردِ محبت ہی دراصل وہ بیج کی ارتفائی کرہی ہے جو فرسودہ عاشقانہ علامتِ کارخ عالم گیر سماجی یا سیاسی مفاہیم کے تازہ کارانہ جمالیاتی اظہار کی طرف موڑ دیتی ہے۔ یہ بیج کی کرہی نہ ہو تو اوپر جو ساختیں پیش کیے گئے تھے، ان سے رمیز یہ اور استعاراتی سطح پر جو ہمہ گیر سماجی سیاسی، معنیاتی نظام پیدا ہوتا ہے وہ تخلیق ہی نہ کیا جاسکے۔ ذرا ان اشعار کو دیکھیے :

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
 سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی
 کب جان لہو ہوگی، کب اشک گہر ہوگا
 کس دن تری شنوائی اے دیدہ تر ہوگی
 واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قائل ہے
 اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہوگی
 کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
 کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبر ہوگی

مطلعِ فالص عاشقانہ ہے، لیکن دو کے شعر ہی سے غزل کی سماجی معنویت کی گہری کھلنے لگتی ہیں

یہ کون 'دیدہ تر' ہے جس کی شنوائی کی بات کی جا رہی ہے، یا یہ کس گھڑی کا انتظار ہے جب جان لہو ہوگی جب اشک گہر ہوگا۔ یا شاعر کیسے شہر کا ذکر کر رہا ہے جس میں / واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قائل ہے / ان علام کے معنی کی جو تقلیب ہوئی ہے، اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مقطع دیکھیے یہ کس قامتِ جانانہ کا ذکر ہے جس کی راہ دیکھی جا رہی ہے۔ یہ بات معمولی قاری بھی جانتا ہے کہ یہاں قامتِ جانانہ سے گوشتِ پوست کا محبوب مراد نہیں:

کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معین ہے تجھ کو تو خسر ہوگی

(۶)

اس شاعری کی جمالیاتی کشش اور لطف و اثر کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں اگرچہ قامتِ جانانہ 'حشر'، 'دیدہ تر' وغیرہ علام کے معنی کی تقلیب ہو جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذہن و شعور یا دوسرے لفظوں میں ذوقِ سلیم، اس نوع کے رمز یا شکار کی لطافت سے صرف ایک معنیاتی سطح پر متاثر نہیں ہوتا۔ اگر ایسا سمجھا جاتا ہے تو یہ سادہ لوحی ہے۔ شاعری یا آرٹ سے لطف اندوزی کے مراحل میں بہت سے نفسیاتی امور ابھی تک علومِ انسانیہ کی زد میں نہیں آئے، تاہم اتنا معلوم ہے کہ ذہن و شعور معنیاتی طور پر کسی کسی سطحوں سے بیک وقت متاثر ہوتے ہیں۔ گویا قامتِ جانانہ، گوشتِ پوست کا محبوب بھی ہو سکتا ہے جو حسن و جمالِ زینبی و رعنائی کا مرقع ہے اور ذہن و شعور میں ایک روشن نقطہ بن کر چمکتا ہے، نیز بیک وقت وطن و قوم کا یا آزادی و انقلاب کا وہ تصور بھی ہو سکتا ہے جو ولولہ انگیز ہے اور سنگین حالات کا مقابلہ کرنے کی بشارت دیتا ہے۔

فیض نے ایک جگہ کہا ہے / ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے، ہم سے جتنے سخن تمہارے
 تھے / شعر میں سنوارنے کا عمل دراصل تقلیب کا عمل ہے۔ یہ تقلیب اعلیٰ شاعری کا بنیادی
 جوہر ہے / ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے / میں اشارہ دراصل گفتگو سے زیادہ سماعت کی
 طرف ہے، جو ذہنی تخلیقی عمل کی پہلی سیڑھی ہے۔ لیکن فیض کی شاعری میں بات صرف اتنی
 نہیں کہ خطاب محبوب کی جانب سے ہو یا وطن و قوم کی جانب سے، اور فن کی سطح پر اس کی
 شعری تقلیب ہوئی ہو، بلکہ یہ خطاب فن کار کی جانب سے بھی ہے، بنام محبوب اور بنام
 وطن یا انسان۔ اصل خوبی یہی ہے کہ یہ دونوں معنویاتی سطحیں ایک تخلیقی وحدت میں ڈھل
 جاتی ہیں، اور ذہن و شعور کو ایک ساتھ مل کر سرشار کرتی ہیں۔ فیض کی کامیابی کا سب سے
 بڑا راز یہی ہے کہ ان کے یہاں عاشقانہ سطح محض عاشقانہ سطح نہیں اور انقلابی سطح محض
 انقلابی سطح نہیں۔ فیض کی تمام شاہ کار نظموں یا غزلوں میں یہ امتیاز موجود ہے :

تم آئے ہو، نہ شب انتظار گزری ہے
 تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے . . . الخ

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
 موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام . . . الخ

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
 جو بچے ہیں سنگِ سمیٹ لوتنِ داغِ داغ لٹا دیا . . . الخ

قطع نظر ان نہایت عمدہ غزلوں کے اس سلسلے کی بہترین نظم ”نثار میں تری گلیوں کے“ ہے۔ اس کا
 سماجی سیاسی احساس اسی کے عنوان ہی سے ظاہر ہے، لیکن دیکھیے کہ وطنی و قومی احساس کو فیض
 کس طرح عاشقانہ اظہار عطا کرتے ہیں، اور عام فرسودہ عاشقانہ علامت کو کس طرح سماجی

سیاسی درد سے سرشار کر کے ایک ہمہ گیر جمالیاتی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ بات دیکھنے سے زیادہ محسوس کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس جمالیاتی سرشاری کی اکاؤڈ کا مثالیں فیض کے معاصرین کے یہاں بھی مل جاتی ہیں، لیکن یہ تقلیب کسی دوسرے کے یہاں اتنے بڑے پیمانے پر، اتنے ترفع اور جمالیاتی رچاؤ کے ساتھ رونما نہیں ہوئی جیسی کہ فیض کے یہاں ہوئی ہے۔ فیض کے یہاں یہ تخلیقی تقلیب دو طرفہ ہے۔ غور طلب ہے کہ دونوں طرف اس کی آمد و رفت کس آسانی اور سہولت سے جاری رہتی ہے، گویا یہ فیض کے شعری عمل کی وحدت کا ناگزیر حصہ ہے :

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
 چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سراٹھا کے چلے
 جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
 نظر چڑھ کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
 ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد
 کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور ساگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دست بہانہ جو کے لیے
 جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
 بنے ہیں اہل ہوس، مدعی بھی منصف بھی
 کیسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
 مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
 ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

طواف، جسم و جاں، اہل جنوں، اہل ہوس، مدعی، منصف، سب کلاسیکی روایت کے گھسے پٹے الفاظ ہیں، لیکن فیض نے انہیں کی مدد سے نئی شعری فضا خلق کی ہے، اور کیسے اچھوتے پیرایے میں اپنی بات کہی ہے :

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
 نہ اُن کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
 یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
 نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
 ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

مخاطب کی شانِ محبوبی تو پہلے بند ہی سے ظاہر ہے، لیکن تیسرے بند تک پہنچتے پہنچتے یہ تصور اور بھی نکھر کے سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد آگ میں پھول کھلانا، یا ان کی ہار اور اپنی جیت کی بشارت دنیا، فلک کا گلہ نہ کرنا، یا فراق یا میں دل بُرا نہ کرنا اسی جمالیاتی رچاؤ کی توسیعی شکلیں ہیں۔ فیض اپنے نئی رچاؤ اور جمالیاتی احساس کے معاملے میں غیر معمولی طور پر حساس تھے۔ فن ان کے نزدیک ایک مسلسل کوشش تھی۔ دستِ صبا کے دیباچے میں غالب کے اس خیال سے کہ جو آنکھ قطرے میں دجلہ نہیں دیکھ سکتی، دیدہ بنیا نہیں، بچوں کا کھیل ہے، بحث کرتے ہوئے فیض نے فن کے بارے میں لکھا ہے۔ . . ”طالب فن کے مجاہد کے کارن وان نہیں۔ فن ایک دائمی کوشش ہے، ایک مستقل کوشش۔ . .“ فیض کے یہاں فن کو ایک دائمی کوشش کے طور پر برتنے کا تخلیقی رویہ خاصا نمایاں ہے تبھی تو ان کے یہاں وہ رچاؤ اور کوشش پیدا ہو سکی جو دلوں کو مسحور کرتی ہے۔

(۷)

آخر میں یہ سوال اٹھانا بھی بہت ضروری ہے کہ یہ شاعری چونکہ تاریخ کی ایک لہر کے ساتھ پیدا ہوئی ہے، اور اس کے معنیاتی نظام کی سماجی سیاسی جہت یقیناً اپنے عصر سے نظریاتی غذا حاصل کرتی ہے تو کیا یہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ "وقتیا" سکتی ہے۔ یعنی DATED ہو سکتی ہے۔ ہنگامی شاعری کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا اثر بڑی حد تک زائل ہو جاتا ہے۔ وطنی قومی شاعری کا ایک حصہ طاق نسیاں کی نذر اسی لیے ہو جاتا ہے کہ وقت کی دیمک رفتہ رفتہ اُسے چاٹ لیتی ہے۔ شاعری اور آرٹ میں ہر وہ چیز جو صرف تاریخی شعور یا صرف سماجی معنی یا محض موضوع کے زور پر پروان چڑھتی ہے، یا زندہ رہنے کا دعویٰ کرتی ہے، اور فن پارے میں اپنا کوئی تخلیقی جوہر نہیں ہوتا تو وہ وقت کے ساتھ ساتھ کالعدم قرار پاتی ہے۔ البتہ اگر فن کار نے اپنے درجہ کمال سے اس میں کوئی جمالیاتی شان پیدا کر دی ہے، یا دو کے لفظوں میں خونِ جگر کی آمیزش کی ہے، اپنے فنی اخلاص سے کچھ ایسی مہر لگا دی ہے جو لطف و اثر کا سامان رکھتی ہے، تو ایسا فن پارہ زندہ رہنے کا امکان رکھتا ہے۔ یہ بات ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔ شام شہر ایڑاں میں جو آخری دور کا کلام ہے، پانچ شعر کی ایک مختصر سی غزل ہے، ملاقاتوں کے بعد، برساتوں کے بعد، فیض نے اسے نظمیں عنوان دیا ہے۔ "ڈھاکہ سے واپسی پر" اس عنوان کی بدولت اس غزل کا تاریخی تناظر ذہن پر ثبت ہو جاتا ہے۔ اگر یہ عنوان نہ ہوتا تو مطلع خالص تغزل کا رنگ لیے ہوئے ہوتا، لیکن عنوان قائم ہو جانے کی وجہ سے تمام اشعار تاریخ کے محور پر سانس لینے لگتے ہیں۔ دو کے شعر میں 'بے داغ سبزے کی بہار' اور 'جون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد' سے درد کی لہر واضح ہو جاتی ہے:

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
 پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد
 کب نظر میں آئے گی بے داغ سب سے کی بہار
 خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
 تھے بہت بے درد لمحے ختم دردِ عشق کے
 تھیں بہت بے مہربانی مہربان راتوں کے بعد
 دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
 کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد
 اُن سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کعبے
 اُن کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

مہربان راتیں، بے مہربانی، شکستِ دل، گلے شکوے، جاں صدقہ کرنا، اور اصل بات
 کا ان کہا رہ جانا، کون کہہ سکتا ہے یہ سب اظہارات شدید جمالیاتی رچاؤ نہیں رکھتے۔
 ظاہر ہے کہ فیض نے ایک خالص تاریخی سانچے کو جذبات کاری سے انتہائی ارفع اور ہمہ گیر
 جمالیاتی احساس میں ڈھال دیا ہے۔ فیض کے یہاں تاریخی شعور، یا سماجی احساس، یا
 انقلابی فکر، کوئی محدود اور وقتی چیز نہیں، بلکہ یہ جمالیاتی اظہار کی راہ پاک ایک عام
 انسانی آفاقی کیفیت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

فیض کی فکر انقلابی ہے، لیکن ان کا شعری آہنگ انقلابی نہیں۔ وہ اس
 معنی میں باغی شاعر نہیں کہ وہ رجز خوانی نہیں کرتے، ان کے فن میں سخن سنجی اور نرم
 آہنگِ نغمہ خوانی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ وہ اس درجہ کمال کے شاعر ہیں جہاں
 'برہنہ حروف ز کفتم کمال گو یائی است' شعری ایمان کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کا لہجہ
 غنائی ہے۔ اُن کا دل دردِ محبت سے چور ہے۔ ان کا شعری وجود اک روشن الاؤ
 کی طرح ہے جس میں دھیمی دھیمی آگ جل رہی ہے۔ اس کے سوزِ دروں میں سب

ہنگامی آلائشیں پھیل جاتی ہیں، اور جمالیاتی حسن کاری کی آئین سے تپ کر تخلیقی جوہر تابندہ و روشن ہو اُٹھتا ہے۔ فیض کی اہمیت اس میں ہے کہ انہوں نے جمالیاتی احساس کو انقلابی فکر پر قربان نہیں کیا۔ اور اس کا برعکس بھی صحیح ہے یعنی فیض نے انقلابی فکر کو جمالیاتی احساس پر قربان نہیں کیا۔ فیض نے اپنے تخلیقی احساس سے ایسی شعری وحدت کی تخلیق کی جس کی حسن کاری، لطافت اور دل آویزی تو احساسِ جمال کی دین ہے، لیکن جس کی درد مندی اور دل آسائی سماجی احساس سے آئی ہے۔ انہیں سب عناصر نے مل کر فیض کی شاعری میں وہ کیفیت پیدا کی ہے جسے قوتِ شفا کہتے ہیں۔ فیض کی شاعری کا نقش دلوں پر گہرا ہے۔ اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا سچا حصہ دھندلا جائے گا، تاہم اس کا ایک حصہ ایسا ہے جس کی تابندگی کم نہیں ہوگی، بلکہ اس کا امکان ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا نقش اور روشن ہوتا جائے گا :

ہم سہل طلب کون سے فریاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

(کراچی کے پاک و ہند فیض احمد فیض مذاکرے میں
مئی ۱۹۸۵ء میں پڑھا گیا)

عَالِي جِي كَمَن كِي آگ

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک خوبی دوسری خوبیوں کو دبا دیتی ہے، یا کوئی ایک بات اتنی اہم خیال کر لی جاتی ہے کہ دوسری بہت سی اہم باتیں پس پشت جا پڑتی ہیں۔ عالی جس طرح کسی سطحوں پر زندگی کرتے ہیں، ویسے ہی ان کی تخلیقیت کا اظہار بھی کسی سطحوں پر ہوتا رہا ہے۔ تاہم انھوں نے دوہا نگاری میں کچھ ایسا راگ چھیڑا ہے، یا اردو سائیکس کے کسی ایسے تار کو چھو دیا ہے، کہ دوہا ان سے اور وہ دوسے سے منسوب سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ دوہا تو ان سے پہلے بھی تھا (کیا بھرم کیا شرم پو دھر کیا کھچپ کیا بیال) لیکن 'عالی چال' سے انھوں نے دوہے کی جو بازیافت کی ہے اور اسے بطور صنف شعر کے اردو میں جو استحکام بخشا ہے، وہ خاص ان کی دین ہو کر رہ گیا ہے۔ عالی اگر اور کچھ زبھی کرتے تو بھئی یہ ان کی مغفرت کے لیے کافی تھا، کیونکہ شعر گوئی میں کمال توفیق کی بات سہی، لیکن یہ کہیں زیادہ توفیق کی بات ہے کہ تاریخ کا کوئی موڑ، کوئی رخ، کوئی نئی جہت، کوئی نئی راہ، چھوٹی یا بڑی، کسی سے منسوب ہو جائے۔ ایسا اگرچہ حادث ہو سکتا ہے، لیکن تاریخ میں کسی رجحان کو قائم کرنا محض حادث نہیں ہوتا، اس کے لیے مسلسل سوچ اور ذہن و شعور کا صرف لازم ہے۔ عالی لاکھ کہیں کہ انھوں نے دوہے کبت من کی آگ بجھانے کو کہے، لیکن شاعر کے ایسے بیانات اکثر گمراہ کن ہوتے ہیں، کیونکہ تخلیقی سفر بغیر ارادے و عمل یا سعی و جستجو کے طے نہیں ہوتا۔ لیکن کیا تخلیقیت صرف ایک سطح ہی پر ظاہر ہوتی ہے، غالباً اس کا کوئی

آسان جواب ممکن نہیں۔ اس لیے کہ جو ذہن ایک سطح پر کارگر ہوتا ہے، وہی دوسری سطح پر بھی کام کرتا ہے۔ ذہن وہی ہوتا ہے، میڈیم بھی وہی ہوتا ہے، لیکن ہر سطح کے مطالبات الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ ان مطالبات کو پورا کرنے کی اظہاری قوت اگرچہ تخلیقیت ہی سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اس کا ایک رخ اظہاری مناسبت بھی ہے۔ ایسا نہ ہو تو پھر کیا وجہ ہے کہ غزل میر وغالب سے منسوب ہو گئی، قصیدہ سودا و ذوق سے اور مرثیہ امیس و دبیر سے۔ وہی غالب جو سخنوران پیشینی سے بازمی لے جانے کے لیے بے قرار رہتے ہیں، مرثیے کے باب میں صاف اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہیں (ملاحظہ ہو نسخہ عرشی بحوالہ سرور ریاض: "یہ حصہ دبیر کا ہے۔ وہ مرثیہ گوئی میں فوق لے گیا۔ ہم سے آگے نہ چلا، ناتمام رہ گیا" (ص ۳۸۸)۔ غور فرمائیے وہی غالب جو بالعموم کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، ایک ہم عصر کا لوہا مان رہے ہیں۔ اسی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب فن کار کی اپنی پہچان قائم ہو جاتی ہے تو وہ دوسروں کی ناند میں منہ مارنا پسند نہیں کرتا۔ اسی حقیقت کا ایک اور رخ دیکھیے۔ سودا قصیدے کے بادشاہ سہی، لیکن غزل میں ہیٹے نہیں۔ اسی طرح میمنوی میں اور امیس رباعی میں بھی چمک اٹھتے ہیں۔ غرض تخلیقیت اصناف کے آرا پار بھی جاسکتی ہے۔ موجودہ دور میں میراجی کو یحییٰ، ان کے گیتوں پر نظموں کو فوقیت حاصل ہے یا نظموں پر گیتوں کو، اسی طرح فیض کو غزل کے زمرے میں رکھیے گا یا نظم کے یا دونوں کے، جمیل الدین عالی نے خود اپنے ساتھ بے انصافی یہ کی کہ جب وہ دوہے میں چل نکلے اور جب ان کو زحمان ساز کی حیثیت اختیار ہو گئی تو خود انھوں نے غزل کے پلڑے کو سبک کر دیا۔ خدا بھلا کرے قبول عام کا اور مشاعروں کی مقبولیت کا کہ دوہوں پر تو داد کے ڈونگرے برسائے گئے، لیکن ان کی غزل کے لطف سخن کی طرف گوشہ چشم سے بھی التفات نہ کیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ عالی کی اپنی مصروفیات بھی آڑے آئی ہوں یا کچھ اور بھی وجوہ رہے ہوں۔ بہر حال غزل پر توجہ کم ہوتی گئی۔ میرا خیال ہے کہ کم از کم ۱۹۵۸ء یعنی پہلے مجموعے "غزلیں دوہے گیت" کی اشاعت تک یہ بات نہ تھی۔ کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ عالی دونوں تینوں اصناف کو ساتھ ساتھ لے کر چل رہے تھے، یا کم از کم ان کا ارادہ یہی تھا، بلکہ غزلوں کی رفتار کہیں زیادہ تھی۔ پہلے مجموعے میں غزلیں نترنوا صفحوں پر آئی ہیں، اور دوہے ان سے ایک چوتھائی جگہ پر صرف پچیس پچیس صفحوں میں ہیں۔ بہر حال کیفیت اور کمیت الگ الگ مسائل ہیں۔ یہاں سر دست

یہی بحث اٹھانی مقصود ہے کہ غزل میں عالی کی تخلیقیت کس درجے پر ہے، اور اس کی نوعیت کیا ہے
اگر غزلوں کا بنظرِ عائر مطالعہ کیا جائے تو جگہ جگہ ایسے اشعار دامنِ دل پر ہاتھ ڈالتے ہیں :

کوئی نہیں کہ ہو اس دشت میں مراد مساز
ہر ایک سمت سے آتی ہے اپنی ہی آواز

کسے خبر کہ یہ سرگرم رہروانِ حیات
رداں دواں ہیں تو کیا کیا فریب کھائے ہوئے

کیوں آگیا ہے ضبط و سلیقہ خطاب میں
اس شدتِ خلوصِ فراواں کو کیا ہوا

ہمارا نام بھی رکھیے فسانہ خوانوں میں
کہ ہم بھی اپنے سوانح نگار گزرے ہیں

کچھ نہ تھا یاد بجز کارِ محبت اک عمر
وہ جو بیگڑا ہے تو اب کام کئی یاد آئے

کہیں تو ہوگی ملاقات اے چمن آرا
کہ میں بھی ہوں تری خوشبو کی طرح آوارا

ان اشعار کے لطفِ سخن سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ خیال کی تازگی، اظہار کی خوش سلیقگی،
تجربے کی ندرت سب اپنی جگہ پر، لیکن ہر شعر میں کچھ ایسا نکتہ، کچھ ایسی بات ہے جو سوچنے پر مجبور

کرتی ہے اور کسی نہ کسی پر لطف کیفیت سے دوچار کرتی ہے۔ خواہ دشت میں سناٹے کا منظر ہو یا محبت میں ناکامی کے بعد کاموں کا یاد آنا، یا خلوص کی کمی سے خطاب میں ضبط و سلیقے کا در آنا، یا کسی چمن آرا کی تلاش میں خوشبو کی طرح بکھر جانا، لگتا ہے شاعر غزل کے جمالیاتی رچاؤ میں ڈوبا ہوا ہے، اور انوکھا مضمون پیدا کرنے اور دل کو چھو لینے والی بات کرنے کا سلیقہ رکھتا ہے۔ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ غزل صنف ہی ایسی ہے کہ دوچار شعر تو ہر کسی کے یہاں سے نکالے جاسکتے ہیں۔ ایسا ہے تو آئیے، اور چمن غزل کا صرف مطلع درج کیا گیا، اس کو تمام و کمال دیکھا جائے تاکہ معلوم ہو کہ عالی کتنے پانی میں ہیں :

کوئی نہیں کہ ہو اس دشت میں مراد مساز
ہر ایک سمت سے آتی ہے اپنی ہی آواز
کبھی طلسم غرور اور کبھی نسون نیاز
ادائے سادگی دوست تیری عمر دراز
کھلایہ دوست نوازی اہل ذوق سے راز
کہ قدر کے لیے کافی نہیں لبِ اعجاز
خزاں میں منظر گل درد ناک ہے لیکن
یہیں سے ہے مری رودادِ شوق کا آغاز
یہ لب جو لشنہ ہے اک آہِ مختصر کے لیے
اسی میں تھے کبھی لاکھوں فسانہ ہائے دراز
رہا نہ دل میں غم تنگی گلستاں سے
وہ ولولہ جسے کہتے ہیں طاقت پرواز
کس انجن میں دل سادہ کو سکون ملے
کہیں ہے قید حقیقت کہیں ہے قید مجاز
یہ ایں فسر دہِ دلی کیا غضب ہے اے عالی
مجھے دیے چلی جاتی ہے زندگی آواز

غزل پڑھنے کے بعد میرے دل کے اس چور کا اندازہ ہوا ہو گا کہ اس غزل کا انتخاب ہی اسی لیے کیا گیا کہ عالی کی غزل کی تخلیقی اور اظہاری صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا جاسکے۔ تنقید موضوعی عمل اسی لیے ہے کہ جو چیز مجھ کو پسند نہیں، اس پر میں آپ کا اور اپنا وقت ہی کیوں ضائع کروں گا۔ غالب نے سخنِ فہمی کو طرفداری سے الگ کر کے نکتہ پیدا کیا ہے، لیکن درحقیقت طرفداری اور سخنِ فہمی میں جدلیاتی رشتہ ہے۔ طرفداری نہ ہوگی تو سخنِ فہمی کس چیز کی ہوگی، اور سخنِ فہمی نہ ہوگی تو طرفداری کیونکر ممکن ہو پائے گی، گویا ان دونوں میں وہی رشتہ ہے جو موضوعیت اور حروریت میں ہے، یعنی ایک کے بغیر دوسرے کو قائم ہی نہیں کیا جاسکتا۔ سینکڑوں صفحات کی قرأت کے بعد کسی غزل یا شعر کا انتخاب، طرفداری ہے لیکن یہ طرفداری مبنی ہے لطف اندوزی پر اور لطف اندوزی ممکن نہیں بغیر سخنِ فہمی کے۔ بہر حال سخنِ فہمی میں قاری کو شریک کرنا تنقیدی منصب ہے، لیکن میر دست اس کے تمام مراحل طے کرنا نہ میرا منشا ہے نہ مقصد۔ بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ جو شخص اس پائے کی غزل کہہ سکتا ہے جیسی اور درج کی گئی، کیا اس کو غزل گوئی میں کسی اعتذار کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے پوری غزل کا اظہاری سانچہ کسا ہوا ہے۔ اصوات و الفاظ کی خوش ترکیبی کے باوجود کے دشت میں دمسازی کی طلب، ادائے سادگی، دوست میں طلسمِ غرور اور فسوںِ نیاز دونوں کا احساس، یا دوست نوازی اہل ذوق سے رازوں کا کھلنا یا قدر کے لیے لبِ اعجاز کا ناکافی ہونا، یا مقطع میں زندگی کا آواز دینے جانا ایسی تہہ در تہہ کیفیتیں ہیں جن میں ہر ایک سے الگ الگ بحث ممکن ہے۔ لیکن فی الوقت فقط اس شعری منطق کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے جس کی بدولت یہ سارا معنیاتی نظام قائم ہوتا ہے۔ تو آئیے سب سے پہلے مطلع پر غور کیجیے۔

پہلے مصرع میں نفی کا منظر نامہ ہے، یعنی 'دشت'، میں کوئی 'دساز' نہیں اور ستائے کی کیفیت ہے، جب کہ دوسرے مصرع میں اس کا رد یعنی مثبت کیفیت ہے، اور ہر ایک سمت سے آتی ہے اپنی ہی آواز، گویا اثبات سے نفی اور نفی سے اثبات کا وجود ہے، یعنی حقیقت پر تدریج ہے، یا بات صرف اتنی نہیں جو بادی النظر میں محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں شاعر، ادائے سادگی، دوست، کی درازی عمر کی دعا مانگتا ہے۔ یہاں بنیادی علم 'سادگی' ہے۔ اسے 'طلسمِ غرور' اور 'فسوںِ نیاز' کے ساتھ رکھ کر دیکھیے۔ اگرچہ 'طلسمِ غرور' اور 'فسوںِ نیاز' خود ایک دوسرے کا رد ہیں، لیکن یہ دونوں مل کر پہلے مصرع میں 'سادگی' کا رد ہیں۔ غرض یہاں بھی اثبات

دلفی میں وہی تخلیقی تناؤ ہے جو مطلع کی معنویت کی بھی جان ہے۔ تیسرے شعر کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ دوست نوازی اہل ذوق سے یہ راز کھلا کہ قدر کے لیے کافی نہیں لبِ اعجاز یہاں دوست نوازی اہل ذوق اور لبِ اعجاز دونوں التفات کا مثبت استعارہ ہیں۔ لیکن قدر کے لیے کسی چیز کا کافی نہ ہونا نفی کا پہلو رکھتا ہے۔ اشعار کے مفاہیم الگ الگ سہی، لیکن شعری منطق میں سوچ کی کچھ ایسی نہج ہے جو ہر شعر میں خاص طرح کا معنوی تناؤ پیدا کرتی ہے۔ چوتھے شعر کو دیکھیے خزاں میں منظرِ گل، کا درد کا ہونا ایک کیفیت پیدا کرتا ہے، لیکن یہیں سے ہری رودادِ شوق کا آغاز، پہلے مصرعے کے منفی منظر کو ایک خوش کن مثبت تصور میں بدل دیتا ہے۔ پانچویں شعر میں وہی لب، جس پر کبھی لاکھوں فسانے تھے، (مثبت) آج اک آہِ مختصر کے لیے تشنہ ہے (نفی)۔ اسی طرح چھٹے شعر میں 'غم تنگی، گلستاں، اور ولولہ یا قلاتا پرواز میں، نیز انجن، اور دلِ سادہ، یا قیدِ حقیقت، اور قیدِ مجاز، میں تضاد کی وہی نسبت ہے، یا سوچ کا وہی پیرا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ مقطع نے پوری غزل کے فکری تناؤ کو ادھر بھی شدید کر دیا ہے :

برایں فسرده دلی کیا غضب ہے اے عالی
مجھے دے چلی جاتی ہے زندگی آواز!

ظاہر ہے کہ مقطع معنویاتی طور پر مطلع سے جڑا ہوا ہے، اور خاموشی کا پہلا سا منظر ہے۔ قطع نظر اس کے کہ 'فسرودہ دلی' (نفی) اور 'زندگی' کے آواز دینے (مثبت) میں کیسا گہرا ربط و تضاد ہے؛ یہ غزل جو دشت میں گہرے سناٹے کی کیفیت سے شروع ہوئی تھی، زندگی کی آواز کی گونج پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں حالی کی کیا تخصیص ہے، اس شعری منطق کا تو تغزل سے خاص رشتہ ہے یا اس منطق کی مثالیں تو مشاہیر کے یہاں بھی مل جائیں گی۔ بالکل بجا، بس یہی تو میں بھی کہنا چاہتا ہوں کہ عالی اگر چاہیں تو ان کی قدرتِ اظہار، جمالیاتی رجحان اور فکری بالیدگی ایسا درجہ کمال رکھتی ہے کہ تغزل کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے اور ہوتی رہی ہے۔

اکاد کا اشعار میں کسی کیفیت کا بل جانا کوئی انوکھی بات نہیں، لیکن تغزل کی جس خاص شعری منطق کی طرف اشارہ کیا گیا، اس کا کسی غزل کے تمام اشعار میں یا زیادہ تر اشعار میں پایا جانا

اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ شاعر کی تخلیقیت غزل کی روایت کے جمالیاتی رچاؤ سے گہری مناسبت رکھتی ہے۔

اس کا اندازہ ہو چکا ہو گا کہ ہم موضوعیت سے گزر کر معروضیت کی زمین پر اچکے ہیں۔ یعنی طرفداری سے گزر کر سخن فہمی کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔ لیکن آخر الذکر کے تقاضے بہت شدید ہیں، جبکہ اول الذکر میں آسانی ہی آسانی ہے۔ تاہم یہ بات معمولی نہیں کہ جس نوع کی شعری منطق کی بات کی جا رہی ہے، عالی کے یہاں وہ کئی کئی غزلوں میں مسلسل نظر آتی ہے۔ اتفاق سے دو غزلیں آٹھ سائے ہیں۔ ان سے صرف نظر کرنا صرف اسی شخص کے لیے ممکن ہے جو ایمان کو داؤں پر لگا سکتا ہو:

نہ میں بیاضِ سحر ہوں نہ میں سوادِ شبی
بس ایک آہ مگر وہ بھی آہِ زیرِ لبی
چھلک سکا ہے نہ اب تک جو اشکِ نیمِ شبی
اسی میں ہیں ترے سب خندہ ہائے زیرِ لبی
سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ رازِ مسلکِ شوق!
کبھی وفا طلبی ہے کبھی جفا طلبی
سخن میں تکنت و ضبطِ شوق کے احکام
مگر نظر میں وہی شوخی و خطا طلبی
منا نہیں کبھی غالب کا ذکر اے عالی
یہی ہوا ہے ہمیشہ مالِ خوش لقمی

اگر آپ ان اشعار کو غور سے پڑھ چکے ہیں، تو اوپر جو بحث اٹھائی جا چکی ہے، اس کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ اشعار بھی اس شعری منطق سے خالی نہیں جس کی خصوصیت پر اصرار کیا جا رہا ہے۔ ایک قطب 'بیاضِ سحر' ہے تو دوسرا قطب 'سوادِ شبی' اور اگر ان دونوں کو ایک معنیاتی قطب تصور کیا جائے تو ان کا رد 'آہِ زیرِ لبی' میں ملے گا۔ اسی طرح دوسرے شعری 'خندہ ہائے زیرِ لبی' (مثبت)

کا یہی رشتہ اشکِ نیم شبی (منفی) کے ساتھ ہے۔ تیسرے شعر کو لیجیے تو اس میں دو کسر مصرعے کے 'وفا طلبی' اور 'جرفا طلبی' دونوں غزلیہ روایت کے قدیمی متضاد اور مربوط تصورات ہیں، مربوط اس لیے کہ دونوں کا مرجح محبوب کی ذات ہے، اور ان دونوں کے رد و قبول کا منطقی رشتہ پہلے مصرع کے 'مسک شوق' سے ہے جو معنیاتی طور پر مثبت تصور ہے۔ یہی کیفیت چوتھے شعر میں بھی ہے، یعنی 'شوخ' و 'خطا طلبی' کی معنویت قائم ہوتی ہے 'تسکنت و ضبط شوق' سے جو منفی ہے۔ اس غزل کے بعد بھی اگر یہ مقدمہ واضح نہ ہوا ہو تو چلتے چلتے ایک غزل اور بھی دیکھ لیجیے، اور اس دعوے کے ساتھ کہ یہ پہلی دونوں غزلوں سے کم پڑا اثر نہیں۔

وہ آہ نیم شبی ہو کہ گریہ سحری
ہر ایک کاوشِ دل کا مال بے اثری
جہاں میں رہ کے رسومِ جہاں سے بے خبری
ہمیں ہی وجہِ ضرر ہے ہماری بے ضرری
مری بھی حدِ محبت تری بھی حدِ رستم!
مری بھی کم نظری ہے تری بھی کم نظری
ہر اک مقامِ میسر ہے یادِ جاناں میں
اسی میں باخبری ہے اسی میں بے خبری!
ہزار اشکِ یہاں بہ گئے مگر عالی
چمک رہا ہے ابھی تک ستارہ سحری

یہ مطلع بھی پورے کا پورا اسی شعری کیفیت سے لبریز ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ "آہ نیم شبی" اور "گریہ سحری" میں جو رشتہ ہے، واضح ہے۔ دو کسر مصرعے میں یہی کیفیت نہ صرف 'کاوش' اور 'مال' میں ہے، بلکہ 'کاوش' اور 'بے اثری' میں بھی اسے دکھایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح دو کسر شعر میں 'وجہِ ضرر' اور 'بے ضرری' پر بھی غور کر لیجیے۔ نیز اس پر بھی

کہ 'رسوم جہاں' اور 'بے خبری' میں کیا رشتہ ہے، یا ان رشتوں اور مناسبتوں سے شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ تیسرے شعر میں 'سحر محبت' اور 'سحر مستم' توجہ طلب ہیں۔ آگے چل کر 'مری بھی کم نظری ہے تری بھی کم نظری' میں 'کم نظری'، بظاہر یکساں معلوم ہوتا ہے، لیکن دراصل یکساں نہیں، کیونکہ پہلی کم نظری جس کا مرجع عاشق کی ذات ہے، اس کا مثبت ہونا مسلم ہے۔ چوتھے شعر میں 'با خبری' اور 'بے خبری' کا ربط اسی منطق کا پتہ دیتا ہے۔

اس مختصر تجزیے میں میں نے بہت سی تفصیل اور فروعی اور ذیلی مقامات عمدہ اچھوڑ دیے ہیں، اس لیے کہ جس مقدمے کا پیش کرنا مقصود ہے، اس کے لیے اتنا تجزیہ کافی ہے، اور اگر کسی کے لیے اتنی بحث نا کافی ہے تو پھر اس کے لیے کوئی بحث کافی نہیں۔ کیونکہ بات کو کتنا کیوں نہ بڑھایا جائے، نتیجہ یہی برآمد ہوگا۔ یہ شعری منطق اگر تخلیقیت میں بمنزلہ جوہر کے جاگزیں نہ ہوتی تو شاعر اس درجہ جمالیاتی اظہار پر قادر ہو ہی نہیں سکتا۔ دو چار شعر تو اتفاقاً ہو سکتے ہیں، لیکن پوری غزل میں ان کیفیات کا موج تہہ نشیں بن کے رواں دواں رہنا یا نئے اور انوکھے تخیلی محرکات فراہم کرنا معنی دار ہے۔ اسی لیے بعض غزلوں کو تمام وکمال لیا گیا تاکہ تخلیقیت کی ہر موج سامنے آجائے اور کوئی بھی پہلو نظر انداز نہ ہو۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ عالی اگر چہ رہن ستم ہائے دوہا ہو چکے ہیں اور 'دوہا' ان سے اور یہ 'دوہے' سے منسوب ہو چکے ہیں، اور ان کے چاہنے والوں نے ان کی پہچان بھی دوہے ہی سے قائم کر لی ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی تخلیقیت کو غزل کے جمالیاتی رچاؤ سے بھی سچی مناسبت ہے، اور اس میں بھی جہاں انہوں نے شعری ارتکاز سے کام لیا ہے، ان کا فن درجہ کمال پر ملتا ہے۔ اس سے کس کو انکار ہے کہ 'دوہے' کبت کہہ کہہ کر عالی من کی آگ بجائے، لیکن اسی میں غزل کو اور شامل کر لیجیے۔ ہم تو بہر حال صرف تمنا ہی کر سکتے ہیں کہ من کی یہ آگ دھڑ دھڑ جلتی رہے تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں :

بغیر مرکز امید و بے سکون دروں
میں اک خلا ہوں جو ثابت بنے نہ سیارا

شہریار

نئی شاعری اور اس کا اعظم

حال ہی میں بعض نئے شاعروں نے اردو کا رشتہ ایک بار پھر ادب کے عالمی رجحانات سے جوڑ دیا ہے۔ ان میں سے وہ رجحانات خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو جدید دور کے ثقافتی انتشار، آدرش کے فقدان اور انسان کے بے چہرہ ہونے کے تصور سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے زیر اثر جو نئی شاعری لکھی جا رہی ہے، وہ نئی نسل کے اس انسان کی آواز ہے جس کے پاس نہ اقدار کا سرمایہ ہے، نہ آدرش کا آئینہ۔ اور جس کا وجود خود اس کے لیے ایک سوالیہ نشان بن گیا ہے۔ یہ ہر طرح کی دنیا نو سیت اور روایت کے خلاف ہے۔ اسے ایک ایسا باغی کہا گیا ہے جس کا کوئی آئیڈیل نہیں۔ اردو شاعری جدید دور کے اس جملہ وطن انسان سے حال ہی میں متعارف ہوئی ہے۔ وہ لوگ جو ردایتی سیمرخ کی طرح وقت کی ریت میں سر دباؤں رہتے ہیں، ان کو پہلی نظر میں یوں معلوم ہو گا کہ یہ عجیب الخلق انسان جو ہر وقت بے تکے خواب دیکھتا ہے، جو ہر وقت ہر اس نظر آتا ہے، جو بات بات پر چونک اٹھتا ہے اور جو نہ سوتا ہے نہ جاگتا ہے، شاید کسی دوسری دنیا سے یہاں آ گیا ہے، جہاں وہ بالکل تنہا محسوس کرتا ہے اور جہاں اسے ہر شے اجنبی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اگر ہم ایمان داری سے اپنے گرد پیش پر نظر ڈالیں اور ہم عصر تہذیب کے انتشار اور اضطراب کو سمجھنے کی کوشش کریں تو معلوم ہو گا کہ یہ آسیب ہمارے دور کی خصوصیت بن چکا ہے۔ ہمارا زمانہ کلچر کے زوال، قدروں کی پامالی اور یقین کے فقدان کا زمانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ احساس

پہلے مغرب میں عام ہوا، بعد میں مشرق میں پہنچا — مشرق و مغرب میں جو فرق پہلے تھا، وہ آج بھی ہے۔ لیکن صنعتی تہذیب کے فروغ کی وجہ سے آج پورے عالم انسانیت کے ذہنی مسائل تقریباً ایک سے ہیں اور انسان کو ہر کہیں تقریباً ایک جیسے خطرات کا سامنا ہے۔

نئے اثرات کے تحت لکھی جانے والی شاعری مواد اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے پچھلی شاعری سے اس قدر مختلف ہے کہ پرانی ادبی اصطلاحوں اور کٹیوں کی مدد سے اسے نہ سمجھا جاسکتا ہے اور نہ سمجھایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر یہ کہا جائے کہ یہ روایت سے انحراف کی شاعری ہے، یا یہ باغیانہ شاعری ہے یا یہ کہ اس میں ایک مانتی لے ملتی ہے تو یہ اس شاعری سے انصاف نہ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ پُرانے تنقیدی لیبل اس پڑھیک نہیں بیٹھتے۔ کیونکہ یہ مقصدیت کی شاعری ہے، نہ نرمی ہیئتیت کی، یہ نہ داخلیت کی آواز ہے نہ خارجیت کی۔ غم دوراں اور غم جانال کی تقسیم بھی یہاں بیکار نظر آتی ہے۔ یہ فرار یا اقرار کی شاعری بھی نہیں۔ یہ تو محض انسان کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کی جستجو ہے یا غم اور مسرت کو محض غم اور مسرت سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اور صنعتی ترقی نے اپنے ارتقا کا ایک دائرہ ختم کر لیا ہے اور انسان کو پھر ایک نئے چیلنج کا سامنا ہے لیکن یہ چیلنج اس چیلنج سے مختلف ہے جب آج سے تقریباً دو سو سال پہلے سائنس نے انسان کو ایک نئی قوت، توانائی اور نئی زندگی کی بشارت دی تھی، اس وقت انسان ایک دوراں پر کھڑا تھا۔ ایک راستہ مذہبیت کا تھا، دوسرا عقلیت کا۔ ایک قدامت کی طرف جاتا تھا، دوسرا صنعتی ترقی و مادی راحت و فراغت کی طرف۔ اور انسان کو ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ لیکن اب حالت دوسری ہے۔ اب ہم دوراں پر نہیں کھڑے ہیں کہ دو میں سے ایک راستے کا انتخاب کر سکیں؛ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جس راستے پر ہم چل رہے تھے، اُس کی آخری حد تک پہنچ گئے ہیں اور سامنے ہر طرف دھند ہی دھند ہے۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے انسان نے یقین اور اعتماد کی شمعوں کو کیسے کیسے فروزاں نہیں رکھا اور محنت و کوشش سے کیا کیا نہیں کیا؟ اس نے قدرت کی کلائیوں کو مروڑا، پہاڑوں کے جسگر چیرے، سمندروں کو مٹھی میں بند کیا، دریاؤں کے رُخ بدلے، صحراؤں کو چمن زاروں اور چمن زاروں کو جنتِ ارضی کے نمونوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔ صنعتی تہذیب کی انگلی پکڑا کر وہ تمول اور مادی آسائش کے آخری زینے تک بھی جا پہنچا، لیکن اس کے دل کی ویرانی کم نہیں ہوئی، بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوا۔ اور

میکانکی زندگی کے کیسے پن اور تیز رفتاری میں وہ خود کو بھی کھو بیٹھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ نئے طاقتور صنعتی وسائل اور ساز و سامان سے اس کی تمام مشکلیں آسان ہو جائیں گی اور اس کے سب مسائل حل ہو جائیں گے، اُمیدوں کا وہ طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ زندگی آج بھی موت کے مُنہ میں ہے۔ مسرت آج بھی گریزاں ہے، نگاہوں کی تشنگی، دل کے درد اور روح کے کرب کا آج بھی وہی عالم ہے۔ زندگی پر غم کا سنگین پہرہ آج بھی ہے۔ حسرت آج بھی خون کے آنسو روتی ہے، اور اربانوں کی بارگاہ آج بھی کھلتی ہے۔

ہمارے دور کا سب سے بڑا المیہ صنعتی زندگی کی حشر سامانی ہے۔ اس سے پیدا ہونے والے خلفشار میں زندگی اپنی وحدت کے احساس سے محروم ہو چکی ہے۔ زندگی کی ابتدا اور انتہا کا سراغ نہ پا سکنے اور اپنے وجود کا نصب العین نہ سمجھ سکنے کا احساس پہلے سے کئی گنا بڑھ چکا ہے۔ نیست و بود یا زندگی اور موت کے درمیان جو کشمکش جاری ہے۔ اس کا بھی انسان کو پہلے سے زیادہ احساس ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی خوشی و غم پر قادر نہیں۔ قدم قدم پر اُسے ہاں اور نہیں یا جینے اور مرنے یا مٹنے اور نہ مٹنے کے درمیان فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور یہ فیصلہ اُسے اکیلے ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس کی پوری ذمہ داری خود اس کے سر ہے۔ گو انسان کو اس فیصلے کا پورا اختیار ہے، لیکن یہ اختیار بجائے خود ایک جبر بن گیا ہے کیوں کہ انسان جب تک زندہ ہے وہ اس سے بچ نہیں سکتا۔ گویا یہ ایسی مہلیب ہے جس پر انسان کا وجود ہر وقت لٹکا ہوا ہے۔ اس ذہنی اضطراب میں زندگی کی کوئی چیز ویسے نظر نہیں آتی جیسے وہ اب تک نظر آیا کرتی تھی۔ نہ روشنی روشنی معلوم ہوتی ہے، نہ تاریکی تاریکی۔ نئی نسل کے برافروختہ انسان کی دُنیا میں نہ کوئی جفاؤں کے ستم ڈھاتا ہے، نہ کوئی وفادوں کے گیت گاتا ہے۔ وصل و فراق، کامرانی و ناکامی، خوشی و غم سب بے معنی اور گزراں معلوم ہوتے ہیں۔ عجیب بے حسی اور عجیب احساس کا عالم ہے۔ یہ بے حسی اور احساس اُس بے حسی اور احساس سے یقیناً مختلف ہیں جن کے لغوی اور رواجی معنوں سے ہمارے ذہن آشنا ہیں۔ یہ احساس ایک طرح کی آگہی بھی ہے۔ نئی شاعری اسی بے نام بے حسی اور آگہی کی شاعری ہے۔ یہاں اس سے متعلق مزید گفتگو کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ شہر یار کے مجموعہ کلام اسمِ اعظم سے ان دو نظموں کو ایک نظر دیکھ لیا جائے :

لازوال سکوت

مہیب ، لمبے ، گھنے پیڑوں کی ہری شاخیں
 کبھی کبھی کوئی اشلوک گنگنائی تھیں
 کبھی کبھی کسی پتے کا دل دھڑکتا تھا
 کبھی کبھی کوئی کوئیل درود پڑھتی تھی
 کبھی کبھی کوئی جگنو اکھ جگاتا تھا
 کبھی کبھی کوئی طاٹر ہوا سے لڑتا تھا
 کبھی کبھی کوئی پر چھائیں چنچ پڑتی تھی
 اور اس کے بعد مری آنکھ کھل گئی میں نے
 سر ہانے رکھے ہوئے تازہ روزنامے کی
 ہر ایک سطر بڑے غور سے پڑھی لیکن
 خبر کہیں بھی کسی ایسے حادثے کی نہ تھی
 اور اس کے بعد میں دیوانہ وار ہنسنے لگا
 اور اس کے بعد ہر اک سمت لازوال سکوت
 اور اس کے بعد ہر اک سمت لازوال سکوت

سائے کی صوت

دن کا دروازہ ہوا بند شب تارا آئی
 راستے کروٹیں لینے لگے
 گلیوں میں اُداسی چھائی

سارے ہنگامے وہ سب رونقیں (دن کی ہمزاز)

گونگی جیلوں میں ہوئیں قید

چلو اب نکلیں

اپنی تنہائی کے اس خول سے باہر

دیکھیں

اپنا سایہ کہاں جاتا ہے شبِ تار میں آج

کون سی یادوں کو چمکاتا ہے

کس پل کو صداد تیا ہے

آج کیا کھوتا ہے، کیا پاتا ہے

کس طرح بڑھتا ہے، گھٹتا ہے، بکھر جاتا ہے

کیسے مرجاتا ہے؟

شہر یار کے یہاں ان سے بھی بہتر نظمیں ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا، لیکن ابھی ہم نئی شاعری کی فضا کی بات کر رہے تھے، وہ ان نظموں میں تمام و کمال موجود ہے۔ ان نظموں میں جس احساس کی کا زفرمانی بلتی ہے، وہ آگہی کی چوٹ کھائے ہوئے ہے۔ انسان کو اپنے سفر ارتقا میں آج تک جن جن کامیابیوں اور ناکامیوں کا سامنا رہا ہے، یہ آگہی ایک لحاظ سے ان سب کا حاصل ضرب ہے۔ یہ صدیوں سے دیکھے ہوئے خوابوں کی شکست کی آواز ہے۔ اس نے آرزوؤں کے آنسو چنے ہیں، ماضی کو تاریکی کے غار میں اترتے پایا ہے اور یادوں کے قافلوں کو سکوت کے سمندر میں غرق ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

یہ شاعری لفظ "تصویراتی" کے گھسے پٹے معنوں میں تصویراتی نہیں، بلکہ اس معنی میں تصویراتی ہے کہ اس کی اپنی ایک الگ دنیا ہے اور اس کا اپنا ایک موضوع ہے جس کی کوئی حدود نہیں اور جس کی کوئی بندھی ہوئی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ اس شاعری کی اپنی کچھ علامتیں ہیں جو اسے معنویت عطا کرتی ہیں۔ میرے نزدیک اس شاعری کا جیسا اظہار شہر یار کے یہاں ہوا ہے، اس میں بنیادی اہمیت چار علامتوں کو حاصل ہے: خواب، آگہی، وقت اور موت۔ ان علامتوں پر ہمیں بخوبی یا روایتی معنی مسلط کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ ان

کے معنی وہی مراد لینے ہوں گے جو یہ شاعری خود انھیں عطا کرتی ہے اور جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔ ان میں ایک طرف خواب اور آگہی سے پیدا ہونے والے تصورات میں کشمکش ہے تو دوسری طرف وقت اور موت سے پیدا ہونے والے تصورات ایک دوسرے کے تدریجاً متقابل ہیں۔ اگر ان چار علامتوں کی نبردِ ادبی حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے تو شہرہ یار کے ہاں استعمال ہونے والی باقی تمام علامتیں ان ہی کے پیچھے ہنسی بستہ نظر آئیں گی۔ سب سے پہلے نظم ”خواب“ کو لے لیتے:

نغمگی آرزو کی بکھری ہے
رات شرما رہی ہے اپنے سے
ہونٹ اُمید کے پھڑکتے ہیں
پاؤں حسرت کے لٹکھڑاتے ہیں
دور پلکوں سے آنسوؤں کے قریب
نیند دامن سمیٹے بیٹھی ہے
خواب تعبیر کے شکستہ دل
آج پھر جوڑنے کو آئے ہیں

اس حسین نظم کے آٹھ مصرعوں میں سات چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے: آرزو، رات، اُمید، حسرت، نیند، تعبیر اور خواب۔ اور یہ سب کے سب تصورات خواب کے ذیل میں آتے ہیں، جو اس نظم کا عنوان بھی ہے اس کے بعد ان دونوں کو غور سے پڑھیے:

فَرِیْبِ دَرِ فَرِیْبِ

دن کے صحرا سے جب بنی جاں پر
ایک مہم سا آسرا پا کر

ہم چلے آئے ایک طرف اور اب
رات کے اس اتھاہ دریا میں
خواب کی کشتیوں کو کھیتے ہیں!

ایک منظر

نیند کی سوئی ہوئی خاموش گلیوں کو جگاتے
گنگناتے
مشعلیں پلکوں پہ اشکوں کی جلائے
چند سائے
پھر رہے تھے
رات جب ہم خواب کی دنیا سے واپس آ رہے تھے

ان دو نظموں میں سے پہلی نظم لفظ ”دن“ سے شروع ہوتی ہے جو آگہی کی علامت ہے اور خواب کے تصور پر ختم ہوتی ہے جو آگہی کی نفی ہے۔ اس طرح ”ایک منظر“ میں لفظ ”سایہ“ علامت ہے شعور انفرادی کی یا زخم خوردہ حساس انسان کی۔ آخری مصرع میں خواب کا ذکر ہے جسے شعور کے تدمقابل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ گویا اس شاعری میں ایک طرف خوابوں، آرزوؤں اور امیدوں کی دنیا ہے اور دوسری طرف آگہی و حقائق کی۔ ان دونوں میں ایک طرح کی POLARIZATION یعنی ربط و تضاد ہے۔ یہ شاعری مواد کی سطح پر اپنا حسن اسی کشمکش اور تضاد سے حاصل کرتی ہے۔ یہ شاعری چونکہ تنہائی اور شعور کی دھوپ میں تھلسی ہوئی ہے، اس لیے اس کی نظریں سکون عافیت کے لیے زیادہ تر ”رات“ کی طرف اٹھتی ہیں۔ ”رات“ اور ”خواب“ کے سلسلے کے دو کے امیجز میں ”نیند“ اور ”ہتہاب“ قابل ذکر ہیں۔ آگہی کی دنیا میں ہتہاب کے مقابلے میں ”سورج“، ”نیند“ کے مقابلے میں ”جاگتی آنکھوں“ اور ”رات“ کے مقابلے میں ”دن“ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ کی

سب سے کثیر الاستعمال علامت "سایہ" ہے۔ گو یہ لفظ اپنے رواجی معنوں میں یعنی دھوپ کی نفی یا گوست، عافیت یا سکون و راحت کے لیے بھی استعمال ہوا ہے (ملاحظہ ہو نظم آشوب آگہی) لیکن علامت کی حیثیت سے "سایہ" کا استعمال "خواب" کی ضد کے طور پر یا زندگی کے سب کے برابر ہوتوں بے بس انسان کے لیے یا شعور انفرادی کے لیے ہوا ہے جیسا کہ اوپر "ایک منظر" یا "سائے کی موت" میں دیکھا گیا، یا اس مختصر نظم سے ظاہر ہے:

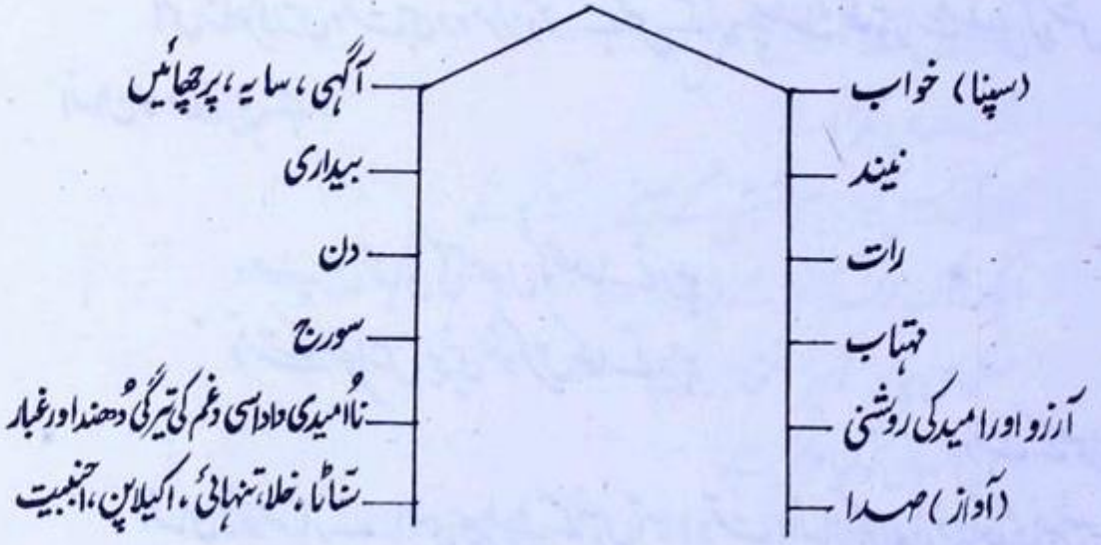
ایک رات کا منظر

ہچکیوں کے بیچ و خم کے سلسلے
 آہٹوں کے گھٹتے بڑھتے دائرے
 آنسوؤں سے تر بتر تہائیاں
 دھند میں بلوس کچھ سرگوشیاں
 زرد رُو نہتاب اور گرما کی رات
 آسماں کی سمت اک سائے کے ہاتھ

یہ نظم اس قابل ہے کہ اس کا شمار شہر یاری کی حسین ترین مختصر نظموں میں کیا جائے۔ اس میں جتنے امیجز آئے ہیں وہ سب کے سب علامتی طور پر "سایہ" سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس شاعری میں "سایہ" کے علامتی معنوں میں بعض جگہ لفظ "پرچھائیں" بھی استعمال ہوا ہے (ملاحظہ ہو نظم پرچھائیاں)، آگہی کی "دنیا" دن کے عذاب کی "اور" سورج "اور" دھوپ کی "دنیا" ہے۔ جبکہ "خواب" کی "دنیا" "نیند" "رات" اور "نہتاب" کی "دنیا" ہے۔ یہ "آرزو" اور "امید" کی روشنی کا مسکن ہے جبکہ آگہی کی "دنیا" میں "ناامیدی"، "اداسی" اور "غم" ہے۔ آگہی کی "دنیا" کو "دشت" اور "صحرا" سے بھی تشبیہ دی گئی ہے، جس میں ہر طرف "خلا" ہی "خلا" اور "سناٹا" ہی "سناٹا" ہے۔ انسان یہاں "جنبی" ہے

اور "تنہائی" کا احساس اُسے کھائے جاتا ہے اور خواب کی دُنیا سے کوئی "صدا" یا "آواز" اس تک نہیں آتی۔ خواب اور آگہی کی ان دو دُنیاؤں میں جو چنیر ربط قائم رکھے ہوئے ہے، وہ "وقت" ہے۔ اب اس کی مدد سے امیجز کے ان دو سلسلوں کے باہمی ربط و تضاد کو یوں ظاہر کیا جاسکتا ہے:

وقت (لمحہ، پل)



یہ وقت ہی ہے جو خواب اور آگہی اور نیند اور بیداری اور رات اور دن میں ایک گونہ تعلق قائم رکھے ہوئے ہے۔ وقت نہ ہو تو ان کی POLARIZATION یعنی باہمی ربط و تضاد باقی نہ رہے۔ اس شاعری میں وقت ہی کو "زلزلیت کا حاصل اور حقیقت" قرار دیا گیا ہے:

اندھے دن کو گونگی رات سے کیا نسبت ہے
 گھائل چاند کی گہنائی کرنوں کا سایہ
 اس دھرتی کو کیوں بھاتا ہے
 سورج کی سرشار شعائیں
 اس دھرتی کو کیوں ڈستی ہیں
 ہر کل کیوں اس آج کے پیکر میں ڈھلتا ہے
 اور انسان کو آج اور کل سے کیا ملتا ہے

کیوں ہم فانی اور امر ہیں
 پل، لمحے، دن، سال اور صدیاں
 یہ سب باتیں بہکی سی ہیں
 لیکن اپنی زسیت کا حاصل اور حقیقت صرف یہی ہیں

اس شاعری میں وقت ہی وہ مرکز و محور ہے جس کے گرد یہ سلسلہٴ تصورات مسلسل گردش میں ہے۔
 انسان کا مقدر یہی ہے :

دھوپ میں تنہائی کی جسموں کو جھلساتے رہو
 وقت کے صحرا میں یونہی ٹھوکریں کھاتے رہو

(وقت کے صحرا میں)

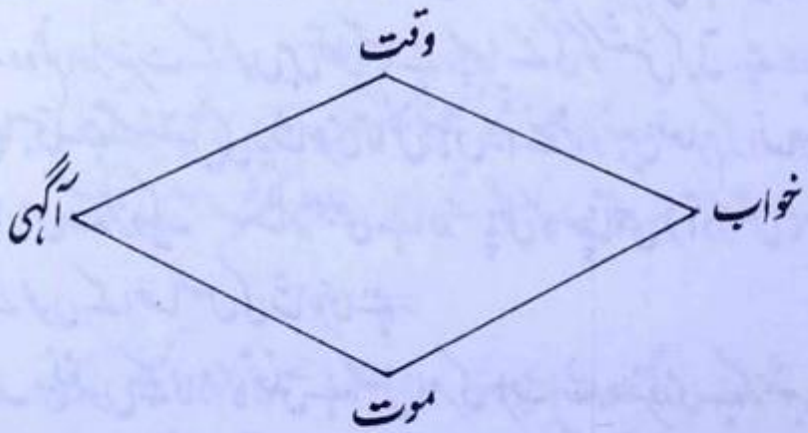
انسان لاکھ سہارے، ماضی پھر پلٹ کے نہیں آتا (وقت) انسان کو امر و زفر داکہی خبر نہیں۔ یہ دونوں
 اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ (افسونِ امر و زفر)۔ ماضی اندھیرا ہے اور مستقبل غبار کے علاوہ کچھ نہیں۔ جو کچھ ہے وہ
 حال ہے اور حال میں بھی لمحہٴ حالیہ۔ انسان دراصل لمحہٴ بلحہ ہی جیتا ہے۔ ("تضاد"، "مداوا")
 جس طرح وقت خواب و آگہی کے سلسلے کو قائم رکھے ہوئے ہے اسی طرح وہ چیز جو اسے منقطع کر دیتی ہے،
 وہ "موت" ہے۔ موت وقت کی نفی ہے۔ زندگی میں وقت کے تدریجی مقابل اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ "موت"
 ہی ہے۔ جتنی بڑی حقیقت وقت ہے، اتنی ہی سنگین حقیقت موت بھی ہے۔ ملاحظہ ہو نظم "قبرستان" سے
 یہ اقتباس :

جہاں ہم سے خلوت گزیدہ گنہگار بندوں کی
 اک انجمن ہے
 زین کا وہ حصہ حقیقت ہے ارض و سما کی
 خودی کی خدا کی

موت ایک ایسا سچا ہے جو اس دور کے عذاب و کرب کے لیے شفا کا بیجا مانتا ہے۔ یہ انفرادی ذمہ داری کے کھائے جانے والے احساس اور باشعور زندگی بسر کرنے کے لیے کمپیا کا کام کرتی ہے۔ خیا نچہ شاعر زہر کو اس دور کا "نیا امرت" قرار دیتا ہے :

دواؤں کی الماریوں سے سچی اک دوکان میں
 مریضوں کے انبوہ میں مضمحل سا
 اک انسان کھڑا ہے
 جو اک نیلی کبڑی سی شیشی کے سینے پر لکھے ہوئے
 ایک اک حرف کو غور سے پڑھ رہا ہے
 مگر اس پر تو "زہر" لکھا ہوا ہے
 اس انسان کو کیا مرض ہے
 یہ کیسی دوا ہے ؟

موت کے ذکر کے ساتھ ساتھ ، اس شاعری کا سلسلہ تصورات مکمل ہو جاتا ہے۔ اب اس کو مربوط طور پر یوں پیش کیا جاسکتا ہے :



یہاں قاری کے ذہن میں لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ یہ شاعری اپنی نوعیت کے اعتبار سے مثبت ہے یا منفی ؟ تنو علی ہے یا رجائی ؟ اس سوال کا یہ جواب کچھ عجیب سا معلوم ہوگا۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ ان الفاظ

کے پرانے معنی میں یہ شاعری نہ قنوطی ہے نہ رجائی۔ اس سے نہ مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں نہ منفی۔ یہ سوال اکثر اس لیے اٹھایا جاتا ہے کہ ہم شاعری کے بارے میں روایتی طور پر مقصدی اور اصلاحی نقطہ نظر سے سوچنے کے عادی ہو چکے ہیں اور اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ شاعری حالی و مسرت کے دور سے لے کر اقبال و جوش و جگر تک کی شاعری سے اس لحاظ سے بالکل مختلف ہے کہ یہ براہ راست سماجی سیاسی نوعیت کی نہیں۔ یہ دور آگہی کے آشوب کا دور ہے۔ آج کا انسان اپنے شعور کے ہاتھوں پریشان ہے۔ اس کے دکھ درد اور غم کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ اس کی الجھنیں اور مسائل بھی کھیلے دور کے انسان کی الجھنوں اور مسائل سے مختلف ہیں۔ اور ان کا کوئی حل ابھی اس دور کے انسان کو نہیں سوجھا۔ اس لیے یہ شاعری تلاج کی یا پیغام کی شاعری نہیں۔ یوں اس کے بعض جواب یا کوس کن ہیں اور اس لحاظ سے اگر کوشش کی جائے، تو اس میں مثبت اور منفی عناصر الگ الگ تلاش کر کے دکھائے جاسکتے ہیں، لیکن ان سے کوئی واضح فیصلہ اخذ کرنا مناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ اس شاعری کی معنوی وحدت کو مجروح کرنے اور اس کے ایک حصے کو نظر انداز کر کے دوسرے کو پیش کرنے والی بات ہوگی۔ افسوس ہے کہ اس طرح کی چند کوششیں کی بھی گئی ہیں جو ہر لحاظ سے معصومانہ ہیں اور ہماری ہمدردی کی مستحق ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ یہ شاعری بنیادی طور پر اس دور کے زخم خوردہ انسان کی اندرونی پیاس، روحانی کرب اور شعوری الجھنوں کی شاعری ہے۔ یہ ایک طرف خواب و آگہی اور دوسری طرف دقت و موت کی قوتوں کے درمیان کشاکش کی شاعری ہے، اور زندگی کی معنویت کی تلاش میں سرگرم عمل ہے۔ یہ زندگی کے اصلی چہرے کو جیسا کہ وہ غم اور مسرت کے لمحوں میں نظر آتا ہے، پہچاننے کی کوشش کرتی ہے اور حال کے لمحے حالیہ میں جنیبا چاہتی ہے۔ مستقبل کی یہ شاعری قابل نہیں۔ اسے خود نہیں معلوم کہ انسان کی اگلی منزل کیا ہوگی۔ سنسار اس کے نزدیک "سنسار" بھی ہے اور "پاگل کا سپنا بھی" (آدرش) چنانچہ یہ شاعری مسرت اور غم کے لمحوں کے احساس کی شاعری ہے۔

جہاں تک ان نظموں کے فارم کا تعلق ہے اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ شہر یار نے بے معنی جدت طرازی سے کام نہیں لیا جو اکثر نئے شاعروں کا طرہ امتیاز ہے لیکن جس سے غیر ضروری اشکال پیدا ہوتا ہے اور کلام سے لطف و اثر جاتا رہتا ہے۔ شہر یار نے اس سلسلہ میں روایت اور جدیدیت کے امتزاج کو ملحوظ رکھا ہے۔ ان کی مختصر نظمیں تکنیک کے اعتبار سے نہایت کامیاب ہیں ان میں سے "خواب"

”فریب در فریب“ اور ”ایک منظر“ کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ ان کے علاوہ مجموعے سے ”پرچھائیاں“ اور ”قرب قیامت“ بھی ملاحظہ فرمائی جائیں۔ یہ تمام نظمیں معنوی وحدت کے اعتبار سے مکمل اکائیاں ہیں اور موضوع کے تاثر کو ابھارنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

آخر میں شہر یار کی غزلوں سے چند اشعار دیکھیے، ان میں نئی شاعری کے ان تمام عناصر کی کار فرمائی ایک بلیغ اشارت اور ایمائیت کے ساتھ ملے گی، جن کا ذکر نظموں کے سلسلے میں اوپر کیا جا چکا ہے:

دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حس و بے جان سا کیوں ہے
ہم نے تو کوئی بات نکالی نہیں غم کی!
وہ زود پشیمان، پشیمان سا کیوں ہے

زبان لی بھی تو کس وقت بے زبانوں کو
سنانے کے لیے جب کوئی داستاں نہ رہی

لوگ سر پھوڑ کر بھی دیکھ چکے
غم کی دیوار ٹوٹتی ہی نہیں

ہوا کا بھونکا بھی جس راہ پر نہیں آتا!
نہ جانے کس لیے اس راہ پر کھڑے ہیں لوگ

عجیب چیز ہے یہ وقت جس کو کہتے ہیں
کہ آنے پاتا نہیں اور بیت جاتا ہے

یہ کیا جگہ ہے دوستو، یہ کون سا دیار ہے
 حد نگاہ تک جہاں غبار ہی غبار ہے
 ہمیں تو اپنے دل کی دھڑکنوں پہ بھی یقین نہیں
 خوشا وہ لوگ جن کو دوسروں پہ اعتبار ہے

ہزار پرکششِ غم کی مگر تہ اشک ہے!
 صبا نے ضبط یہ دیکھا تو لاجواب ہوئی

ہمیں تو یاد تھی بے مہری جہاں یوں بھی
 بہانہ مل گیا اس کو ترے تغافل کا

بے تاب ہیں اور عشق کا دعویٰ نہیں ہم کو
 آوارہ ہیں اور دشت کا سودا نہیں ہم کو
 یا ترے علاوہ بھی کسی شے کی طلب ہے
 یا اپنی محبت پہ بھروسہ نہیں ہم کو

جو چند لمحے وقت نے دیے ہیں ان کا کیا کریں
 درِ حبیبِ وا نہیں، درِ حیاتِ بند ہے

عجیب سا رخ مجھ پر گزر گیا یارو!
 میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو!
 وہ کون تھا، وہ کہاں تھا، کیا ہوا تھا اُسے
 سنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو!

نذرانہ تیرے حسن کا کیا دیں کہ اپنے پاس
 لے دے کے ایک دل ہے سو ٹوٹا ہوا سا ہے

جب بھی ملتی ہے مجھے اجنبی لگتی کیوں ہے
 زندگی روز نئے رنگ بدلتی کیوں ہے

ان اشعار میں جو انفرادیت اور تازگی ہے وہ عام قسم کی انفرادیت اور تازگی سے مختلف ہے۔
 ان میں نئے تغزل کی جوئے ہے، وہ نئی نسل کے شاعروں کے یہاں عام ہوتی جاتی ہے۔ اس سے جہاں
 صنفِ غزل سے ہماری محبت کا پتہ چلتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزل بھی اس کے بدلے میں بڑی
 فیاضی سے کام لیتی ہے اور ہمیشہ ہماری محبت کو کھئی گنا بڑھا کر سمیں واپس کر دیتی ہے۔

نئی غزل کا جواں مرگ شاعر: بانجی

کسے معلوم تھا کہ نئی غزل کا طہدار اور تازہ گو شاعر بانجی اتنی جلدی موت کی آغوش میں چلا جائے گا۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۱ء کی شب میں دہلی کے ہولی فیمیلی ہسپتال میں بانجی نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اب جبکہ بانجی اس دنیا میں نہیں ہے، چند سوانحی شخصی حقائق کو محفوظ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، بانجی کا پورا نام، راجندر منچند تھا۔ وہ نومبر ۱۹۳۲ء میں ملتان میں پیدا ہوئے اور ان لوگوں میں سے تھے جنہیں تقسیم کی موج بہا کر دہلی لے آئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ دہلی کی ادبی، ثقافتی زندگی کے طوفان اور تہلکوں اور دلولہ نیز یوں میں بانجی خوب خوب شریک رہے۔ چوڑا ناک، نقشہ، کھلتا ہوا زنگ، گٹھا ہوا کسرتی بدن، آج سے چند برس پہلے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا باصحت نمونہ نوجوان دکھتے ہی دکھتے گل گل کر اپنی اصل کا نقش موہوم بھی نہیں رہ جائے گا، اور عین اس وقت جب اس کی غزل کی تازگی اور طہداری شباب پر ہوگی، موت کی پرچھائیں اس کو گھیر لے گی۔ بانجی نے ایم۔ اے۔ معاشیات میں کیا تھا اور جب تک صحت نے ساتھ دیا، وہ ڈیرہ اسماعیل خاں برادری کے ایک معمولی اسکول میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ کئی برس سے گٹھیا اور گردوں کی شدید تکلیف کی وجہ سے وہ رخصت پر تھے اور انتقال کے وقت ان کی عمر انچاس برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ اگرچہ مرض انتہائی تکلیف دہ اور اذیت ناک تھا اور کیسا کیسا دکھ بانجی نے نہ اٹھایا ہوگا، موت کا زرتا ہوا بھیا ناک سایہ، دوستوں کی بے التفاتی، اپنوں اور

بیگانوں کی بے توجہی، چھوٹے چھوٹے بچے، سہارے معدوم، اٹھنا بیٹھا، کھانا پینا، سونا جانا سب خواب و خیال، کون سا دکھ ہے جس کا سامنا بانی نے نہ کیا ہوگا، لیکن حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہ آیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ نئی غزل کی کیسی کیسی ممتاز شخصیتیں کم عمری میں جدا ہو گئیں، ناصر کاظمی، ابنِ اشا، خلیل الرحمن اعظمی، شکیب جلالی اور اب بانی۔ ان سب نے اپنے اپنے طور پر کشتِ شعر کو سرسبز و شاداب رکھا، اور نئی فصلوں کا پتہ دے گئے۔ بانی کا پہلا مجموعہ ”حرفِ معتبر“ ۱۹۷۲ء میں اور دوسرا ”حسابِ رنگ“ ۱۹۷۶ء میں منظرِ عام پر آیا تھا، اور تیسرا ”شفقِ شجر“ ۱۹۸۳ء میں پس از مرگ شائع ہوا۔



بانی کے لہجے کی تازگی اور توانائی اور خود اعتمادی کے دفور نے جس کا اظہار رشتہ متکلم پر اصرار سے جڑا ہوا تھا، بہت جلد سب کو متوجہ کر لیا تھا۔ وہ ایسے غزل گو کی حیثیت سے سامنے آئے تھے جسے اپنے ذہن و شعور اور زبان و ذات پر پورا بھروسہ تھا، ہجوم سے الگ رہ کر قدم بڑھانے کا حوصلہ ان میں شروع سے تھا۔ ان کی فکری جولانی اور جودت طبع بہت جلد انھیں تعقل کی اُن کھلی فضاؤں میں لے آئی، جہاں ذہن و احساس حیات و کائنات کے ازلی سُروں کے زیرِ دہم سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ بانی کی شاعری محبت کی جسمانیّت یا اس کے جذباتی رومانی پہلو سے بڑی حد تک پہلو تہی کرتی ہے۔ نئی غزل کے شعرا میں شاید ہی کوئی دوسرا شاعر ہو، جس نے جسم و جمال کے تذکرے اور حواس کی تھر تھرا ہٹوں سے اس حد تک صرفِ نظر کیا ہو، اور اس کے باوجود اپنی غزل کو نگاہوں کا مرکز بنا لیا ہو۔ بانی صحیح معنوں میں نئی غزل کے نوکلاسیکی شاعر ہیں۔ ان کے بیشتر معاصرین نے اس امر پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ان کے یہاں ”جذبہ و احساس و فکر و فن کا ایسا فطری استحلال پایا جاتا ہے کہ ذہن اس کی پیچیدگی پر عرشِ عرش تو کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے اجزا کو پوری طرح تحلیل مشکل ہی سے کر سکتا ہے۔“ یہ بات کسی بھی اچھی شاعری کے لیے کہی جاسکتی ہے کیونکہ تخلیقی عمل کے تمام اجزا کی تحلیل ممکن نہیں، اور کسی بھی تخلیق کے تمام مضمرات تک پہنچنا شاید کسی کے بھی بس کی بات نہیں۔ تاہم اس کے امتیازی عناصر تک رسائی حاصل کرنا ممکن ہے اور اس سے کسی شاعر کی انفرادیت یا شعری مزاج کی پہچان کا مسئلہ وابستہ ہے، اس سلسلے میں بانی کی بعض غزلوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے :

ہم ہیں، منظر سیاہ آسمانوں کا ہے
 اک عتاب آتے جاتے زمانوں کا ہے
 ایک زہرابِ غم، سینہ سینہ سفر
 ایک کردار سب داستانوں کا ہے
 کس مسلسل افق کے مقابل ہیں ہم
 کیا عجب سلسلہ امتحانوں کا ہے
 پھر ہوئی ہے ہمیں میٹوں کی تلاش
 ہم ہیں، اڑتا سفر اب ڈھلانوں کا ہے
 کون سے معرکے ہم نے سہ کر لیے
 یہ نشہ سا ہمیں کن تکانوں کا ہے
 سب چلے دور کے پانیوں کی طرف
 کیا نظارہ کھلے بادبانوں کا ہے

ان اشعار میں آسمانوں اور زمانوں کا ذکر، سینہ سینہ سفر، مسلسل افق، امتحانوں کا سلسلہ،
 نئی میٹوں کی تلاش، اڑتا سفر، اندھی اڑانوں کا شوق، معرکے سر کرنے کی آرزو، دور کے پانیوں
 اور کھلے بادبانوں کے معنوی انسلالات توجہ طلب ہیں۔ ان میں نئے امکانوں کی جستجو کی ایک شدید
 فکری خلش ہے، لیکن ممکن ہے کہ یہ کیفیت صرف اسی غزل سے مخصوص ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ
 باقی کے کلام کے بعض اور حصوں کو بھی دیکھا جائے :

سیر شبِ لامکاں اور میں
 ایک ہوئے رفتگاں اور میں
 سانسِ خلدوں نے لی، سینہ بھر
 پھیل گیا آسماں اور میں

سر میں سلگتی ہو، تشنہ تر
 دم سے اُلجھت ادھواں اور میں
 دونوں طرف جنگلوں کا سکوت
 شور بہت درمیاں اور میں
 خاک دخلا بے چراغ اور شب
 نقش دنوا بے نشاں اور میں

یہ کلمت محسوس ہوتا ہے کہ ہم کھلی فضا میں آگئے ہیں اور زمین و آسمان کی لا محدود وسعتوں سے گلے مل رہے ہیں۔ سیرِ شبِ لامکاں، خلاؤں کا سانس لینا، آسمان کا پھیل جانا، جنگلوں کے سکوت کا شور، خاک دخلا کا شب میں بے چراغ ہونا، نقش دنوا کا بے نشان ہو جانا اور بے کراہی کے اس تناظر میں سر میں سلگتی ہو اور دم سے اُلجھت دھوئیں میں تنگ و تاز کا عمل اور ”اسمِ ابد کی تلاش طویل“ کا سلسلہ ہونا کیا ان اشعار کی تخلیقیت میں زمین و آسمان کی وسعتوں سے ہم کلامی کی کوشش فراواں کی وہی کیفیت نہیں ملتی جو پہلی غزل میں سامنے آئی تھی۔ غزل کے اشعار میں کسی کیفیت کا مسلسل ملنا اس کی خامی نہیں، خوبی ہے۔ پہلی غزل ان کے مجموعے ”حسابِ رنگ“ کے شروع سے لی گئی تھی، دوسری غزل نسبتاً وسط سے تھی۔ اب ایک غزل آخر سے بھی دیکھ لی جائے:

ہمیں، لپکتی ہوا پر سوار، لے آئی
 کوئی تو موج تھی دریا کے پار لے آئی
 وہ لوگ جو کبھی باہر نہ گھر سے جھانکتے تھے
 یہ شب انھیں بھی سر رہ گزار لے آئی
 افق سے تا بہ افق پھیلتی بکھرتی گھٹا
 گئی رتوں کا چمکتا غبار لے آئی
 میں دیکھتا تھا شفق کی طرف، مگر تہلی
 پروں پر رکھ کے عجب رنگ زار لے آئی

زمین و آسماں کا جو ربط و تعلق پہلے کی دو غزلوں میں تھا، وہ یہاں مطلع میں موج و دریا اور ہوا میں ہے، اس کے علاوہ اس غزل کی معنویت میں موسم اور صبح و شام کے رنگین سپکروں کو بھی خاصا دخل ہے، انق تا برافق پھیلنا، بکھرتی گھٹنا، رتوں کا چمکتا غبار، اُداس شام کی یادوں بھری سلگتی ہوا، شفق، تسلی، رنگ زار، یہ سبھی رنگت زمین اور آسماں دونوں کے بنیادی رشتے سے پوری طرح مربوط ہے۔ بانی کے کلام سے کسی غزلیں ایسی پیش کی جاسکتی ہیں جن کی بنیادی کیفیت یہی ہے۔ اس سلسلے میں ذیل کے اشعار پر بھی نظر ڈال لی جائے جن میں بانی کی تخلیقیت کو بھرپور اظہار کے مواقع میسر آئے ہیں:

خاک و خون کی وسعتوں سے باخبر کرتی ہوئی
اک نظر امکاں ہزار امکاں سفر کرتی ہوئی

پاؤں تلے آنچ سی تشنہ زمینوں کی تھی
سر پہ نظارہ عجب اڑتے سحابوں کا تھا

کچھ نہ کچھ میرا یہاں چاروں طرف بکھرا پڑا ہے
پھول سے ہتھاب تک سب سلسلہ محفوظ کر لے

خود چاک باطن خبر ایک لمحہ
عالم بہ عالم سفر ایک لمحہ
لرزاں ہے کبکے لہو کے انق پر
زہراب میں تر یہ تر ایک لمحہ
پھیلے خلاؤں میں دیکھا کیے ہم
ڈھونڈا کیے ہم دگر ایک لمحہ

کیا ان اشعار کی رُوح میں جھانکنے سے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ کوئی تڑپ ہے جو کسی گھٹن سے نکل کر کھلی فضا میں بے پناہ ہو جانا چاہتی ہے یا تخیل کی کوئی موج بے تاب ہے جو سیرِ شبِ لامکاں کے لیے نکل کھڑی ہوئی ہے۔ سفر کے لفظی اور معنوی انسلالات میں اندھا سفر، اڑتا سفر، سینہ سینہ سفر، راستہ خیمہ گرد، نیر اُٹان کے ساتھ آزاد اُڑانوں، اونچی اُڑانوں، کھلے آسمانوں اور خلاؤں کے سینہ بھرنا س لینے کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ نئے پانیوں، امکان کی موجوں، کراں تا کراں پھیلی ہوئی فضاؤں ریتوں اور رنگوں اور جسموں کی من مانی کی تمثالیں ذہن کو آسمانوں کے نیچے کھلی فضاؤں میں لے جاتی ہیں، لیکن آزادہ رُوح جس اور تحرک کی اس بنیادی کیفیت کو رد کرتی ہوئی ایک اور کیفیت بھی بانی کے یہاں ملتی ہے۔ یہ اتنی زیادہ نمایاں تو نہیں لیکن اتنی کم نمایاں بھی نہیں کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ دوسری کیفیت کاوش و غلش کے بنیادی جذبے سے بُری طرح ٹکراتی ہے:

کیا کہوں کیا تھی اُڑان خود میں خبر میں نہ تھا
 گم شدگی کے سوا کچھ بھی سفر میں نہ تھا
 آج دکھائی دیا جانے یہ کیا فاصلہ
 تجھ کو خبر اس کی ہو، میری نظر میں نہ تھا
 ادھ کھلی کھڑکی سے ہم دستیں دیکھا کیے
 گھر سے نکلتے نہ تھے، چین بھی گھر میں نہ تھا
 سارے مکاں، لامکاں خالی و بے نقش تھے
 برق، خلا میں نہ تھی، سانپ کھنڈریں نہ تھا
 ریت بنی خود سراب رنگ بنا خود گلاب
 کوئی بھی منظر کہ خواب، میرے اثر میں نہ تھا

اُڑان، سفر، فاصلہ، دستیں، مکان، لامکاں، خلا، یہ سارے تلامذات تو اسی بنیادی کیفیت کی تصدیق و توثیق کرتے ہیں جو اس سے پہلے کے اشعار میں سامنے آچکی ہے، یعنی سفر، رُئی رشتوں اور اُڑان آسمانی رشتوں کی خبر دیتی ہے، لیکن اس غزل میں چند اور معنیاتی نشان نما (SEMANTIC)

بھی ہیں جن سے ایک متضاد کیفیت ابھرتی ہے، مثلاً گم شدگی، مکان و لامکان
کا خالی و بے نقش ہونا، برق کا خلائ میں اور سانپ کا کھنڈر میں نہ ہونا اور ان سب سے بڑھ کر ریت،
سراب اور منظر و خواب کا اثر میں نہ ہونا، یہ تمام استعارے اور سچے منفیت سے مملو ہیں :

آج اک لہر بھی پانی میں نہ تھی
کوئی تصویر روانی میں نہ تھی
دولہ مصرعہ ادل میں نہ تھا
حرکت مصرعہ ثانی میں نہ تھی
کوئی آہنگ نہ الفاظ میں تھا
کیفیت کوئی معانی میں نہ تھی
خوش یقینی میں نہ تھا اب کوئی نور
صو کوئی خندہ گمانی میں نہ تھی

ایک اور غزل کا مطلع ہے :

عکس کوئی کسی منظر میں نہ تھا
کوئی بھی چہرہ کسی در میں نہ تھا

بانی کے یہاں دھند، دھواں، غبار، دود کی استعاراتی تکرار بھی اسی معنوی حواسگی کے
ساتھ ہے، ان غزلوں کو مزید دیکھیے :

میں ایک بے برگ و بار منظر کمر بر مہنہ میں سنسناہٹ تمام پنج پوش اپنی آواز کا کفن ہوں
مخاز سے لوٹتا ہوں نصف تن سیاہی میں اپنا ٹوٹا ہوا عقیدہ اب آپا اپنے لیے وطن ہوں

دریدہ منظر می کے سلسلے گئے ہیں دوزخ
پلٹ چلو نظر ارہ زوال کرنا یاد گے

خاک میں خوشبو نہ تھی، گلیوں میں جگنو نہ تھے
خالی دتہا تھے ہم، شہر خدا بوں کا تھا

اک دھواں ہلکا ہلکا سا پھیلا ہوا ہے افق تا افق
ہر گھڑی اک سماں ڈوبتی شام کا ہے افق تا افق
سینکڑوں دشتیں چمکتی پھر رہی ہیں کراں تاکراں
آسمان نیلی چادر سی تانے پڑا ہے افق تا افق

بانی نے صاف صاف بھی کہہ دیا ہے :

اندر اندر یک بیک اٹھے گا طوفانِ نفی
سب نشاطِ نفع، سب رنجِ ضرر لے جائے گا

”حرفِ معتبر“ کے بیشتر نقادوں نے ”نظارہ لاسمیت“ کو بانی کا ”مقدر“ کہا تھا اور ان کے اشعار کی مدد سے زندگی کی لاطائلیت کے ادراک و احساس کو فخریہ پیش کیا تھا۔ ہمارے نزدیک بانی کے بارے میں اس سے زیادہ غلط بات کہی نہیں جاسکتی۔ بلاشبہ ان اشعار کی حاوی کیفیت منفیت کی ہے، لیکن ان کو بانی کے تمام کلام سے الگ کر کے دیکھنا غلطی ہوگی۔ اگر انھیں بانی کی پوری شاعری سے مربوط کر کے دیکھا جائے تو اس سوال کا جواب آسانی سے دیا جاسکتا ہے کہ اس طوفانِ نفی کی اصل نوعیت کیا ہے اور جس سلسلہ فکر کا یہ ایک مقام ہے، اس کی اس سے پہلی اور اس سے اگلی کڑی کیا ہے۔ مثال کے طور پر اسی پہلے مطلع کو لیجیے! میں ایک بے برگ و بار منظر... کفن ہوں وطن ہوں، اور اس کا مقابل اسی غزل کے مقطع سے کیجیے :

عدم زوال ایک تیرگی ہے کسی افق سے سحر نہ ہرگز طلوع ہوگی کہاں تلک منتظر رہو گے!
کہ میرے سینے میں لاکھوں شمعوں سا ہے الاؤ مجھی سے یہ روشنی نکالو کہ اک یہاں میں ہی شب شکن ہوں

نیز ان ہم غزل اشعار کا معنوی مقابل بھی دلچسپی سے تجالی نہ ہوگا :

نہ منزلیں تھیں، نہ کچھ دل میں تھا، نہ سر میں تھا
عجب نظارہ لا سمیت نظر میں تھا
ہماری آنکھ میں آکر بنا اک اشک، وہ رنگ
جو برگِ سبز کے اندر، نہ شاخِ تر میں تھا

دن کو دفتر میں اکیلا، شب بھرے گھر میں اکیلا
میں کہ عکس منتشر، ایک ایک منظر میں اکیلا
بولتی تصویر میں اک نقش لیکن کچھ ہٹا سا
ایک حرفِ معتبر، لفظوں کے لشکر میں اکیلا

سرسر ایک چمکتی ہوئی تلوار تھتا میں
موج دریا سے مگر برسِ پکار تھتا میں
میں کسی لمحہ بے وقت کا اک سایہ تھا
یا کسی حرفِ تہی اسم کا اظہار تھتا میں

محراب نہ تبدیل، نہ اسرار نہ تمثیل
کہ اے درقِ تیرہ، کہاں ہے تری تفصیل
آساں ہوئے سب مرحلے اک موجبِ پاسے
برسوں کی فضا ایک صدا سے ہوئی تبدیل

اس طرح نارسانی بھی کب تھی، یہ کیا امتحاں ہے
گاہ بنجر صدا، گاہ پامال چُپ درمیاں ہے

دیکھ اک بوندِ خون کے بکھرنے کا نایاب منظر
رت بدلتی ہے گلزار ہوتا ہوا آسماں ہے

نغمی اور اثبات کی اس کشمکش کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے ان اشعار کو
مزید ملاحظہ کر لیا جائے :

مرے بدن میں گچھلتا ہوا سا کچھ تو ہے
اک اور ذات میں ڈھلتا ہوا سا کچھ تو ہے
مری صدانہ سہی، ہاں مرا لہونہ سہی
یہ موج موج اچھلتا ہوا سا کچھ تو ہے

اک گل تر بھی شر سے نکلا
بسکہ ہر کام ہنر سے نکلا
بس ترے بعد پھراے گم شدگی
خیمہ گرد سفر سے نکلا
اے صفِ ابروِ رواں تیرے بعد
اک گھنا سا یہ شجر سے نکلا

پتہ پتہ بھرتے شجر پر ابرو برستا دیکھو تم
منظر کی خوش تعمیری کو لمحہ لمحہ دیکھو تم

سیاہ خانہ امید رائیگاں سے نکل
کھلی فضا میں ذرا آغبارِ جاں سے نکل

آسماں کا سرد ستارٹا پگھلتا جائے گا
آنکھ کھلتی جائے گی منظر بدلتا جائے گا
پھیلتی جائے گی چاروں سمت اک خوش رونقی
ایک موسم میرے اندر سے نکلتا جائے گا

لرزاں ہے کب سے لہو کے افق پر
زہراب میں تر بہ تر ایک لمحہ

دیکھیے کیا کیا ستم موسم کی من مانی کے ہیں
کیسے کیسے خشکِ نخطے منتظرِ پانی کے ہیں

اس تند سیاہی کے پگھلنے کی خبر دے
دے پہلی ازاں رات کے ڈھلنے کی خبر دے
اے ساعتِ اول کے ضیا ساز فرشتے
رنگوں کی سواری کے نکلنے کی خبر دے
طار کو دے آزاد اڑانوں کی فضائیں
کہسار کو دریا کے اچھلنے کی خبر دے
سب کو سفر و سمت پسندی کا دے مُردہ
اب گھاٹ کی سب کشتیاں چلنے کی خبر دے

”نظارہ لاسمیتیت“ سے سفر و سمت پسندی کا مُردہ “تک شاعر کے تخلیقی سفر کا انتہائی
امکانات کے نظر میں آجانے کے بعد اب یہ کہنا مشکل نہیں کہ یہ لفظی اثبات کی کاوش ہی کے طعن
سے پیدا ہوتی ہے۔ کیا اس منزل پر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ شاعر شعورِ حقیقت کے موجودہ منظر نامے

سے شدید طور پر ناآسودہ ہے۔ علوم عقلیہ نے انسان کو جس آشوب آگہی میں مبتلا کیا ہے، کیا شاعر اس سے مایوس و غیر مطمئن نظر نہیں آتا اور رسمیا تی علوم کی تند سیاہی پر تخلیقی ذہن کی فتح کو کیا وہ رنگوں کی سواری کے نکلنے اور گھاٹ کی سب کشتیوں کے چلنے سے تعبیر نہیں کرتا۔ شاعر جب اپنی شخصیت کی خود فریبی کے طلسم کو بے دردی سے شکست کرنے پر قادر ہے تو وہ آگہی کی رسمیات سے باغیانہ سلوک کیوں کرنے روارکھے گا۔ اونچی اڑان، آزاد اڑان، کھلی فضاؤں، پھیلتے خلاؤں، سفر اڑاتے سفر کی مرکزیت سے پہلے بحث کی جا چکی ہے۔ یہاں مزید یہ بات غور طلب ہے کہ بانی کی شاعری میں آشوب زدہ آگہی کے منظر نامے سے گریز و انحراف کی سب سے متحرک علامت ”طائر“ یا ”پرنده“ کی صورت میں ابھرتی ہے :

اڑ چلا وہ اک جدا خاکہ لیے سر میں اکیلا
صبح کا پہلا پرنده آسماں بھر میں اکیلا

ڈھانپ دیا سارا آکاش پرنده نے
کیا دلکش منظر تھا پر پھیلانے کا

نہ جانے کل ہوں کہاں ساتھ اب ہوا کے ہیں
کہ ہم پرنده مقاماتِ گم شدہ کے ہیں

مست اڑتے پرندهوں کو آواز مت دد کہ ڈر جائیں گے
آن کی آن میں سارے اوراقِ منظر جائیں گے

طائر کو دے آزاد اڑانوں کی فضا میں
کہہ سار کو دریا کے اُچھلنے کی خبر دے

یزندے کی علامت بانی کی شاعری میں زمین اور آسمان کے ربط و تعلق کو بھی ظاہر کرتی ہے کیونکہ پرواز کسی مقام سے شروع ہوتی ہے، فضا میں یہ کتنی ہی بلند ہوا اختتام پذیر پھر کسی مقام پر ہوتی ہے۔ اب یہ بات واضح طور پر کہی جاسکتی ہے کہ بانی کی شاعری موجود سے لاموجود کی طرف، مکان سے لامکان کی طرف اور واقعے سے امکان کی طرف مسلسل آمد و رفت کی شاعری ہے۔ یہاں آمد و رفت دونوں کی معنویت پر زور ہے۔ یہ گریز محض یا پرواز محض کی شاعری نہیں جو ذات یا حقیقت سے روگردانی کے مترادف ہے۔ نیز آسمانوں کی وسعت و بیکرانی کی طرف راجح ہونے سے مراد خود کا زوال بھی نہیں، ورنہ یہ مادرائی شاعری کی طرح استعجاب اور گم شدگی سے عبارت ہوتی اور اس سپردگی اور رلبودگی کو راہ دیتی جو صوفیانہ شاعری کی پہچان ہے۔ اسی لیے میرے نزدیک بانی کی غزل کو مادرائی احساس کی غزل کہنا مناسب نہیں۔ نہ ہی میں اسے رسمی معنوں میں تجریدی کہنے کے لیے تیار ہوں۔ بانی کے تخلیقی عمل میں مرکز (NUCLEUS) اور محیط (CIRCUMFERENCE) دونوں

کی اہمیت ہے۔ ان کے فکر و احساس کی جان طبیعی (PHYSICAL) نظام اور مابعد الطبعی (METAPHYSICAL) نظام کا وہ بنیادی رشتہ ہے جو مرکز اور محیط میں بھی ہے، یعنی محیط کو

بغیر مرکز کے اور مرکز کو بغیر محیط کے نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ بانی کا تخیل موجود و معدوم اور مکان و لامکان کی دونوں انتہاؤں کے درمیان (اگر کوئی انتہا انتہا ہے تو) مصروف سفر رہتا ہے اور یہ سفر عبارت ہے آسمانی رشتوں کے اعتبار سے تجسس سے اور زمینی رشتوں کے اعتبار سے تحرک اور توجہ سے۔ بانی کی غیر شخصی شاعری میں جو نئے معنوی افق سامنے آئے ہیں یا جو نئی تخلیقی جہت سامنے آئی ہے، وہ فکر و احساس کے اسی سفر سے مربوط ہے۔ یہ شاعری ذات کو آفاق کے اور آفاق کو ذات کے وسیلے سے دریافت کرتی ہے، اور زمینی اور آسمانی عناصر کی متصادم اور متقابل قوتوں کے اس بنیادی رشتے سے ہم آہنگی اور ہم کلامی کی خواہاں ہے جو تخلیق کائنات کا اور اس ہنگامہ ہستی کا سب سے بڑا راز ہے۔

(۲)

اس مضمون کے شروع میں محبت کی جسمانیت سے صرف نظر کرنے کا ذکر آیا تھا، فقط اتنا ہی نہیں بلکہ انسانی تعلقات کی دھوپ چھاؤں بھی بانی کا موضوع نہیں۔ ان کے یہاں انسانی تعلقات کا جو بھی تذکرہ ملتا ہے وہ قطع تعلق کے بعد کی کیفیتوں کا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بانی کا ذہن اتنا بیدار،

ان کی انا اتنی بے قرار اور ان کی نظر اتنی بتیاب ہے کہ وہ انسانی رشتوں کو اپنی حد بنانے کے لیے تیار نہیں۔ اکثر دہشتہ وہ تجربات کو اپنی حدود سے ماورا ہو کر پیش کرتے ہیں اور ان کے جذبات میں ضبط و تحمل اور بھڑک کی کیفیت ہے۔ ذیل کی قبیل کے اشعار ان کے دونوں مجموعوں میں بہت کم ہیں۔ اسی سے اندازہ ہوگا کہ وہ دلی واردات کو کس طرح بیکسر محو کر سکتے ہیں اور اس وادی سے کیسے مرتب و منضبط ذہن کے ساتھ گزرتے ہیں :

وہ ٹوٹے ہوئے رشتوں کا حسن آخر تھا
کہ چپ سی لگ گئی دونوں کو بات کرتے ہوئے

آج کیا لوٹے لمحات میسر آئے
یاد تم اپنی عنایات سے بڑھ کر آئے

میں چپ کھڑا تھا تعلق میں اختصار جو تھا
اسی نے بات بنائی وہ ہوشیار جو تھا

کہیں نہ آخری جھونکا ہو مٹتے رشتوں کا
یہ درمیاں سے نکلتا ہو اساکچھ تو ہے

اے دوست میں خاموش کسی ڈر سے نہیں تھا
قابل ہی تری بات کا اندر سے نہیں تھا

متاع وعدہ سنبھالے رہو کہ آج بھی شام
وہاں سے ایک نسیا انتظار لے آئی

اندازِ گفتگو تو بڑے پرتپاک تھے
اندر سے قربِ سرد سے دونوں ہلاک تھے

کب سے بھٹکتے ہیں باہم الگ
لمحہ کم مہرِ بال اور میں!

اگرچہ ذیل کا شعر جواب نہیں رکھتا :

دک رہا تھا بہت یوں تو پیسے میں اُس کا
زرا سے لمس نے روشن کیا بدن اُس کا

لیکن جسمائیت کا رسیا تھی پہلو بانی کے یہاں تقریباً مفقود ہے، البتہ ”حسابِ رنگ“ کی
دو تشبیہی غزلیں اس ضمن میں قابلِ غور ہیں :

لباس اس کا علامت کی طرح تھا
بدن، روشن عبارت کی طرح تھا
فضا صیقلِ سماعت کی طرح تھی
سکوت اس کا امانت کی طرح تھا
ادا موجِ تجسس کی طرح تھی
نفس، خوشبو کی شہت کی طرح تھا
بساطِ رنگ تھی منہٹی میں اس کی
قدم اس کا بشارت کی طرح تھا
تصویر پر حسنا بکھری ہوئی تھی
سماں آغوشِ خلوت کی طرح تھا

صدائے دل، عبارت کی طرح تھی
 نظرِ شمعِ شکایت کی طرح تھی
 بہت کچھ کہنے والا چپ کھڑا تھا
 فضا اُجلی سی حیرت کی طرح تھی
 کہا دل نے کہ بڑھ کے اس کو تھولوں
 ادا خود ہی اجازت کی طرح تھی

لباس کو علامت، بدن کو عبارت، یا ادا کو مونجہ جس اور نفس کو خوشبو کی شہرت کہنے سے
 ذہن معامو، خود اور موہوم یا مکان اور لامکان کے اسی رشتے کی طرف جاتا ہے جس کی وضاحت بانی
 کے تخلیقی عمل کے سلسلے میں پہلے کی جا چکی ہے۔ فضا اور سماعت یا سکوت اور امانت یا قدم اور بشارت
 یا سماں اور آغوشِ خلوت یا نظر اور شمعِ شکایت میں مجرّد و غیر مجرّد یا جاندار کا وہی ربط و تضاد ہے جو
 زمین اور آسمان میں یا نفی اور اقرار میں ہے۔ عالمی عناصر کے باہمی رشتوں کی باطنی وحدت کا احساس بانی
 کے تخلیقی عمل کا ایسا پہلو ہے کہ مجرّدات کو غیر مجرّد تناظر میں اور غیر مجرّدات کو مجرّدات کے آئینے میں
 دکھانا اس کے معمولات میں سے ہے۔ ذیل کے دو عمدہ اشعار کی لطافت اور تہ داری بھی اسی تخلیقی
 تشکیل پسندی کی بدولت ہے :

میں خلاؤں میں اُترتا ورق تیرے اقرار کا ہوں
 نقش جس پر تیرے بوسے اولیں کا نشان ہے

ہو اُمیں زور سے چلتی تھیں ہنگامہ بلا کا تھا
 میں سناٹے کا پیکر منتظر تیری صدا کا تھا

(۳)

شاعری میں احساس و نظر کی تازگی زبان و اظہار کی ندرت کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی

معنی آفرینی کے عمل کو لفظوں کے تخلیقی استعمال کے عمل سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جاسکتا۔ اتنی بات واضح ہے کہ زبان و بیان پر بانی کی گرفت مضبوط ہے اور انھوں نے اپنی تخلیقی قوت سے جو مستحکم پیرایہ اظہار وضع کیا ہے، وہ غزل کی خارجی اور داخلی مہیت میں مطابقت کا ضامن ہے۔ لہجے کی تازگی اور معنی کی نادرہ کاری دراصل لاکھوں بار کے برتے ہوئے لفظوں کو نئے سیاق و سباق میں نئے نئے انسلالات کے ساتھ لانے میں ہے۔ اس کی متعدد مثالیں اوپر کے اشعار میں سامنے آچکی ہیں۔ یہاں لہجے کی انفرادیت کے بعض دو سکریپٹوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، مثلاً بانی کے فن کا ایک خاص پہلو ان کی خوش ترکیبی ہے۔ ان کا شعری وجد ان نئے معنی اور نئے مفہام کا ساتھ دینے کے لیے نئی ترکیبوں اور نئے مرکبات کو برابر تراشتا رہتا ہے، مثلاً :

صد حساب آرزو، محراب ہوا، مفہوم فراداں، باب تصور، بوسہ بے ساختہ، رمز
آشنائے تجسس، شمع شکایت، لمحہ کم مہرباں، لمحہ خندہ حواس، لمحہ لرزاں، لمحہ بے وقت، لمحہ
خالی، لمحہ رائگاں، نشا نفع، موج امکانی، بے گانہ نفع و ضرر، طلسم کاری آغاز داستان، طلسم
خانہ رنگ، منظر بے چہرگی، قرب سرد، حرف تہی اسم، عکس منتشر، ہلاک ہوا، خیمہ گرد سفر، سیاہ خانہ
امید رائگاں، خص جسم و جان۔

رنگ زار، عدم تاثیر لہجہ، خوش تعاون، ہمت پسندی، ذفا قائم، کپاسی برف، شب شکن،
زود قائل، برابر قدم دوست، خوش تعمیری۔

بات صرف مرکبات ہی کی نہیں بانی الفاظ کی تکرار سے بھی کام لینا جانتے ہیں۔ وہ بعض
معمولی معمولی لفظوں کی تکرار سے بھی فضا کی بے کرائی کو یا معنی کے بسط کو یا کیفیت کی گیرائی کے احساس
کو بڑھا دیتے ہیں۔ خاص خاص الفاظ کی تکرار مثلاً پارہ پارہ ہونا، کھڑے کھڑے اکتا جانا یا ٹکڑے
ٹکڑے ہونا زبان کے معمولات سے ہے، لیکن بانی بعض ایسے لفظوں کو بھی مکرر لاتے ہیں جو پہلے اس
طرح استعمال نہیں ہوئے تینجا وہ ایک نئے معنیاتی عمق اور کشادگی کو راہ دیتے ہیں جو پیرایہ اظہار کی
لطافت میں اضافے کا باعث بنتی ہے :

بانی شکن شکن سا تمہارا دروں بھی ہے
کچھ پارہ پارہ سا ہے تمہارا لباس بھی

یہ رات گزرے تو دیکھوں طرف طرف کیا ہے
ابھی تو سب کچھ میرے لیے آسمان میں ہے!

فصیل شب سے عجب جھانکتے ہوئے چہرے
کرن کرن کے پیاسے ہوا ہوا کے ہیں

وہ خاک اڑانے پڑے تو سارے دشت اس کے
چلے گداز قدم تو چمن چمن اس کا!

وہ روز شام سے شمعیں دھواں دھواں اس کی
وہ روز صبح اُجالا کرن کرن اس کا

اک بوند میرے خوں کی اڑی کھتی طرف طرف
اب سارے خاکداں میں چمک بھی ہے باس بھی

طرب طرب ساری لذتوں میں
میں زہر کی دھار ہوں سزا دے

اب ہے بانی فضا فضا محروم
گو نجست ہے مکان مکان خالی

کراں کراں نہ سزا کوئی سیر کرنے کی
سفر سفر نہ کوئی حادثہ گزرنے کا

بانی کے پیرایہ اظہار میں فارسی تراکیب تراشی کے ساتھ پراکرتی فعل سازی کی طرف بھی توجہ پائی جاتی ہے۔ مرکبات اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسمیہ احساس سے مملو ہوتے ہیں اور افعال اگر اسمی پیکروں سے مرتب ہوئے ہیں یعنی اسم جمع فعل (اور یہ اسم ایک یا ایک سے زائد ہو سکتے ہیں) تو ایسے افعال فعلیہ احساس سے متشکل ہوتے ہیں۔ شعری وجدان اپنی تازہ کاری کے لیے جب جب عمل کے کسی سلسلے یا اس کے کسی پارے کا سہارا لیتا ہے تو فعلیہ اظہار میں ڈھل جاتا ہے۔ یہاں فعلیہ احساس کے تصور کی تفصیل کی گنجائش نہیں، لیکن اتنا طے ہے کہ بانی زمینی اور آسمانی رشتوں کی بے پایابی کے اعتبار سے اور مجرد و غیر مجرد پیکروں کے اعتبار سے اسمیہ احساس کے شاعر ہیں، اسی لیے ان کے یہاں شے نما تراکیب سازی کی اہمیت زیادہ ہے، لیکن فعلیہ احساس نے بھی کہیں کہیں ایسے شعر کہلوائے ہیں جن میں ذہن ایک تازہ اور نئے اسلوب سے متعارف ہوتا ہے:

فضا کہ پھر آسمان بھسرتھی
 خوشی سفر کی اڑان بھسرتھی
 افق کہ پھر ہو گیا منور!
 لکیر سی اک کہ دھیان بھسرتھی
 وہ اک فسانہ زبان بھرتھا
 یہ اک سماعت کہ کان بھسرتھی
 کھلا سم کہ چاند بھرتھا
 ہوا کہ شب یاد بان بھسرتھی
 نہ ٹوٹ پایا، وہ جانستاتھا
 کہ واپسی درمیان بھسرتھی

فضا کو آسمان بھر کہنا یا سفر کی خوشی کو اڑان بھر کہنا یا سماعت کو کان بھر، سمندر کو چاند بھر اور ہوا کو بادبان بھر کہنا فعلیہ احساس کا کرشمہ ہے جس نے شعری عمل میں تازگی احساس اور

لہجے کے نئے پن کی راہ کھول دی ہے۔ ایسے اشعار اسلوب و احساس کی ندرت کا عجوبہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ ذیل کے اشعار کا معنیاتی فشار فطریہ احساس ہی کی بدولت ہے۔ شعر کا پورا معنیاتی ڈھانچہ اسی پر لگا ہوا ہے۔ خط کشیدہ الفاظ اس کے منظر ہیں:

تو کوئی غم ہے تو دل میں جگہ بنا اپنی،
تو اک صدا ہے تو احساس کی کماں سے زکمل

قدم زمیں پہ نہ تھے راہ ہم بدلتے کیا
ہوا بندھی تھی یہاں پیٹھ پر سنبھلتے کیا

کوئی بھولی ہوئی شے طاق ہر منظر پہ رکھی تھی
ستارے چھت پہ رکھے تھے شکن بستر پہ رکھی تھی

لرز جاتا تھا باہر جھانکنے سے اس کا تن سارا
سیاہی جانے کن راتوں کی اس کے در پہ رکھی تھی

کہاں کی سیر ہفت افلاک اوپر دیکھ لیتے تھے
حسین اجلی کپاسی برف بال و پر پہ رکھی تھی

یہ اسلوبیاتی تازہ کاری معنیاتی تازہ کاری سے الگ وجود نہیں رکھتی۔ بانی کی غنزل دونوں سطحوں پر جو اصلاً باہم دگر مروط و مخلوط ہیں، اپنی انفرادیت کا حق تسلیم کر لیتی ہے۔ اس کی ضامن ان کی معنیاتی اور لسانی نظر ہے جو زندگی اور زبان کو اپنے طور پر برتنے اور اس کے گونا گوں اسالیب و مظاہر کو اپنے طور پر سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ بانی نہ شخصیت کی خود فریبی کا شکار

ہیں نہ طلسم خانہ ذات کے اسیر، وہ زمینی اور آسمانی دونوں رشتوں سے سبک وقت و ابستگی کے شاعر ہیں۔ اگر وہ صرف زمینی رشتوں کے شاعر ہوتے تو جسمانییت کی رنگینیوں کی داستانیں سناتے اور اگر صرف آسمانی رشتوں کے شاعر ہوتے تو ماورائی بلندیوں میں کھو جاتے۔ وہ شعور حقیقت کے موجودہ منظر نامے سے انحراف ضرور کرتے ہیں لیکن صرف اس لیے کہ آگہی کی نئی دھتوں سے ہم کلام ہو سکیں۔ ان کے یہاں نفی کا تاثر اسی لیے پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بغیر اثبات کی کوئی وقعت نہیں۔ اس شاعری کو زمینی رشتوں یا آسمانی رشتوں کے الگ الگ خانوں میں رکھ کر دیکھنا مناسب نہیں۔ بانی کے یہاں زمین زمین کے لیے یا آسمان آسمان کے لیے یا اقرار بند اتہ یا انکار بند اتہ اہم نہیں بلکہ اہم فن کا وہ باہمی رشتہ ہے جس کی وجہ سے ایک کو دوسرے کے بغیر سمجھا ہی نہیں جاسکتا یا ایک کا وجود دوسرے کے بغیر بے مصرف و بے معنی ہے۔ بانی کی شاعری متقابل عالمی قوتوں کے ہمہ گیر ربط و تعلق کے احساس و ادراک کی شاعری ہے جو اپنے تخلیقی تجسس، تحرک اور توجہ کے پر پرواز سے بے کراں ہو جانا چاہتی ہے۔ اس شاعری میں ذات کو آفاق سے اور آفاق کو ذات سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کے وسیلے سے پرکھنے اور پہچاننے کی راہیں کھلتی ہیں، اور یہی وہ نئی شعری جہت ہے جس کے ذریعے سے بانی نے نئی غزل کو نئی بشارت دی۔

ساقی فاروقی

زمین تیری مٹی کا جادو کہہاں ہے

ساقی فاروقی اردو شاعری کی نہایت زندہ اور توانا آواز کا نام ہے۔ ان کا سوچنے اور بیان کرنے کا انداز اتنا اچھوتا اور نرالا ہے کہ اسے کوئی نام دینا آسان نہیں۔ ساقی فاروقی اس عہد کے ان بیدار ذہن شاعروں میں ہیں جن کے تخلیقی ارتقا کا افق ہنوز روشن ہے اور جنہوں نے کسی مقام کو منزل نہیں بنایا۔ ان کا پہلا مجموعہ 'پسایا کا صحرا' جو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۶ء تک کے کلام پر مشتمل ہے، جب منظر عام پر آیا تو ساقی لندن جا چکے تھے۔ وہ برسوں سے لندن میں ہیں۔ زبان و ادب کے سوتوں سے لڑ کر شکر کوئی آسان نہیں، لیکن ساقی کے دو کے مجموعے "رادار" سے جو دس گیارہ برسوں کی طویل مدت کے بعد شائع ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ عمر کے ساتھ ساتھ بغاوت کی لے کچھ کمزور پڑ گئی ہے، لیکن تخلیق کی آگ روشن ہے اور آگہی کا شہ کچھ بڑھ گیا ہے۔

زندگی اور اس کے گھنے پن سے ساقی کا رشتہ ہمیشہ مضبوط تھا۔ نئی شاعری سینکڑوں رنگوں کے پھول کھلنے کی فضا سے عبارت ہے اور چونکہ ہر رنگ میں انفرادی اظہار کی بہار کا اثبات لازم ہے، اس لیے اس دور میں انداز فکر، لہجے، طرز بیان اور اسالیب کے اتنے منطقی اور اتنی جہتیں ہیں کہ ایک رنگ دو کے کو کاٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اس جلوہ صد رنگ میں دھنک کی سی کیفیت ہے، اور رنگوں کا اختلاف و امتزاج حسن کاری کا لازمہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ساقی کی شاعری کے بارے میں پہلی بات یہ ہے کہ یہ اپنے میں مگن نہیں یعنی یہ اس طرح انکشاف ذات کی شاعری نہیں جس طرح اس عہد کی زیادہ تر شاعری ہے۔ چنانچہ یہ

براہِ راست مابعد الطبیعیاتی مسائل سے آنکھیں نہیں ملاتی اور تجربی فضائوں میں پرداز نہیں کرتی، بلکہ طبیعات سے چپک کر چلتی ہے، یعنی زمین اور اس سے لگا ہوا جو کچھ ہے، جن و انس، بیڑ، پودے، گھاس کے میدان، سبزہ نیا تات، چرند پرند، مینڈک، سوز، خرگوش وغیرہ کائنات کی نظر آنے والی ٹھوس چیزوں سے اس کا بہرہ تعلق ہے۔ ان چیزوں کو دل کی دھڑکنوں میں سمو کر اور ان سے گفتگو کر کے ساتی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری زندگی کی شئییت، بھرے پُریے پن اور بوقلمونی اور ان خارجی عوامل کے ذریعے سے داخلی مسائل تک پہنچنے کی شاعری ہے۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ اس شاعری کی نوعیت نہ ذاتی ہے نہ مابعد الطبیعیاتی بلکہ اس کا اہنگ کائناتی ہے۔

اس بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ شاعری اس معنی میں ابلاغ پسند ہے کہ علامت و استعارہ یا تمثیل و کنایہ ابلاغ کی نفی نہیں بلکہ شعری تجربے کی نوعیت کے اعتبار سے حسن اظہار کے مختلف وسائل و پیرائے ہیں، اور ابلاغ کے حسن میں افسانے اور انہام کی تہداری کے ضامن ہیں۔ ساتی کا رخ چونکہ کائنات کی طرف ہے، اس لیے وہ کم کلامی یا خود کلامی کے شاعر نہیں، وہ ہم کلامی کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی نظم "کم ون ہی کے شن" میں اس بات پر فخر کیا ہے کہ شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی آواز دلوں میں اتر سکتی ہے۔ اس نظم کو ساتی کی شاعری کا مزاج نامہ سمجھنا چاہیے۔

یہ احساس کہ اک ذی رُوح
مری آواز کے شعلے سے جل سکتا ہے
خاموشی کے ریشم سے کٹ سکتا ہے
اتنا جاں پرور ہے کہ آنکھیں
بند ہوئی جاتی ہیں خوشی سے
بھیسگی جاتی ہیں

تاہم اس آواز کو جو چیز نہیں کرتی ہے، وہ تباہی اور موت کا خوف ہے۔ کیسی منفی احساس کا اشاریہ نہیں بلکہ اس المیے کو سمجھنے کی کوشش ہے کہ موجودہ دور میں انسان کا شعور کلی کس منزل کی طرف رواں ہے۔ راشد نے ایک جگہ اس بات پر افسوس کیا ہے کہ غم و اطم کا روایتی تصور اردو شاعری کی حیاں کا روگ ہے۔

’پیماس کا صحرا‘ میں غم و اطم کی رومانی پر چھائیاں کچھ نوزگسیت کی وجہ سے اور کچھ سن بلوغ کے جذبات کے تحت ملتی ہیں، لیکن ’رادار‘ تک پہنچتے پہنچتے ان کی نوعیت بدل گئی ہے۔ مثلاً پہلی کوشش تو یہی ملتی ہے کہ اگر ممکن ہو تو کسی طرح درد کی فصیل توڑ دی جائے۔

جسم کے چاروں طرف
درد کی تاریک فصیل
ذات کے حصے میں کہلا گئی آواز مری
غم کی یلغار سے دل بند ہوا

قلب پیونیدی ارباب اطم تو ہوگی
شہر میں کوئی دھڑکتا موادل —
دل کوئی تازہ قلم تو ہوگی

(مخاصہ)

درد بالعموم اس کیفیت نے اس افسردگی کو راہ دی ہے جو تخلیقی عمل کا کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہیں
یہ ”بے زاری و بے لطفی“ کا پتہ دیتی ہے اور کہیں گاڑھے کیلے دھوئیں کی شکل میں ابھرتی ہے اور کہیں زبان
پر ”کیلا“ ذائقہ چھوڑ جاتی ہے۔
مقدور انسانی کے استفہامیے کا یہ کیلا پن جگہ جگہ حواس کو ڈستا، ہوا نظر آتا ہے :

دلوں کے جزیروں میں
اشکوں کے نسیم تھپے ہیں
رگوں میں کوئی رو دِ غم بہہ رہا ہے،
ہمیں موت کی تیز خوشبو نے پاگل کیا ہے
امیدوں کی سُرخ آبدوزوں میں سہمے
تباہی کے کالے سمندر میں بہتے چلے جا رہے ہیں

کراں تا کراں ایک گاڑھا کیلا دھواں ہے
زمیں تیری مٹی کا جادو کہاں ہے

(موت کی خوشبو)

موت کی تیز خوشبو سے بچنے کے لیے ساتی فاروقی شہر آئندہ کے دروازے پر بار بار دستک دیتے ہیں۔
سنتری پتھر کی مورت بنا کھڑا ہے، ٹس سے ٹس نہیں ہوتا۔ کائنات کے مہیب بکنگھم پلیس کے سامنے ایک
زبوں حال زائر کی حقیقت بھی کیا، اور زائر بھی ایسا جس نے باطنی اقدار کے سارے اچھے بھلا دیے ہوں، اور
اپنے آپ ہی طمانیت کے دروازے خود پر بند کر دیے ہوں۔

ایک پاگل کی صورت کھڑا ہوں مگر
سنتری مسکراتا نہیں
اس کی بے رحم آنکھوں میں
چیتے کی عیار

بیمار نظروں کی ٹھنڈی چمک

پاس درڑ

(اسم اعظم سہی)

یاد آتا نہیں

(شہر آئندہ کے دروازے پر)

ایسی حالت میں / زمیں تیری مٹی کا جادو کہاں ہے / کی معنویت واضح ہو جاتی ہے۔ آج کا انسان
اسم اعظم بھول چکا ہے۔ شہر آئندہ کی خواب گاہوں میں بھانکنے کی گنجائش نہیں۔ آسمانوں میں پرواز کا مزہ
جاتا رہا۔ ایسے میں مٹی کا بلاوا شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے۔ ساتی فاروقی کے کائناتی آہنگ کا بنیادی رمز
یہی ہے کہ وہ بار بار مٹی اور اس کے مظاہر کی طرف کھینچتے ہیں، مٹی کے جادو کی جہتوں میں سفر کرتے ہیں اور
مٹی کے مظاہر کی کشش اور برتاؤ کے اسرار کی دریافت میں مگن نظر آتے ہیں۔ مٹی کے بلاوے کی پہلی
بنیادی مہک بدن کی ہے۔ بدن سے وابستگی کا ثبوت پیاس کا صحرا میں بھی ملتا ہے اور رادار میں بھی۔

شروع کی نظموں اور غزلوں میں دشت، صحرا، ریت، پیاس اور کالی گھٹا کے جو پیکر بار بار ابھرتے ہیں — وہ استغہامیہ کی فضا میں بدن کی تشنگی، طلب اور تڑپ کو ظاہر کرتے ہیں ریت کی صورت جاں پیاسی تھی، آنکھ ہماری نم نہ ہوئی زہولہبان، خون میں لت پت، خوں پاشی، بدن کی آگ، شعلہ، زخموں کے سُرخ گلاب، داغوں کے بدزئیر وغیرہ الفاظ — جو ساقی کے یہاں بار بار چمک جاتے ہیں، بدن سے وابستگی کے اظہار لیے ہیں۔ بدن سے وابستگی سے مراد عہد کے آسیب سے بھاگ کر جنس میں پناہ لینا نہیں جنس زدگی یا لذت اندوزی تو بہر حال ناآسودگی کو راہ دیتی ہے اور پھر زمانے کی بے رحمی کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ اس کے برعکس ساقی کے یہاں بدن سے وابستگی سے جسم کی وہ لطافت اور حساسیت مراد ہے جو زندگی کو رس اور جس دیتی ہے۔ ساقی کے یہاں بدن ہر طرح کے نفسی موانع سے ہٹ کر ایک لمس زار اور رنگ زار کے طور پر پلٹتا ہے یعنی انسانی حسی اور جسمانی معنی میں بھی اور اس کا نئی معنی میں بھی جو اس کا زرار حیات میں انسان کا بوجھ ہلکا کرتا ہے اور اس کے پورے وجود کو سرشار کر دیتا ہے :

پاؤں میں سونے کے گھنگرو باندھ کر
 ناچتی ہے رات کی سلیم پری
 بجل کے آخر بچھ گئی پت جھڑکی آگ
 تو گلابی کونپلوں میں پھوپ گئی
 میرے سینے میں کھلے نخوت کے پھول
 روح کی اور جسم کی دیوار سے
 اب بہت آگے نکل آتی ہے رات
 ہم نہ جانے کون سے موسم میں ہیں

(وصال)

یہ پھوٹی سی لیکن نہایت موثر نظم جو باصرہ اور لامرہ کے بخشے ہوئے زندہ پیکروں سے تھر تھرا رہی ہے، پہلے مجموعے سے لی گئی ہے اور بلاشبہ ساقی کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ پہلے ذکر کی اس نوع کی نظموں میں سُرخ گلاب اور بدزئیر، پری خانہ اور تسلی اور دوسرے دور سے امانت، نامحرم، سی سک، باکرہ، داستا، بانجھ اور سیسٹرماریا تریزا خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ بات لائق غور ہے کہ بدن کے جاگتے

احساس اور محبت کا جو دائرہ پہلے دور میں تبتلی سے شروع ہوتا ہے، دوسرے دور میں وہ امانت میں مکمل ہوتا ہے تبتلی معصوم محبت کی نظم ہے، نہایت پیاری اور ہلکی بھلکی :

وہ پاگل تھی
پاگل پن میں
اس کے پر کانٹوں سے اُلجھ کر ٹوٹ گئے
اب اپنے زخمی پروں پر
اک پیلے پتے کے نیچے
بیٹھی ہے اور سوچتی ہے
سوچتی ہے اور روتی ہے

یہ تو مری محبت ہے
یہ تو مری محبت ہے

پیاس کا صحرا کی معصوم تبتلی رادار میں امانت میں ملتی ہے، لیکن شاعر انسانی رشتوں کو اب کہیں زیادہ بے رحمی سے دیکھ سکتا ہے۔ امانت محبت کی معصومیت کی نہیں درندگی کی تصویر ہے جو ہر انسان میں پنہاں ہے۔ یہ نظم جنس کا دوسرا رخ پیش کرتی ہے۔ یعنی مرد کی اشتہا، بے رحمی اور بہیمانہ خود غرضی کا:

اک قصبے کے
اک اسکول میں
اک لڑکے نے تھکی ہوئی اک تبتلی پکڑی تھی
اور رہائی کی کوشش میں
اس تبتلی کے پروں کا اودا نیلا رنگ
فضا میں بکھر گیا تھا

اس لڑکے نے
میز کے اوپر، پیپر ڈیسک کے نیچے رکھ کر
اس کے پرما جس سے جلانے
اور اس کا دھڑ
پنسل کاٹنے والے چاقو سے
دو حصوں میں بانٹ دیا تھا

وہ لڑکا تو چلا گیا
پر تیس برس سے
اس کا گندا چاقو میرے پاس ہے
اور چاقو پر
اس مٹیالے پیلیے خون کے دھبے سے لجن ہے
اور زباں پر ایک کسلا پن ہے
اتنی تھکن ہے
نیند سے پاگل ہوں

مرد کی بہمیت اور زندگی سے متعلق یہ ایک نہایت پر تاثر نظم ہے، اور اس کے تمثیلی سیراے نے اس کو معنی خیز بنا دیا ہے۔ بات یہاں بھی تسلی ہی کی ہے، لیکن اہل چیرہ عمل ہے جس کے باعث تسلی کو میز کے اوپر پیپر ڈیسک کے نیچے رکھ کر اس کے پرما جس سے جلانے گئے، لیکن بنیادی شخصیت تسلی کی نہیں، اس گندے چاقو کی ہے جس سے تسلی کا دھڑ دو حصوں میں بانٹ دیا گیا اور جس پر مٹیالے پیلیے خون کا دھبہ ابھی تک ہے، یہ گندا چاقو مرد کی سرشت ہے، مرد کے خمیر میں مضمحل جو موقع ملنے پر تسلی کے دھڑ کو دو حصوں میں بانٹ دیتی ہے۔ ساقی کی امجری میں رنگوں کی خاص اہمیت ہے، رہائی کی کوشش میں تسلی کے پروں کا اودا نیلا رنگ فضا میں بکھر جاتا ہے۔ اس میں مرکزی تاثر اودے نیلے رنگ کا ہے جس سے ایک نسانی کیفیت نظروں میں سما جاتی ہے۔ اس طرح مٹیالا پیلا خون کا دھبہ مرد کی بہیمانہ شخصیت کی

موثر پہچان ہے۔ نظم ترستی میں زخمی ترستی کے ایک پیلے پتے کے نیچے بیٹھنے کا ذکر ہے۔ یہاں پیلے پتے ترستی کی دل کی تنگتگی کا پیکر ہیں۔

ساتی کے یہاں زبان کا تخلیقی استعمال ایک نئے درجہ حرارت پر ملتا ہے۔ نئے لفظ یا نئی ترکیبیں تو سامنے کی بات ہے۔ اصل چیز زبان کی صرفی و نحوی توسیعات، نئے تلمازے اور انسلالات، لفظیات کا نیا مزاج یا نظام اور نئے اسلوبیاتی پیرائے و معنیاتی جہات ہیں جو ساتی کی پوری شاعری میں بکھرے ہوئے ہیں (اس مضمون میں ان امور کی طرف ممکنہ حد تک اشارے کیے جائیں گے، لیکن شاید ہر جگہ یہ ممکن نہ ہو۔ ان مقامات پر ایسے لفظوں یا کلموں کے نیچے خطی کھینچ دیا گیا ہے۔ ساتی کے شعری مزاج اور اسلوبیاتی نظام کو سمجھنے کے لیے ان پر نظر رکھنے سے مدد ملے گی)

اب مٹی کے بلاوے کا ایک اور رخ دیکھیے۔ خواہش صرف گند اچا تو ہی نہیں۔ کثافت کا ایک پہلو نفلت کی طرح بھی کھلتا ہے، اور اس گناہ کا ایک رخ تقدس آشنا بھی ہو سکتا ہے۔ سسٹر ماریا تریزا اس لحاظ سے دلچسپ نظم ہے کہ اس میں جنسی خواہش کو بالیدہ اور ارتقاء آشنا احساس کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں / جسم کی ایندہی میں / روح کی خود لذتی میں / کیا ملے گا / اور اس کے فوراً بعد / سبز گدے / سوگ ساگر میں / نسی لہریں بنانے / اور پانی کاٹنے کی / جو ندمت کی گئی ہے وہ جنس کے عینیت پسند نقطہ نظر کی نفی کرتی ہے، اور اس نظم کو جدید بناتی ہے :

یادِ بستر میں
تمنا کے پرانے آنے کے سامنے
جسم کی اینداری میں
روح کی خود لذتی میں
کیا ملے گا؟
روزِ جمیلی فیش کی صورت
نارسی کے بادباں کھولے ہوئے

سبز گدے سوگ ساگر میں

نئی لہریں بنانے
اور پانی کا ٹٹنے میں
کیا ملے گا؟

بات صرف جنسی جذبے کے تقدس کی نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں برسوں کے اس احساس کی ہے جو تخلیق کار مزہ ہے اور جس کا سلسلہ نورازل کے دھندلکے سے مل جاتا ہے۔ جنسی جذبے کی تقدس و لطہیہ متصوفانہ موضوع ہے اور عہدِ وسطیٰ کی شاعری کی خصوصیت خاصہ ہے۔ لیکن جو چیز زیر نظر نظم کو متصوفانہ ہونے سے بچا لیتی ہے وہ جنسی جذبے کا ترقیح نہیں بلکہ فرد کا یہ وجودی احساس کہ وہ خود تخلیق کے با اختیار لمحوں کا لامختتم سلسلہ ہے، اس وجہ سے وہ خود روحِ قدس یا نورازل ہے اور چونکہ وجود کا امین ہے اور تخلیق کار بھی، اس لیے ”خدا“ ہے، چنانچہ راز بستہ چھاتیوں کے چاندی کٹوروں سے پھلکنے کی خواہش صدیوں کو آواز دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے :

اپنی تنہائی میں اک دن میری تنہائی ملا دو
میں ہی روحِ قدس ہوں
نورازل ہوں

دیر سے تم میں پھپہا ہوں
جن دھنک لمحوں کو اپنے دھیان میں

زنجیر کر کے مطمئن ہو
میں انہی کا سلسلہ ہوں
اور تمھاری راز بستہ چھاتیوں
چاندی کٹوروں سے پھلکنا چاہتا ہوں

ادھر ساقی ناروتی نے جو طویل نثری نظمیں لکھی ہیں، ان میں شیر امداد علی کا میسڈگ اپنی معنوی تہذیبی

اور ایجبری کے اعتبار سے انوکھا تجربہ ہے۔ شیر امداد علی، مزے کا نام ہے۔ نظم کا مرکزی خیال غالباً یہ ہے کہ غصب انسان کی فطرت ہے، علم ہو یا کوئی اور چیز جس کو ایک بار ہم حاصل کر لیں، اپنا لیں یا اپنی شخصیت کا جز بنالیں، اس سے دوسروں کو محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس نظم کی ایک اور معنوی جہت بھی ہے اس کی ساری ایجبری تالاب اور پانی کی ہے۔ پانی کا بلا دامتھی کے بلاوے سے الگ نہیں۔ ساتی کے یہاں پانی کا بلا و آبی خواہش کے استعارے کے طور پر کئی جگہ ابھرتا ہے۔ اس نظم میں / مٹیالے تالاب میں / اس ادھ کھلے کنول پر / وہ بہار تھی / جو دیکھتے والی آنکھوں میں دھنک کھلاتی ہے / ادھ کھلے کنول اور آنکھوں میں دھنک کھلنا دونوں جنس کی کشش کے استعارے ہیں۔ اس کے فوراً بعد / پھر پانی کا بلا و الگ تھا / اس ساحرانہ کشش سے ہار کر / اپنا تہہ اتار کر / وہ مردہ پانی میں کود پڑے / یہاں پانی کا بلا و، ساحرانہ کشش، تہہ اتارنا اور مردہ پانی میں بے اختیار کود پڑنا غور طلب ہے۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کے بعد شیر امداد علی کے جل کنجھی سے اُلجھنے اور گل گھٹنوں سے شاک لہروں کے شور سے ڈر کے ہر طرف بھاگنے کا معنی خیز ذکر ہے :

جل کنجھی سے اُلجھے

تو ہفتے عشرے کے جل کے مانند

نرم اور خام سروں والے

گل گھٹنے

(صد کار میڈیکوں کے

دردار نیچے)

شاک لہروں کے شور

سے ڈر کے

فر فر ہر طرف بھاگ کھڑے ہوئے

اور شیر امداد علی گلے گلے پانی میں تھتے

اور کنول دور تھا

پانی، تالاب، کنول، دھنک، ساحرانہ کشش، تہہ : جل کنجھی، محل اور گل گھٹنوں کی تمثیلی فضا

میں میرے لیے اس نظم کو ایک زمینی جنسی نظم کے طور پر پڑھنا اظہارِ اعتبار سے زیادہ باعنی ہے۔ اس کے بعد
دُمدار آبِ خوار کا ذکر ہے، اس / غبارے کی سرعت سے / جس میں ہوا بھری ہو / اور ہاتھ سے چھوٹ جائے /
بھی جنسی عمل کی تمثیل ہے۔ موسم بدلتے ہیں، یک جہتیتے ہیں، انسان خواہ شہر بد لے یا ملک، خواہش اس کے خمیر
میں ہے، اور / اہو میں وہی صدا ہلکورے لیتی ہے / باہر آنے دو / اس زندان سے باہر نکلنے دو / اور

شیر امداد علی
پانی کی امانت
غصب کیے
اپنے گھر میں زنجیر ہوئے بیٹھے ہیں
باہر پانی کھا رہے

غرض یہ خواہش صرف انسان کے وجود اور سائیکس میں ہے بلکہ اس سے باہر بھی دائرہ درد اُتر گھیرا ڈالے
رہتی ہے۔ نظم کی آخری سطروں میں / اپ / کا تو اثر بھی اسے پانی کے بلاوے کی معنیاتی مرکزیت سے منسلک
کر دیتا ہے۔

اور پانی میں مپیل کے پتوں کی طرح
سارے
خشمگیں آنکھوں والے
پیلے پیلے میڈک اپنا گھیرا ڈالے
پڑے ہوئے ہیں

اس نظم کی دوسری معنیاتی جہات بھی ہو سکتی ہیں۔ اس سے آسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہاں جنس
اور بدن کی کیفیات دوسری زمینی کیفیات کے ساتھ کس طرح گھل مل کر وارد ہوئی ہیں۔ معنوی گٹھاؤں کی
یہ سچپ یہ کیفیت ساتی کی پوری شاعری میں جاری و ساری ہے۔ ساتی اگر صرف مٹی کے بلاوے کے شاعر

ہوتے تو بھی ان کے جینون ہونے میں کلام نہیں تھا۔ لیکن مٹی کا بلاوا ان کی شعری جمالیات و معنیات کی صرف ایک جہت ہے۔ دوسری جہت زندگی کے وہ سینکڑوں ہزاروں روپ اور ان گنت مسائل و مطالبات ہیں جنہیں ساقی کا ذہن زمینی تقاضوں کے ساتھ ساتھ نبٹتا ہوا چلا جاتا ہے۔

ساقی کی پیدائش کو رکھپور میں ہوئی اور ان کا لڑکپن وہیں گزرا۔ پانی، بارش، تالاب، کنول، جیل کنجھیاں، سانپ، چھتریاں، مینڈک، گل گھنٹے، چھتھار پیر، جنگلوں کی شبیہیں یوں تو بڑھتی ہیں کہیں بھی ہو سکتی ہیں لیکن پورب کی مٹی اور وہاں کے مناظر سے بھی ان کا کچھ تعلق ہو سکتا ہے اور غالباً یہ وہاں کی فضا و کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ اور ایسے پیکر ساقی کے زمینی گھنے پن سے رابطہ میں معنویت پیدا کرتے ہیں۔ ساقی خارج سے داخل کی طرف سفر کرتے ہیں، ان کی خارج کی آنکھ پوری طرح کھلی رہتی ہے۔ لگتا ہے ساقی زمینی گھنے پن کو نہیں دیکھتے، زمینی گھنا پن ان کو دیکھتا ہے اور ان کے پورے وجود میں سراپت کر جاتا ہے اور یہی زمینی گھنا پن ان کے یہاں عجیب و غریب کائناتی رنگارنگی اور تنوع پیدا کرتا ہے۔ ساقی کے کائناتی آہنگ کی مزید تفصیل میں جانے سے پہلے پائس کا صحرا کی دو خاص نظموں کا ذکر ضروری ہے، یعنی منتقم اور مردہ خانہ، منتقم مشینی عہد پر موثر طنز ہے۔ یہ مغرب کے کسینو کا نقشہ پیش کرتی ہے جو پوری دنیا کی مثال ہے۔ انسان اس جو اگھر میں رفتہ رفتہ مشین سے اپنا سب کچھ ہارتا جا رہا ہے۔ اور اگر کبھی جتنے کے داہمے میں مبتلا ہو بھی جائے تو مشین بھی علی الاعلان کہتی ہے:

میں چلا تو اس سہاگن نے پکارا ڈار لنگ
ایک دن کی جیت کیا اور ہا رکیا
جیتنے پر مان کیا اور مان پر اصرار کیا
میں ابھی ہاری نہیں، ہاری نہیں
اس صدی کا آدمی میری گرفتاری میں ہے

مردہ خانہ ساقی کی شاہکار نظم ہے۔ یہ اس عہد کی آسیب زدگی کا اشاریہ ہے۔ اس میں ساری امیجری مردہ خانہ کی ہے، انتہائی عبیت ناک اور روح فرسا، چاروں طرف لاشوں کے انبار رکھے ہیں۔

یکلخت ہوا کا ایک تخیل تہ جھونکا آتا ہے، دروازے سرٹکنے لگتے ہیں، اور بلب کے ٹوٹنے اور اندھیرے کے بڑھنے سے سارا منظر نہایت ڈراؤنا اور بھیانک ہو جاتا ہے۔

وہ ہونٹ نیم تراشیدہ، دانت نکلے ہوئے
وہ نصف دھڑ چلے آتے ہیں قہقہے کرتے ہوئے
وہ جسم سہمے ہوئے بند مرتبانوں میں
جو بات کی تو انھیں تیز و ترکش زہر ملا
جو چپ ہوئے تو انھیں سولیوں پر ٹانگ دیا

ان میں سے کئی لاشیں آدرا زناظہار کی موت رسیدہ ہیں۔ آخری دو مصرعوں سے مُردہ خانہ کی تمثیلی نوعیت واضح ہو جاتی ہے، یہ اس جیتی جاگتی دنیا کا منظر نامہ ہے جس میں جراتِ اظہار سب سے بڑا جرم ہے اور جس کی سزا میں زہر سے سولیوں تک کی داستانیں ارتقائے انسانی کی روایت کا حصہ بن چکی ہیں:

پھنپی ہیں سینکڑوں بد روہیں ان فضاؤں میں
وہ گھورتی ہوئی آنکھیں کہاں خلاؤں میں

زمین کے مالکِ دیرینہ کی تلاش میں ہیں
جراثیموں کے نشاں ہر خمیہ لاش میں ہیں
اور اک عدا چلی آتی ہے ہر جراثیم سے

یہ سارے زخمِ مقدر ہوئے ہیں موت کے بعد
سکونِ لفظ و بیاں و سکوتِ موت کے بعد

نظم زمین کے مالکِ دیرینہ کے انصاف کی دہائی دیتی ہے جہاں ہر زندگی زخمِ خوردہ ہے، جہاں
انسان بار بار مرتا ہے، اور جہاں موت کے بعد بھی جراثیموں کا سلسلہ جاری رہتا ہے / یہ سارے زخمِ مقدر ہوئے

ہیں موت کے بعد سکون لفظ و بیاں و سکوتِ صوت کے بعد کے مصرعے اس بند کو معیناتی طور پر کھیلے بند کی ارتقائی صورت کے طور پر پیش کرتے ہیں، اور مرکزی خیال نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ الفاظ کے درو بست اور تراکیب سازی میں راشد کا اثر نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ مردہ خانہ اگرچہ معر انظم ہے لیکن بندوں میں قوافی کے التزام کے باعث ایک منفرد سہتی نظام کی حامل ہے۔ نظم میں کل چار بند ہیں۔ پہلا بند پانچ مصرعوں اور باقی تینوں بند ایک ایک شعر اور پانچ پانچ مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ پانچ مصرعوں کے تمام بندوں میں یہ التزام ہے کہ شروع کے دو دو اور آخری دو دو مصرعے ہم قافیہ ہیں اور بیچ کا مصرعہ تینوں بندوں میں بے قافیہ ہے اس سے نظم میں ایک سہتی وحدت اور داخلی ارتباط پیدا ہو گیا ہے۔ آخری بند اس فضا پر ختم ہو جاتا ہے :

بڑی بساندے ٹھٹھری ہوئی ہواؤں میں
میں گھر گیا ہوں لہو چاٹتی بلاؤں میں

ایسے میں ایک بریدہ زبان لڑکھرائی ہوئی ڈراؤنی آواز میں سرگوشی کرتی ہے :

تم اپنی لاش لیے بھاگ جاؤ جلدی سے
زندگن سکون کے کہ ہیں موت کے فسانے بہت
متاعِ جسم سلامت کہ مردہ خانے بہت

اس نظم میں صدیوں کے احتجاج کی گونج ہے۔ انسان کے تئیں انسان کے ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کی، کیونکہ کائنات میں جبر و استبداد کا سلسلہ عہدِ عتیق سے جاری ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں ہمارے عہد کی آسلیب اور خوف و دہشت کی کیفیت بھی ہے جہاں ہر لمحہ لہو چاٹتی بلاؤں میں گھرا ہوا ہے ہر انسان اپنی لاش لیے پھر رہا ہے، اور موت کے فسانے ہر طرف ہیں۔ تاہم نظم میں تنبیہ کا تہہ زندگی کا اشاریہ بھی ہے، اس لیے کہ مردہ خانہ کی ٹھٹھری ہوئی ہواؤں سے متاعِ جسم بچا کے لے جانا جہاں تک ممکن ہو سکے ضروری ہے۔

اسی نظموں کا ذائقہ بذی نظموں سے مختلف ہے۔ ان میں زندگی کی ترقیوں اور لغتوں اور تہذیب و آزادی کے مسائل کو من حیث کلی پیش کیا گیا ہے اور ان نظموں کے ساتھ ساتھ ہم موضوعات کی اور ان کو انوکھے طور پر برتنے کی ایک نئی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ساقی کی شاعری موضوعات کی رنگارنگی سے لبریز ہے، اس میں انسان کی ذنایت و خیالیت اور نفسی طوفان اور تہلکوں سے لے کر لطیف ترین کیفیتوں تک کی ترجمانی ملتی ہے۔ مثال کے طور پر باکرہ میں جہاں مرد کے احساس فتح مندی کی بیماریاں دلوں سے پردہ مٹایا گیا ہے وہاں صبح کا شور اس لحاظ سے نہایت فرحت بخش ہے کہ اس میں صبح کی کیفیت کو اچھوتے پیکروں کی مدد سے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حواس میں صحت و مسرت کی گھنٹیاں بج اٹھتی ہیں :

سفاک الارم کلاک
کی خواب دوز آواز
اوس کی صورت پتی پتی
نیند کے پھول پر گر رہی تھی
سونے والے نے

آہستہ آہستہ
اپنی پلکوں کے چمپئی پردے سر کا دیے
اور سورج مکھی کی طرح
اس جگ مگ درتکے کی طرف نگاہ پھیری
جس پردھوپ کے ٹوٹے ہوئے سفید پر
تیز ہوا میں پھر پھڑا رہے تھے،

اس چھوٹی سی نظم میں ایک رذمترہ کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ الارم سے نیند کا کھلنا اور درتکے پر دھوپ کا چمکنا معمولی سی بات ہے لیکن ایک معمولی بات کو شاعر UNIQUE طور پر محسوس کرتا ہے جس طرح ہر آواز سونی صدی دہرائی نہیں جاسکتی یعنی UNIQUE ہوتی ہے، اسی طرح ہر تجربہ بھی UNIQUE ہوتا ہے۔ اچھی شاعری کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ زندگی کی UNIQUENESS کو گرفت میں لینے پر قادر

ہوتی ہے اور اسے موثر بیان کی شکل دے کر لازوال کر دیتی ہے۔ الام کی آواز کو خواب دوز کہنا اور اس کا نیند کے پھول پر اوس کی صورت پتی پتی گرتا منسفر اظہار ہے۔ اسی طرح سونے والے کا اپنی پلکوں کے چمپٹی پردوں کو سرکانا اور درتچے پر دھوپ کے ٹوٹے ہوئے سفید پردوں کا ہوا میں پھڑپھڑانا ایک سامنے کی کیفیت کو نظم کا درجہ دے دیتا ہے۔

شاعر کے سوچنے اور محسوس کرنے کا عمل اگر UNIQUE ہوگا تو اس کا اثر لامحدود اظہار کی پر پڑے گا۔ ساقی کی لفظیات اس کی سپیکر تراشی، اس کا پیرایہ بیان اور اسلوب و اظہار تازہ اور انوکھا اسی لیے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز عام ڈگر سے ہٹا ہوا ہے۔ ایک اور نظم پام کے پٹیرے سے گفتگو کے چند مصرعے دیکھیے۔ نظم کی انوکھی کیفیت تو نام ہی سے ظاہر ہے، مرکزی محرک بے چہرہ انسان کی لا حاصلی اور بے کیفی اور فطرت کے رشتے کی بازیافت ہے:

مجھے سبز حیرت سے کیوں دیکھتے ہو
ذرا اپنے شکھے ہلا دو
مجھے اپنے دامن کی ٹھنڈی ہوا دو
بہت تھک گیا ہوں

یہ بات اگر یوں کہی جاتی کہ مجھے حیرت سے کیوں دیکھتے ہو تو ایک عام سی بات تھی۔ صرف ایک لفظ یعنی سبز کے اضافے نے / مجھے سبز حیرت سے کیوں دیکھتے ہو / اسے شاعری کی سطح عطا کر دی۔ شاعری میں عام زبان استعمال ہوتی ہے، لیکن اس کا استعمال عام نہیں ہوتا۔ ان دونوں باتوں میں فرق ہے۔ شاعری اپنی غذا عام بول چال کی زبان سے نہ لے تو اس کا حشر وہ ہوتا ہے جو شاہ نصیر یا ناسخ کی شاعری کا ہوا۔ یعنی زبان صناعی اور بازی گری کا نثار ہو کر زبرس ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس عام زبان شاعری میں آکر ایک ایسے درجہ حرارت پر پہنچ جاتی ہے، جہاں وہ دہکنے لگتی ہے اور اس سے نئی نئی معنیاتی شعائیں پھوٹ نکلتی ہیں۔ ساقی کے یہاں زبان کی تخلیقیت کا یہ میلان جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے، عام ہے۔ اس کی مثالیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ چند مثالیں بغیر کسی خاص کوشش کے ادھر ادھر سے پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں خط کشیدہ حصے نفلوں کے تخلیقی استعمال، پیکریت، استعارہ سازی اور فزگی بیان کے لیے غور طلب ہیں۔

جو سہاگن بیل برسوں جان رس پیتی رہی
وہ بدن کے موسموں کی آگ سے کہلا گئی

(پیرا سائٹ)

بیوگی کی چپچی چادر پر اپنے مبر سے کراستری
استری کر کے فراموشی کی الماری میں پھینک

... یہ بدن شاداب ہے بیکار و ادیلانہ کر

(داشتہ)

یہ فنا کے گرم بوسوں کے نشان

جل گیا مٹی کا رس

رائگاں سب رائگاں

(پوسٹر)

روشنی روتا ہوا بلب ابھی زندہ ہے ...

رات کے زنیہ پچیاں سے اترنے لگی تنہائی مری

(محاصرہ)

نیند میں بسا ہوا / اس کا مطمئن بدن

بے تہی کے وار سے / میں لہو لہان تھا / ناف تک کھلا رہا

(نامحرم)

جیتا جیتا لہو

ٹیلی ویژن کی شریانوں سے پھوٹ پھوٹ کر

بہہ نکلا ہے

(ایک کتابت)

بدن میں رات پھیلتی جاتی ہے

(خالی بورے میں زخمی بتا)

میں اپنے درد کی ننگی دھوپ سے
گھنٹی تسلی مانگ مانگ کر ہار گیا
مجھے خوابوں کی بسیا کھی دو

(بسیا کھی)

خبروں کی خوں پاشی نے
ایک لمبا سا اریل اگا دیا تھا

(اچنبھا)

دفا
یاد کی شاخِ مرجان سے
پیشی ہوئی ہے

(موت کی خوشبو)

ساتی کی طرف کی بیان کا ایک خاص امتیازی نشان باصرہ کا شدید طور سے بروئے کار آتا ہے۔ وہ باصرہ سے کچھ ایسے انوکھے طریقے سے کام لیتے ہیں کہ احساس و طرفگی اور لطفِ انبساط کی بالکل انجانی اندر ہی سطحیں سامنے آجاتی ہیں۔ ان کے پسکروں اور اظہاری سانچوں میں رنگوں کی خاصی اہمیت ہے۔ ساتی کے یہاں ہر رنگ بعض معنیاتی جہتوں کو لے کر آتا ہے۔ مثال کے طور پر اوپر کے اقتباسات میں بدن کے موسموں کی آگ، بیوگی کی چھپٹی چادر، رات کا زینہ بیچیاں، لے تہی کے وار سے لہولہان، جیتا جیتا لہو، ٹیلی وژن کی شریانوں سے پھوٹ پھوٹ کر بہنا بدن میں رات کا پھیلنا، درد کی ننگی دھوپ، گھنٹی تسلی، خبروں کی خوں پاشی، یاد کی شاخِ مرجان وغیرہ میں متعدد انوکھی تہی اور معنیاتی کیفیتیں رنگوں کے استعمال سے پیدا ہوئی ہیں۔ ساتی کے یہاں رنگوں کو چھو کر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کی اپنی جسمانی اور شخصیت ہے۔ اپنی زبان اور اپنا ڈرامہ ہے۔ نیز دکھ درد، خوشی اور استعجاب، بے بسی و بڑبڑ مدگی اور کڑی دوسری جانی و انجانی کیفیات کے کئی پہلو ایسے ہیں، جنہیں ساتی صرف رنگوں کی زبان میں بیان کرتے ہیں اور کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس میں ایک مکانی بُعد پیدا ہو جاتا ہے، نتیجتاً یہ رنگ فضا میں گھل مل کر جھلملاتے رہتے ہیں، اور احساس کے خلیوں کی گہرائیوں میں جذب ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان اظہاریوں پر نظر ڈالیے :

شبیرہوں کا گھنا جنگل، مٹیالے پیلے خون کا دھبہ، اودا نیلا رنگ،
 کاسنی روشنی، درد کی تاریک فصیل، پیلے پیلے میڈک، مٹیالا تالاب
 بھوری بھاریاں، سیلی گھاس، گلابی کونپلیس، سبز تپیاں،
 سُرخ آب دوزی، تباہی کا کالا سمندر، پلکوں کے چمپئی پردے
 رات کی سلیم پری کا سونے کے گھنگھر و بانہہ کرنا چنا
 بت بھڑکی آگ کا جُجھ جانا، آواز کا اوس کی صورت پتی پتی نیند کے پھول پر گرنا،
 دھوپ کے ٹوٹے ہوئے سفید پروں کا پھڑ پھڑانا، سبز حیرت سے دکھینا
 سانس لیتے گھاس کے میدانوں میں سبز مٹی سے شعاعیں اگنا،
 ادھ کھلے کنول کا دیکھنے والوں کی آنکھوں میں دھنک کھلانا،
 سبز گدے سوگ ساگر میں لہریں بنانا اور پانی کا ٹنا، چاندی کٹوروں سے پھیلنا

تجلی کی سنہری تپوں کا گرنا، کیا یہ ایسے اظہار کیے نہیں ہیں جن کی رنگ آشنائی ذہن پر ایک
 خاص اثر چھوڑ جاتی ہے۔ یہ صرف باصرہ کی بیداری کا عمل نہیں، بلکہ پورے احساس و وجود کا باصرہ میں کھینچ آنا
 ہے۔ اس سے اظہار و بیان میں جو رنگ سامانی پیدا ہوتی ہے، وہ ساقی کے شعری مزاج کے لیے کلیدی حوالے
 کا حکم رکھتی ہے۔

اس وضاحت کے بعد اب ان خاص نظموں کو لیا جاسکتا ہے جو ساقی کے شعری سفر میں ایک واضح
 ارتقا کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ تمام نظمیں پچھلے چار پانچ برسوں میں کہی گئی ہیں۔ ساقی ایک طویل مدت کے بعد
 ۱۹۷۵ء میں ہندوستان پاکستان آئے تھے، اس زمانے میں وہ شیر امداد علی کا میڈک بکھ چکے تھے جسے
 مختلف انجیال لوگوں نے پسند کیا، سفر سے بھی ترغیب دہنی ملی ہوگی۔ چنانچہ ان چھ برسوں میں انہوں نے کئی خاص
 نظمیں لکھی ہیں۔ ایک کتا نظم، ایک سور سے، سسر مار یا ترنیرا، خرگوش کی سرگزشت، مجھے جزیرہ ملے، تالی
 بورے میں زخمی بلا اور شاہ صاحب اینڈ سنٹر، ایک کتا نظم میں جس لوگوں کی بردباری اور علمائیت پر طنز کیا

ہے۔ مجھے جزیرہ ملے ماہ زدگی کی تمثیلی داستان ہے جو ساحلوں کے بوسے یعنی خواہشوں کی کیمیل کے لیے ہوا کے چلنے کی منتظر ہے۔ بیابان کا بنیادی جذبہ قیدِ خوف سے رہائی پانے کی تمنا ہے جو خواہوں کی بیابانھی چاہتا ہے۔ یہ سب مختصر نظیں ہیں۔ ان کے مقابلے میں شیر امداد علی کا میدان، ایک سورت سے، سسٹرماریا تریزا، خمر گوشت کی سرگزشت اور شاہ صاحب اینڈ سنز نسبتاً طویل نظیں ہیں، اور تاثیر کے اعتبار سے زیادہ بھرپور ہیں۔ ان میں سے شیر امداد علی کا میدان اور سسٹرماریا تریزا کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ البتہ باقی تین پر ذیل میں نظر ڈالی جاگی۔ ایک سورت سے اس لحاظ سے عجیب و غریب نظم ہے کہ اس کے عنوان سے ہی ایک تحیرناک کیفیت سامنے آتی ہے اور تنقیر کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ غالباً اسی بنا پر بعض حضرات نے اس کی اشاعت کو مناسب نہیں سمجھا، حالانکہ یہ نظم سیدھی سادی PREJUDICE & COMMUNICATION یعنی تعصب اور تکلم پر ہے سورت کا استعارہ غالباً اس لیے کہ ایک تو اس سے شدید نفرت کا اظہار ہوتا ہے، دوسرے سورت تکلم کی نفی بھی ہے، یعنی یہ گرد و پیش سے بے نیاز زمین سے تھو تھنی چپکائے چلتا رہتا ہے۔

وہ طلسمی دوپہر تھی
سانس لیتے گھاس کے میدان میں
سبز مٹی سے شعاعیں اگ رہی تھیں
اور تم کرنوں میں
اپنے تھو تھنے کاڑے ہوئے
ذذنا تے پھر رہے تھے

ساتی کی اس خصوصیت کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ وہ آسمان میں توسیع کے عمل سے سبکدوش خلق کرتے ہیں۔ دوپہر کے ساتھ طلسمی کے افسانے سے تمثیلی کیفیت پیدا ہوگئی۔ گھاس کا میدان عام زبان ہے۔ / سانس لیتے گھاس کے میدان میں / کہنے سے گھاس کا میدان زندہ ہو کر سامنے آگیا۔ اس کے بعد گھاس کی رعایت سے مٹی نہیں بلکہ / سبز مٹی سے شعاعیں اگ رہی تھیں / کہنے سے دوپہر، گھاس کے میدان اور دھوپ کے لیے تازہ کار سبکدوش تراشنے کا عمل پورا ہو گیا۔ یہ مصرعے نظم کے آخر میں بھی دہرائے گئے ہیں، گویا ان کا کچھ نہ کچھ ربط مسرت اور بھبت کی اس فضا سے بھی ہے جو نظم کے خاتمے پر سامنے آتی ہے۔ اس کے بعد کسی کے

کرنوں میں تھو تھنے گاڑے ہوئے دندنا تے پھرنے کی تصویر ہے۔ گویا کوئی بے نیازانہ اپنے جبلی تقاضے پورے کرنے میں مصروف ہے۔ دوسرے بند میں تکلم کا ذکر ہے جو ”سور“ کی کھال کے جوتے پہنے (جو شدید نفرت کے اظہار کی ایک شکل ہے) کینے اور برتری کا شکار کیلئے بیچھا کر ڈھ رہا ہے یہ کسی طرح تکلم کا آغاز کرنا چاہتا ہے۔ تیسرے بند میں تکلم کے آغاز سے تعصب کے مارے ہوئے شخص کے اندر تملیاں سی اڑنے لگتی ہیں اور نظم کے آخری حصے میں اس ایسی مسرت اور نئی لذت کا ذکر ہے جو تعصب، انا یا برتری کی زمین سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا تضاد نظم میں بے نیازی اور معصومیت سے ہے۔ چنانچہ تکلم کے رابطے سے زندہ وہی ہوا ٹھتا ہے جو اس سے پہلے اپنی انا کے ہاتھوں مر جا رہا تھا۔ اس فتح مندی اور دوستی کے احساس سے اب دوپہر، طلسمی دوپہر لگتی ہے اور گھاس کا میدان سانس لیتا نظر آتا ہے اور دھوپ کے سونے سے شعاعیں اگنے کے باعث سارا منظر گویا حُسن، شادمانی اور ہجرت سے سرشار نظر آتا ہے :

وہ جو نفرت کی کمائی
دل کی تہ میں گرہ لگتی تھی
ٹوٹتی جاتی تھی
میرے اندر کی کلیں کھلنے لگی تھیں
میں کھیلتا جا رہا تھا

وہ ہماری دوستی
وہ ہماری فتح مندی کا جہنم دن تھا
وہ طلسمی دوپہر
... سانس لیتے گھاس کے میدان میں
سبز مٹی سے شعاعیں اگ رہی تھیں

دوسری نظم خرگوش کی سرگزشت کے دو حصے ہیں۔ رقص اور موت، رقص میں بھوری جھاڑیاں اور پیلی گھاس کے جنگل کا گودام کھلا ہے۔ اس میں فطرت کی آزادی کی ایسی فضا ہے جہاں پوری کائنات

سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ اس نظم کا بنیادی خیال وہاں کھلتا ہے جہاں خرگوش سے / اپنے بے گل نمقنوں میں /
اس خوشبو کا پھلا ڈال کے رقص کرو / کے بعد کہا جاتا ہے۔

ہر خطرے کو حکیمہ دو
چور چٹانوں کے نیچے
سودر وارے ہیں
کیسر کھوپڑوں کے بستر ہیں
دھوم مچانے کو سارا میدان پڑا ہے

کیسر کھوپڑوں سے پہلے سرخ کوپلوں، سبز پتیوں، سانپ چھتر لوں اور پیلی گھاس اور بھوری جھاڑیوں
کا ذکر آچکا ہے جس سے نظم کے کائناتی آہنگ کی تصدیق ہوتی ہے۔ پہلا حصہ گویا دعوت ہے۔ کائنات سے جی
بھر کے لطف اندوز ہونے کی اور لطف و مسرت کی خاطر خطروں کو مول لینے کی۔ دوسرے حصے کا عنوان ہے موت،
جس میں بیاباں کے اندھیرے میں رقص کرنے والا خرگوش خون میں لت پت پڑا ہے۔ ساقی یہاں انسانی فطرت
کے ایک راز کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ تجسس میں ایسی کشش ہے کہ انسان جان پر بھی کھیل جاتا ہے۔ انسانی
ارتقا کی ساری کہانی ان دیکھی دنیاؤں کو اسیر کرنے کی کوشش سے عبارت ہے:

نامعلوم کو تسخیر کرنے کی تمنا کس لیے ہے
اس پرانی آرزو مندی میں کیا ہے
اس خیابان کے عقب میں
وہ جو پراسرار دنیا میں بسی ہیں
وہ ہمیں کیوں کھینچتی ہیں؟

نامعلوم کو تسخیر کرنے کی تمنا میں انسان کو کبھی کبھی اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں، لیکن وہ باز نہیں
آتا اور وہ اس کی کشش سے برا بھینچتا ہے۔ اس کے لیے وہ آرام و آسائش کو بھی تھج دیتا ہے۔ اور طرح

طرح کے خطرات کو بھی مول لیتا ہے۔ اہم نہیں کہ جنگل میں کیا نہیں تھا جہاں اس کی حکمرانی تھی بلکہ خواب کی دیواروں کے اس پار کیا ہے۔ یہ وہ آرزو مندی ہے جو انسان کو ہمیشہ پر اسرار دنیاؤں کی کھوج میں سرگرم رکھتی ہے۔

تیسری اہم نظم شاہ صاحب اینڈ سنر ہے۔ اس کا مرکزی کردار شاہ صاحب ہیں جن کی آنکھوں کی روشنی عمر کے ساتھ ساتھ جاتی رہتی ہے۔

شاہ صاحب خوش نظر تھے

خوش ادا تھے

اور ریزی کے اندھیرے راستوں پر

صبر کی ٹوٹی ہوئی چپٹیل ہیں کر

اک لاک ایک طنطنے کے ساتھ سرگرم سفر تھے

اور حبیبی کے مرض میں مبتلا تھے

جو غذائیں دسترس میں تھیں

عجب بے نیور تھیں

ان میں نوکاری نہ تھی

وہ جو موتی کی سی آب آنکھوں میں تھی

جانی رہی

صرف دشمن روشنی کا انتظار

زندگانی غزوہ خندق ہوئی

اس قدر دیکھا کہ نابینا ہوئے

صبر کی ٹوٹی ہوئی چپٹیل سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ کامیاب کاروباری ذہنیت کا تقاضا

یہی ہے کہ ظاہر اور باطن میں امتیاز ہے۔ یاد رہنا چاہیے کہ صبر کی ٹوٹی ہوئی چپٹیل کے باوجود شاہ صاحب

روزی کے اندھیرے راستوں پر اک لک اک ٹنٹنے کے ساتھ سرگرم سفر تھے اور اس سے بھی اہم یہ ہے کہ شاہ صاحب / جینے کے مرض میں مبتلا تھے / جینے کا مرض ہی تو اصل مرض ہے کیوں کہ جیسے جیسے جینے کی ہوس بڑھتی ہے، ریاکاری اور خود غرضی بڑھتی ہے اور طمع کی دنیا میں انسان اندھا ہونے لگتا ہے۔ بات شاہ صاحب کے خوش نظر، خوش ادا ہونے سے شروع ہوئی تھی۔ یہ ضروری بھی ہے کیونکہ نظم کا سفر اندھے پن یا دنیایت کی تاریکی کی طرف ہے۔ یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے کہ ساتی جہاں ضروری ہوتا ہے صوتی مناسبتوں اور آہنگ کے زریعہ سے کام لینا جانتے ہیں۔ اس ایک بند میں بھی کئی مقامات ایسے ہیں / شاہ صاحب خوش نظر تھے / خوش ادا تھے / میں صغیری آواز / اش / کے بار بار آنے سے صوتی حسن کاری کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ل لک اور طن طن تو صوتی جھنکار کے الفاظ ہیں ہی، لیکن / صیر / ساتھ / سرگرم / سفر / میں / اس / کی کارفرمائی صاف ظاہر ہے۔ اسی طرح / مرض / مبتلا / میں / ام / اور بے نور / نموداری میں / ان / اور / آب / آنکھوں / میں / آ / اور ایسی دوسری مناسبتوں سے پوری نظم خوش آہنگی اور حسن کاری سے مملو ہے۔

دوسرے بند میں نظم اپنے عروج کی طرف آتی ہے۔ اس میں استعاراتی طور پر تہذیب اندھے ہونے کی اہم ناک کیفیت ہے جو خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر ملتی ہے۔ تیسرے بند میں نابینا ہونے کے عمل کا اتنا ہی شدید تمثیلی رد عمل ہے۔

... اور جب رازق نگاہوں میں
سیاہی کی سلانی پھر گئی
پھتتا آنکھوں سے
تجلی کی سنہری پتیاں گرنے لگیں
تو شاہ صاحب اور بے سایہ ہوئے
ان کی اندھی منتقم آنکھوں میں دنیا
ایک قاتل کی طرح سے جھم گئی
جیسے مرتے سانپ کی آنکھوں میں
اپنے اجنبی دشمن کا عکس

یہاں سے نظم کا موثر شروع ہوتا ہے۔ جب شاہ صاحب نابینا ہو گئے تو ان کا وجود انتقام کی آگ میں جلنے لگا۔ دنیا اب ان کے لیے قاتل تھی۔ جینے کے مرض میں مبتلا ہونے سے دنیا سے جو گہری ہم آہنگی اور جو گہرا رشتہ تھا، وہ ٹوٹنے لگا۔ چاروں طرف بکھری ہوئی چیزوں سے، انسانوں سے، عزیزوں سے ہمدی کا سلسلا بگوا یا ختم ہو گیا :

جگمگاتی بے قرار آنکھیں
 کسی سہمے ہوئے گھونگھے کے ہاتھوں کی طرح
 دیکھتی تھیں سو گھتی تھیں لمس کرتی تھیں
 وہی جاتی رہی تو زندگی سے رابطہ جاتا رہا
 ہمدی کا سلسلہ جاتا رہا
 وہ جواک گہرا حلق
 اک امربندھ سا
 چاروں طرف بکھری ہوئی چیزوں سے تھا
 سنتے ہوئے روتے ہوئے لوگوں سے تھا
 اس طرح ٹوٹا کہ جیسے
 شیر کی اک جست سے
 زبرے کی رڑھ کی ہڈی پٹخ جاتی ہے

ساقی نے نظم میں مرکزی خیال کو اندھے پن کی استعاراتی اور شبیلی کیفیات اور شدید المیہ احساس کے ذریعے درجہ بدرجہ بیان کیا ہے اور رفتہ رفتہ بڑھایا اور بھیلایا ہے۔ نظم کی پُر تاثیر میں اس کی پیکری فضا اور انہاری حسن کاری کے علاوہ بندوں کے آخر کی ڈرامائیت کا بھی ہاتھ ہے۔ اس بند کے آخر میں بھی دنیا سے تعلق کے ٹوٹنے کو ایک انتہائی متحرک پیکر کے ذریعے بیان کیا ہے۔ شیر کی جست اندھے پن کی یلغار ہے اور زبرے کی رڑھ کی ہڈی کے چٹخنے سے مراد ماضی اور کائنات اور کائنات کی اشیا اور انسانوں سے ربط کا یکسخت ٹوٹنا ہے۔ اب سماج سے بے تعلق مکمل ہے۔ وہی شخص جو ایک لک اور طنطنے کے ساتھ سماج میں رواں دواں تھا اور

جو اس کی بہت سے بہرہ اندوز تھا اگرچہ زندہ اب بھی ہے، لیکن صرف ایک چیز نہ رہنے سے سماج نے اس طرح اس کو اپنے اندر سے نکال کر پھینک دیا ہے جیسے موج سپیدی کو ساحل پر اچھال کر سمندر سے الگ کر دیتی ہے۔ اسی سماج نے جس کا ایک لازمی جزو شاہ صاحب تھے، اندھا ہونے کے بعد شاہ صاحب کو کلیتہً مسترد کر دیا۔ گویا انسان جب تک بعض شرائط کو پورا کرتا ہے یا ان اوصاف سے متصف رہتا ہے جس سے سماج میں اس کی پہچان ہے، سماج اس کو قبول کرتا ہے، لیکن اگر ان صفات میں کچھ کمی آجائے تو سماج کو اسے مرفوض سمجھ کر الگ کر دینے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی، کیونکہ اصل المیہ سماج کا نہیں انسان کا ہے۔ سماج سے مسترد ہو جانے کے بعد انسان اپنی رہی سہی شخصیت اور انسانی اقتدار سے بھی رفتہ رفتہ محروم ہونے لگتا ہے، اور بالآخر چاہتا ہے کہ دوسرے بھی اس کی طرح سماج کے حصہ دار نہ رہیں، اور ہر شے سے محروم ہو جائیں۔ نظم یوں اختتام پذیر ہوتی ہے:

ایک دن آنکھوں میں صحرا جل اٹھا
وہ خیال آیا کہ تہہ سر جل اٹھا
اپنے بیٹوں کو کلیجے سے لگایا
جی بھرا تھا ابر کی مانند روئے
رو چکے تو ایک مہلک آتشیں تیز ابر کے
شعلہ سفاک سے
ان کی فاقہ سنج آنکھوں کو جلایا
اور سجدے میں گرے

اندھے پن کی کیفیت پوری نظم کا مرکزی استعارہ ہے۔ بیٹوں کو اندھا کر دینے کا عمل انسان کی اس خواہش کا غماز ہے کہ اگر وہ خود معذور رہے تو دوسروں کو بھی معذور دیکھنا چاہتا ہے، یا اگر وہ خود سماج یا زندگی سے کٹ گیا ہے تو دوسروں کو بھی اس سے الگ کر دینا چاہتا ہے اس کے لیے انسان مہلک سے مہلک حربوں کو استعمال کر سکتا ہے اور خون کا رشتہ بھی مانع نہیں آتا۔ یہ نظم چونکہ تمثیلی ہے اس میں معنیاتی جہتوں کے جواز کا امکان بھی ہے مثلاً طمع دنیا کے الم ناک مدارج اور عبرت ناک انجام وغیرہ۔ اس سے اگرچہ نظم کی نوعیت اخلاقی ہو جاتی ہے، لیکن اہمیت نوعیت کی نہیں بلکہ موضوع کے برتاؤ کی ہے جو ہر لحاظ سے نیا ہے۔ ایک اور معنوی امکان تفسیر

پذیر صحتی معاشرے میں انسان کا اپنی شخصیت سے محروم ہونا، بے چہرہ ہونا یا بے روح ہونا ہو سکتا ہے اور اس کے منطقی نتائج کی نشاندہی بھی نظم کے ذریعے ممکن ہے۔ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ نظم بیٹوں یا نوجوانوں پر ختم ہوتی ہے، جس کی مایوس کن تعبیر سامنے کی بات ہے۔ لیکن جب سماج کی صنعتی ہلاکت خیزی کا سارا ارتقا ہی انسان کی سالمیت کی مخالفت میں ہے تو کیا ہم کسی بشارت یا اصل کی توقع کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ ساقی ان معاملوں میں غالباً چھ خوف کے ہم نوا ہیں کہ فن کار کا کام سوال اٹھانا یا مسائل کو اس طرح پیش کر دینا ہے کہ دوسرے ان سے صرف نظر نہ کر سکیں۔ نظم بہر حال نہایت پُر تاثیر، بھرپور اور معنیاتی طور پر اطمینان بخش اور مکمل ہے۔ نظم جو خوش نظری کے ذکر سے شروع ہوتی تھی۔ نظری محرومی اور نظری خیرات کے دل دوز منظر پر ختم ہوتی ہے۔ شروع کے مصرعوں میں /ش / کی خوش آہنگی تھی، خاتمہ

”اے سخی شہر سخاوت میں گذرا وقت کر
اے نظر دالے نظر خیرات کر“

از / کی گھبراہٹ اور کئی کھراہٹ پر ہوتا ہے۔ دونوں آوازیں صغیر ہی ہیں، لیکن پہلی غیر مسموع دوسری مسموع ہے۔ مسموع آوازیں گہرائی اور بھاری پن کا تاثر پیدا کرتی ہیں اور نظم کے المناک انجام سے ہم آہنگ ہیں۔ ان چند نظموں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ساقی اس وقت زندگی کو کس طرح دیکھ رہے ہیں اور ان کی شاعری کن منزلوں کا پتہ دے رہی ہے۔ شاہ صاحب اینڈ سنز، شیر امداد علی کامیونک، سسٹرماریا تریزا، خرمکوش کی سرگزشت اور ایک سور سے پھیلی نظموں سے کہیں زیادہ بھرپور اور مکمل نظمیں ہیں۔ تہ دار اور پُر تاثیر، جن میں خیال کا ارتقاء، نشوونما اور تمام سب پر پوری توجہ کی گئی ہے۔ جس طرح مردہ خانہ پہلے مجموعہ کی نمائندہ ترین نظم ہے، اسی طرح یہ چند نظمیں بشمول امانت کے اس مجموعے کی بہترین نظمیں ہیں۔ ان میں ساقی کے شعری مزاج کا ایک رُخ یا ایک پہلو نہیں بلکہ ان کی پوری شعری شخصیت سامنے آتی ہے۔

ساقی غزل پر اب اتنی توجہ نہیں کرتے جتنی وہ پہلے کرتے ہیں۔ ان کے پہلے مجموعے میں تین گنت غزلیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ساقی کی بعض غزلیں ابھی ہیں اور چند اشعار کو تو قبول عام کے دربار سے خلعتِ فاخرہ بھی عطا ہو چکی ہے۔ اگرچہ ساقی کی غزل پر اس مضمون میں اتنی توجہ نہیں کی جاسکتی جتنی اس کا حق ہے، تاہم چونکہ اقتاد ذہنی اور مزاج شعری کے اعتبار سے ان کی غزل، نظم سے الگ نہیں، چند منتخب اشعار یہاں

درج کیے جاتے ہیں۔ ان میں بھی ساتی کی نئی لفظیات اور کائناتی آہنگ سے وابستہ پیکریت اور استعارہ سازی صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ غزل میں استعمال ہونے والے ان کے تین چار خاص معنوی سٹبلوں ہیں۔

- ۱۔ صحرا، دشت، ریت، پیاس، غبار، ہسٹی، خاک، گھٹا، بادل، موسم
- ۲۔ لہو، خون، شعلہ، بدن کی آگ، دھنک، زنگ
- ۳۔ آواز، طوفان، خاموشی، خواب، تنہائی
- ۴۔ مُردہ، موت، بین، نوحہ، پرچھائیں، سسکی، درد، آسیب، خوف، رات
اُداسی، گریہ۔

میں وہی دشت ہمیشہ کا ترسنے والا
تو مگر کون سا بادل ہے برسنے والا

ریت کی صورت جہاں پیاسی تھی آنکھ ہماری نم نہ ہوئی
تیری دردگاری سے بھی رُوح کی الجھن کم نہ ہوئی
میری صحرا از محبت اب رسیہ کو ڈھونڈتی ہے
ایک جنم کی پیاسی تھی، اک بوند سے تازہ دم نہ ہوئی

میں پیاس کا صحرا ہوں ترسنے کے لیے ہوں
تو کالی گھٹا ہے تو برس کیوں نہیں جاتی

اے صاحبانِ شہرِ اُداس اس قدر نہ ہو
وہ دیکھنا غبار کوئی خوش خبر نہ ہو

میں وہ مُردہ ہوں کہ آنکھیں مری زندگی سی
بین کرتا ہوں کہ میں اپنا ہی ثانی نکلا

مٹی تھی خفا، موج اٹھالے گئی ہمس کو
مگر داب میں ساحل کی بلا لے گئی ہمس کو

مجھے خبر ہے کہ اک مُشتِ خاک ہوں پھر بھی
تو کیا سمجھ کے ہوا میں اڑا رہا ہے مجھے!

شاخ سے ٹوٹ کے بے حرمت ہیں ویسے بھی بے حرمت تھے
ہم گرتے پتوں پہ ملامت کسب موسم موسم نہ ہوئی

خامشی چھڑ رہی ہے کوئی نوحہ اپنا
ٹوٹتا جاتا ہے آواز سے رشتہ اپنا
ان ہواؤں میں یہ سسکی کی صدا کیسی ہے
بہن کرتا ہے کوئی درد پُرانا اپنا

یہ لوگ خواب میں بھی بربہنہ نہیں ہوئے
یہ بد نصیب تو کبھی تہنہ نہیں ہوئے
تیرے بدن کی آگ سے آنکھوں میں ہے دھنک
اپنے لہو سے رنگ یہ پیدا نہیں ہوئے

دامن میں آنسوؤں کا ذخیرہ نہ کرا بھی
یہ صبر کا مقام ہے، مگر یہ نہ کرا بھی
جس کی سخاوتوں کی زمانے میں دھوم ہے
وہ ہاتھ سو گیا ہے تقاضا نہ کرا بھی

نظریں جلا کے دیکھ مناظر کی آگ میں اسرارِ کائنات سے پردہ نہ کر ابھی

ساتی کا تخلیقی سفر ان میں بائیس برسوں میں دو واضح موڑوں سے گزرا ہے۔ نئی شاعری کی ہنگامہ خیز لہروں کے زمانے میں ساتی کی آواز ایک ایسے شاعر کی آواز کے طور پر گونجی تھی جس نے معرّٰی نظم کے نئے امکانات کی خبر دی تھی۔ پیاس کا صحرا میں زیادہ تعداد معرّٰی نظموں ہی کی ہے۔ یہ معرّٰی نظمیں اکثر دو بیتہ مختصر ہیں۔ اس دور میں شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے اتنی بڑی تعداد میں معرّٰی نظمیں کہی ہوں۔ ساتی کی اس زمانے کی کامیاب ترین نظمیں معرّٰی ہی ہیں جو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۶ء کے درمیان کہی گئیں۔ اس کے بعد ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۵ء تک کا زمانہ ٹھہراؤ کا زمانہ ہے۔ اس میں ساتی زیادہ تر آزاد نظمیں کہتے رہے، لیکن ان میں وہ تخلیقی ارتعاش یا پھٹ پڑنے یا برسنے کی کیفیت نہیں جو معرّٰی نظموں میں ہے۔ ساتی کی باغی طبیعت جو ہمیشہ نئی راہوں اور نئی ادلیوں کی تلاش میں رہی، اسے پھر ایک موقع ۷۵ء۔ ۱۹۷۴ء کے لگ بھگ ملا۔ اس زمانے میں کچھ انگریزی شاعری کے اثر سے کچھ طبیعت کے تقاضے سے اور کچھ اس لیے کہ اردو میں نثری نظم کی بحث شروع ہو چکی تھی، ساتی کی باغی طبیعت نے نثری نظم میں کشش محسوس کی، اور اسے برتنا شروع کیا اور جلد اس میں بھی اپنی انفرادیت کے لیے گنجائش پیدا کر لی۔ اردو میں نثری نظمیں کہی جا رہی تھیں، لیکن زیادہ تر مختصر اور تاثراتی نظمیں تھیں۔ ساتی نے طویل نثری نظمیں لکھیں، اور یہ اس پائیدگی ہیں کہ ان کا شمار اس دور کی اعلیٰ نثری نظموں میں ہو سکتا ہے۔

ساتی کے ذہن میں اب بھی کہیں نہ کہیں آسید کا کوئی سایہ لہزاں ہے لیکن غالباً اس کی نوعیت نجی نہیں۔ یہ مشینی دور کی سفاکی اور ایٹمی دہشت کی دین بھی ہو سکتا ہے جس میں انسانیت کا مستقبل وقت کا سب سے بڑا سوالیہ نشان بن گیا ہے۔ چنانچہ ساتی خوف، خدشے یا دردِ عالم سے مقابلے کے لیے زمین یا وجود کی طبیعی جزوں کی طرف بار بار لوٹتے ہیں۔ ان کی شدید ترین خواہش جیسا کہ کہا گیا ہے مٹی کا بلاوہ ہے جو دو خاص طرح سے اظہار کی راہیں ڈھونڈتا ہے۔ زمینی رشتوں کا سب سے بنیادی اظہار بدن سے وابستگی ہے۔ چنانچہ ساتی کے یہاں بدن کا رنگ زارا مہ، شامہ اور باصرہ کی نئی آگاہیوں کے ساتھ سامنے آتا ہے اور ان کی کئی نظموں میں بدن کی نعمتوں اور لطفوں کے خزینے زندگی کی فعال اور توانا علامت کے طور پر کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مٹی کے بلاوے کا دوسرا رخ کائناتی ہے، یعنی چاروں طرف بکھری ہوئی اشیاء، سما اور اشکال سے گہرے رابطے اور واسطے کا، علائق اور علامت کے یہ دائرے جیسا کہ بتایا گیا ہے گھاس کے میدانوں، بھوری جھاروں،

گلابی کونپلوں، سانپ پھیر لویں، کیسکر کیار لویں، جیل کنجیوں، پیپل کے پتوں، سنہری تپوں، اوس کی بوندوں
 آدھ کھلے کنولوں، سہاگن بلیوں، گھنے جنگلوں اور آنکھوں میں دھنک کھلانے والی بہاروں سے لے کر پیلے پیلے
 سینڈلوں، زخمی بلوں، دم سادھے کتوں، چیتے کی عیار آنکھوں، ذذنا تے سُوروں اور خون میں لت پت خرگوشوں
 اور ان سے بھی آگے بڑھ کر دوسرے جانداروں یعنی شیر امداد علی، جان محمد خان، ماریا تریزا اور شاہ صاحب
 اور ان کے بیٹوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ رابطے ذات اور نچ کے مسائل سے ہٹ کر بڑھتے اور پھیلتے ہیں۔ نتیجتاً
 ان سے زمین زندگی اور ذات کے جن خارجی و داخلی مسائل کا شور و شر پیدا ہوتا ہے، وہ ساقی کے کائناتی
 آہنگ کی تشکیل کرتا ہے۔ بدن کی لطافتوں کی نمو کاری اور زمینی ظواہر و کوائف کے رابطوں کا کائناتی
 آہنگ، یہ دونوں ساقی کی شاعری کے ایسے امتیازات ہیں جن کے باعث ان کا قد متعدد دوسرے سمحصروں
 سے نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک عصر کے اثرات کا تعلق ہے، شاعر کی پہلی بغاوت اپنے فوری ماضی
 سے ہوتی ہے۔ اس عہد میں نظم میں تین آدازیں خاص رہی ہیں، میراجی، راشد اور فیض۔ فیض کے اثرات
 کا زمانہ ساتھ ساتھ جاری رہا۔ ساقی کی شاعری تاریخی اعتبار سے بعد کی چیز ہے۔ جدید شاعروں
 پر سب سے واضح اثر میراجی کا رہا ہے۔ ساقی کی مہر سانچوں سے دلچسپی میراجی کی یاد دلاتی ہے، نیز سرب کا سایہ
 جیسی نظموں میں میراجی کے لہجے کی گونج سنی جاسکتی ہے۔ لیکن ساقی کی آگ، ان کی توانائی اور ان کا جوشِ نمو
 انھیں بالکل دوسری راہوں کی طرف لے گیا۔ ساقی خود کلامی اور سرگوشیوں کے شاعر ہو ہی نہیں سکتے۔ وہ ذات
 سے باہر رابطوں اور تعلقات کے شاعر ہیں جس نے انھیں خود کلامی کے بجائے ہم کلامی کی راہ پر ڈال دیا۔ راشد کی
 اہمیت کا اعتراف تو جدید شاعری کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا، لیکن راشد کی بازیافت کہیں ۱۹۶۵ء کے بعد
 شروع ہوئی۔ سپیکر تراشی، غیر رسمیت اور حسنِ کارگی اعتبار سے ساقی راشد کے قبیلے کے شاعر ہیں لیکن راشد کی
 لفظیات اور موضوعات سے انھوں نے عمداً گریز کیا، اور اپنی پہچان اپنی امتدادِ طبع کے بل بوتے پر کرائی۔ اگرچہ
 بغاوت کا جذبہ اور رسمیات سے انحراف کی لئے مشترک ہے، لیکن ساقی کے یہاں رابطے و ابلاغ کی خواہش
 دوسرا رنگ پیدا کرتی ہے، ساقی کا لہجہ، ان کی لفظیات، ان کے علامہ سپیکر اور ان کا نظامِ فکر ان کا اپنا
 ہے۔ ساقی کی توانائی، تازگی، تہ داری، خوش سلینگی، حسنِ کاری، بدنی کیفیت اور کائناتی آہنگ
 انھیں اپنے عہد کے تصادم اور اثرات کے باوصف ایک منفرد شاعر کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ وہ وطن سے ہزاروں
 میل دور ہیں، ان کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ ان کے شعری امتیازات کے پیش نظر یہ خواہش ناگزیر سی ہے کہ خدا
 ان کے سینے کی آگ روشن رکھے اور وہ اسی طرح نظم کے نئے امکانات کی خبر دیتے رہیں۔ (۱۹۷۹ء)

اِفْتِخَارِ عَارِفٍ

شہرِ مِثَالُ کَا دَرْدَمُد شَاعِرُ

زُنْدِ گُی کے نہاں خانوں میں اُتر کر دکھیے تو بے زمینوں کے کسی سلسلے صدیوں کے اُسطِ پھیر
میں اپنے سینوں کے راز کھولتے ہوئے ملیں گے۔ کسی کے آغاز و انجام وقت کے دھند لکوں میں کھو گئے اور
کسی انسانیت کے لیے نشانِ شرف بن کر تاریخ کے اوراق کو جگمگا گئے۔ جلا وطنیاں صرف زمینوں، زمانوں،
آبادیوں اور بستیوں سے نہیں ہوتیں، خود اپنی ذات سے بھی ہوتی ہیں۔ پاؤں صرف چلنے کے لیے ہیں، قدموں
سے ہم صرف مکاں تاپتے ہیں، مکاں چلتے ہیں، لیکن ذہن جست لگاتا ہے اور اکن و احد میں وجود کہاں سے کہاں
پہنچ جاتا ہے۔ ساری زمینیں اور زمانے اپنی بساط تہہ کر لیتے ہیں۔ کائنات سمٹ کر نقطہ بن جاتی ہے یا پھر
کراں تا کراں پھیلا ہوا ایک لامختتم بھید، فن معلوم اور نامعلوم کے ایسے ہی مقامات پر ختم لیتا ہے جو ذات اور
کائنات میں بھی ہیں اور ذات اور کائنات سے باہر بھی۔ فن کا سفر موجود سے لا موجود اور لا موجود سے
موجود کا سفر ہے جس میں مانوس چہروں، تجرلوں، مقاموں، زمانوں کی تقلیب ہوتی ہے اور اس کا برعکس
بھی صحیح ہے یعنی ذہنی جزیروں کی نامانوس تخلیق مانوس قالب اختیار کرنے میں سرگرم سفر رہتی ہے۔ کبھی
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ذہنی اور زمینی تنہائیوں اور جلا وطنیوں کے رشتے مل جاتے ہیں اور ان سے نئی نئی
کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں، شخصیت اور سوانح اپنی جگہ اہم ہیں لیکن بنیادی چیز وہ اظہاری قوت ہے جس کے
تحت یہ اردو کے تمام عوامل فن میں بروئے کار آتے ہیں اور شعر و ادب کی فہم و تحسین میں اصولاً سارے حوالے

اسی سے نکلتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو افتخار عارف کے یہاں کسی کیفیتیں دوسروں سے بالکل الگ ملیں گی۔
 اول تو ایک مخلص فنکار کا کرب جو انسان سے کوٹ کر محبت کرتا ہے، جو زندگی کا متوالا ہے اور درد کے رشتوں
 کو سمجھنا چاہتا ہے، جو زندگی، سماج، معاشرے میں شریک بھی ہے اور ان سے باہر بھی، کیونکہ سنگدل بے تعلقی یا
 جلا وطنی کے بغیر درد کا عرفان ممکن نہیں، دوسرے بے مکانی یا بے گھری کا دکھ جو ذرا فرینش سے اولادِ آدم کی
 میراث ہے، جس کے تحت اُسے جنتوں سے نکالا گیا اور اُس نے آسمانوں اور زمینوں کا سفر کیا اور جس کی
 وجہ سے انسان کی رُوح کو آج تک قرار نصیب نہیں اور وہ تخرک اور تہمت کی راہوں میں سرگرم سفر ہے۔
 یہ بے مکانی یا بے گھری سب لذتوں کی لذت اور سب دکھوں کا دکھ ہے۔ حق بات یہ ہے کہ احساس کے ان
 دونوں منطوقوں میں جن کا ذکر اور پر کیا گیا جبر کا رشتہ مشترک ہے۔ دکھ درد کا وجود جبر ہی سے ہے جہاں جبر
 ہے، کسی نہ کسی درد کا رشتہ ضرور ہو گا اور جہاں درد ہے وہاں کوئی نہ کوئی جبر ضرور کار فرما ہو گا، خارجی یا
 باطنی۔ خواہ وہ وجود کا ناگزیر جبر ہو یا سیاسی، فکری نظام، مسلک یا طریق کا خارج سے مسلط کیا ہو جبر۔ جبر
 زندگی کی نفی ہے، جبر آزادی کی ضد ہے، جبر کی فضا میں جن چیزوں کی پرورش ہوتی ہے وہ سب کی سب زندگی،
 خوبصورتی اور سچائی سے تناؤ کا رشتہ رکھتی ہیں۔ مثلاً ظلم و استبداد، قتل و خون ریزی، کذب و افتراء، جرم و
 ریاکاری، کمینگی اور جہالت وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام تو تیس آزادی کے لیے چیلنج ہیں۔ اور آزادی کے عدم اور وجود
 کا یہی چیلنج فنون لطیفہ کی جان ہے۔ سچا فن اس کی دہشت سے بھی پیدا ہوتا ہے، اس کے عرفان سے بھی اور
 اس کے خلاف احتجاج سے بھی۔ افتخار عارف کے یہاں احتجاج کا لہجہ نمایاں ہے۔ ہر احتجاج میں بغاوت کا
 عنصر ہوتا ہے، دبا ہوا یا پر جوش، افتخار عارف کا احتجاج متشددانہ، آتش بار یا غضب ناک نہیں، یہ ایک
 محبت کرنے کا احتجاج ہے۔ درد آمیز، ہمدردانہ اور مخلصانہ، جس میں زندگی کے کرب اور بے زمینگی کے احساس
 دونوں نے مل کر ایک نئی تڑپ اور نئی تاثیر پیدا کر دی ہے۔

کسی بھی اُبھرتے ہوئے شاعر کو سب سے بڑا خطرہ اپنے عہد کی مانوس آوازوں سے ہوتا ہے۔ ہمارے
 عہد کی آوازوں میں میراجی، راشد، جوش، بیگانہ، فراق اور فیض کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ بیگانہ کا اثر محدود
 ہے اور جوش کا اثران کی زندگی ہی میں فنا ہو گیا۔ البتہ دوسروں کے فیوض و برکات جاری ہیں افتخار عارف
 اپنے رومانی مزاج اور احتجاجی حوالے سے فیض کے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لگتا ہے انھیں اس کا احساس بھی
 ہے کہ ان کی طرز گفتار کو سب سے بڑا خطرہ فیض سے لاحق ہے کیونکہ فیض کی رومانی اور انقلابی شاعری نے اس

نوعیت کے اسلوب کے امکانات کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ اب جو بھی آئے گا یا تو ادبی تقلید میں گلگشتِ نربے گا یا بہت عورت ملی تو بے مزہ شاعری کے دربارِ عام سے خلعتِ فاخرہ پائے گا۔ سن و محبت اور انقلاب و انحراف ابدی موضوعات ہیں۔ لیکن شہری اختصاص و امتیاز کی راہیں فکر و اظہار کے تازہ کارانہ پیرایوں ہی سے نکل سکتی ہیں۔ افتخارِ عارف کو اس کا پورا احساس ہے۔ انہوں نے کلاسیکی روایت سے خوش سلیقگی کی روشنی لی ہے اور اسے غیر رسمی تے سلف تازہ لہجے سے پیوند کیا ہے۔ اس میں کچھ ہاتھ ادھی کے تخلیقی ربط کا بھی ہے جو ابتدائی عمر کی دین ہو سکتا ہے۔ ان کی آواز میں نرمی رس اور لوح ہے جو ادھی کی گھلاوٹ اور زمینی پن کی راہ سے آیا ہے۔ کہیں کہیں طویل بحروں میں ارکان کی تعداد بڑھا دی ہے۔ بعض جگہ آوازوں کو بڑھایا گھٹایا ہے جس سے ان کا لہجہ ہندی آہنگ کی داخلی موسیقی سے قریب تر ہو گیا ہے۔ انسان سے ان کا گواہ اور محرمیوں سے پیدا ہونے والا در محبت احتجاجی لے میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ ایک کیفیت سے کسی کیفیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ افتخارِ غزلیں اور نظمیں دونوں لکھتے ہیں۔ دونوں پر انھیں یکساں قدرت حاصل ہے لیکن غزل کے اشعار میں شدتِ احساس کہیں زیادہ ہے۔ ایسا شاید ان کے مخصوص تخلیقی مزاج کی وجہ سے ہے یا ان رموز و علامت کی وجہ سے جنہیں ان کی شناخت قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہاں پہلے غزل کے اشعار سے استنباط کیا جاتا ہے۔

یہ قرضِ کج کھلی کب تلک ادا ہوگا
تباہ ہو تو گئے ہیں اب اور کیا ہوگا
غبارِ کو چہ وعدہ بکھرتا جاتا ہے
اب آگے اپنے بکھرنے کا سلسلہ ہوگا
ہوا ہے یوں بھی کہ اک عمر اپنے گھز گئے
یہ جانتے تھے کوئی راہ دکھیتا ہوگا

ہم جہاں ہیں وہاں ان دنوں عشق کا سلسلہ مختلف ہے
کار و بار جنوں عام تو ہے مگر اک ذرا مختلف ہے

آج کی رات ننھی سی کو بھی اگر بچ رہے تو غنیمت
 اے چراغِ سرِ کوچہ باد! اب کے ہوا مختلف ہے
 خیمہ عافیت کے طنابوں سے جکڑی ہوئی خلقتِ شہر
 جاننا چاہتی ہے کہ منزل سے کیوں راستہ مختلف ہے
 اب کے میں نے کتابِ مساوات ایک اک ورق پڑھ کے دیکھی
 متن میں جانے کیا کچھ لکھا ہے مگر حاشیہ مختلف ہے

غدا ب وشتِ جاں کا صلہ نہ مانگے کوئی
 نئے سفر کے لیے راستہ نہ مانگے کوئی
 بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
 عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

دُکھ اور طرح کے ہیں دعا اور طرح کی
 اور دامنِ قاتل کی ہوا اور طرح کی،
 دیوار پر لکھی ہوئی تحسیر ہے کچھ اور
 دیتی ہے خبرِ خلقِ خسرد اور طرح کی
 بس اور کوئی دن کہ ذرا وقت ٹھہ جائے
 صحراؤں سے آئے گی حسد اور طرح کی
 ہم کوئے ملامت سے نکل آئے تو ہم کو
 راس آئی نہ پھر آب و ہوا اور طرح کی

یوں دیکھیے تو "قرضِ کج کلہی" "غبارِ کوچہ وعدہ" "چراغِ سرِ کوچہ باد" "کار و بار جنوں" وغیرہ
 ترکیبیں اس کے کچھ پہلے کی شاعری کی یاد دلاتی ہیں، لیکن ذرا سے تامل سے معلوم ہو گا کہ یہ سب کہ بند تصورات کی

فارمولہ شاعری نہیں۔ شاعر کی آواز آج کی آواز ہے۔ زندگی آج جن آلام کے نرغے میں ہے اور معاشرہ جن حالات و حوادث کی زد میں ہے، یہ آواز اس کے درد و کرب سے پیدا ہوئی ہے۔ شاعر مثالیّت یا عینیت کا سہارا نہیں لے رہا، درنہ رجائی شاعری کی آسان راہ پر چل سکتا تھا وہ حقیقت کی سنگینی کو پوری سچائی کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ پہلے کا شاعر ہر شخص کو اپنا ہم نوا پاتا تھا، اب صورت یہ ہے کہ

صدائے گائی تو پُرساں حال کوئی نہ تھا

قرض کج کلہی کا ادا کرنا باعثِ فخر سہی لیکن تباہی کی آخری حد تک پہنچنے کے بعد اب بچا ہی کیا ہے کہ ادائیگی کا سلسلہ جاری رہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو ان غزلوں میں ایک نئی آواز اور نئی معنویت ہلتی ہے۔ ان میں جو سماجی، سیاسی مفہوم ہے یا جبر کے خلاف جو احتجاج ہے وہ جذباتیت کی دین نہیں بلکہ موجودہ صورتِ حال کی بے بہرہ آگہی سے پیدا ہوا ہے۔ ذرا ان غزلوں کے قافیے ردیفیں ہی دیکھیے، سلسلہ مختلف ہے، ہوا مختلف ہے، صلہ نہ مانگے کوئی، راستہ نہ مانگے کوئی، وفا اور طرح کی، صدا اور طرح کی، لفظوں کا یہ نظام کچھ اور ہی معنیاتی فضا پیدا کر رہا ہے۔ شاعر کو احساس ہے کہ :

ہم جہاں ہیں وہاں ان دنوں عشق کا سلسلہ مختلف ہے

مگر خوف یہ ہے کہ چراغِ مُراد کی نغھی سی کو بھی زندہ بچتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ پورا معاشرہ ریاکاری کے ایسے رنگ میں رنگ گیا ہے کہ ہر شے کے معنی بدل گئے ہیں۔ لفظ تو سب کے سب رجز کے برتے جاتے ہیں مگر مدعا مختلف ہے۔ کتاب مساوات کا متن تو سلامت ہے لیکن اس پر جو حاشیہ چڑھایا جا رہا ہے، اس سے متن کا مفہوم بالکل بدل کر رہ گیا ہے۔ شاعر کو احساس ہے کہ زمانہ اتنا بدل گیا ہے کہ اب :

دُکھ اور طرح کے ہیں دُعا اور طرح کی

اور دامنِ قاتل کی ہوا اور طرح کی

یہ انداز ترغیب اور تلقین کی شاعری سے بالکل الگ ہے۔ یہ صورتِ حال کے درد کی شاعری ہے اور اس درد کا احساس بھی بالواسطہ کرایا گیا ہے یعنی :

عذاب و حشتِ جاں کا صلہ نہ مانگے کوئی

نئے سفر کے لیے راستہ نہ مانگے کوئی

ان غزلوں میں اظہار کا جو پیرایہ ہے، جو علامت اور استعارے ہیں، ان کا رشتہ ایسے مفہام سے ہے جو

تلوار کی دھار کی سی تیزی رکھتے ہیں ان اشعار میں بین المصرین بہت کچھ ہے اور یہی شاعر کا کمال ہے۔
 اب ایک اور پہلو کو لیجیے۔ صاحبانِ ذوق نے ان اشعار کو پڑھتے ہوئے — نیمہ عافیت کے طنابوں
 سے جکڑ ہی ہوئی خلقتِ شہر — تمام شہر مکرم بس ایک مجرم میں یا کوئی تو شہر تذبذب کے ساکنوں سے کہے پر
 غور کیا ہوگا کہ ان میں شہر کا بیکر بار بار ابھرتا ہے، یہ کیسا شہر ہے؟ اس کی خلقت کیسی خلقت ہے؟ کیسے عذاب
 میں گرفتار ہے اور کیوں گرفتار ہے؟ یہ شہر مکرم بھی ہے اور مذنب بھی، کیوں؟ افتخار عارف بار بار جس شہر کا حوالہ
 لاتے ہیں وہ اُردو کی تخلیقی اور ثقافتی روایت کے اجتماعی لاشعور میں بسا ہوا ظلم و استبداد کا کوئی قدیمی نشان
 تو نہیں؟ یا یہ آج کا کوئی نیا شہر ہے یا نئی بستی؟ یا ایسا معاشرہ جو سیلابِ بلا میں گھر گیا ہے اور بے پناہ
 عذاب میں گرفتار ہے؟ شاید ان میں سے بعض سوالوں کا جواب ذیل کے اشعار سے مل جائے، کہیں ایسا تو نہیں
 کہ شاعر لکھ موجود کی دردناک صورت حال کو ایک وسیع تر تاریخی اور انسانی تناظر میں دیکھ رہا ہو:

دہی پیاس ہے دہی دشت ہے دہی گھرانہ ہے
 مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پُرانا ہے
 صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
 راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

بستی بھی سمن در بھی بیاباں بھی مرا ہے
 آنکھیں بھی مری خواب پریشاں بھی مرا ہے
 جو ڈوبتی جاتی ہے وہ کشتی بھی ہے میری
 جو ٹوٹتا جاتا ہے وہ پیمیاں بھی مرا ہے
 جو ہاتھ اُٹھتے تھے وہ سبھی ہاتھ تھے میرے
 جو چاک ہوا ہے وہ گرمیاں بھی مرا ہے
 جس کی کوئی آواز نہ پہچان نہ سنزل
 وہ قافلہ بے سرو ساماں بھی مرا ہے

ویرانہ مقتل میں حجاب آیا تو اس بار
خود چیخ پڑا میں کہ یہ عنوان بھی مرا ہے
واریتگی، صبح بشارت کو خبر کیا
اندیشہ صد شامِ غریباں بھی مرا ہے

میں جس کو اپنی گواہی میں لے کے آیا ہوں
عجب نہیں کہ وہی آدمی عس و کا بھی ہو
وہ جس کے چاکِ گریباں پہ تہمتیں ہیں بہت
اسی کے ہاتھ میں شاید ہنرِ رنوم کا بھی ہو
ثبوتِ محکم کی جال تھی جس کی برشِ ناز
اسی کی تیغ سے رشتہ رگ گلو کا بھی ہو
دفا کے باب میں کارِ سخن تمام ہوا
مری زمین پر اک محسوس کہ لہو کا بھی ہو

حریمِ لفظ میں کس درجے ادب نکلا
جسے نجیب سمجھتے تھے کم نسب نکلا
ابھی اٹھا بھی نہیں تھا کسی کا دستِ کرم
کہ سارا شہر لیے کاسے طلب نکلا

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوکِ سناں پر سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
پتھر پر سر رکھ سونے والے دیکھے
ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

شاخ بریدہ کھلی فضا سے پوچھ رہی ہے
 کوئی شکستہ پر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
 خاک اڑانے والے لوگوں کی بستی میں!
 کوئی صورت گر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
 سچے سائیں ہمارے حضرت مہر علی شاہ
 بابا! ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

واقعہ کر بلا اور اس کے تعلیقات کا انقلابی، سیاسی مفہیم میں استعمال اردو کی
 باغیانہ، مجاہدانہ شاعری میں نیا نہیں۔ اس کا سراغ مولانا محمد علی جوہر کی غزلیہ شاعری تک آسانی
 سے لگایا جاسکتا ہے۔ شاگردی انھوں نے داغ کی کی تھی لیکن کلاسیکی علامتوں کے پیرائے میں احتجاجی
 شاعری کا فیضان انھیں حسرت موہانی کی ان غزلوں سے پہنچا تھا جو بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں قید فرنگ
 میں کہی گئیں تھیں۔ اس کے بعد یہ علامتیں بار بار ابھرتی رہی ہیں اور طرح طرح کے مجاہدانہ ایجاد اختیار
 کرتی رہی ہیں۔ افتخار عارف کے یہاں موجودہ صورت حال کی سفاکی کے بیان میں ان سے نئی معنیاتی
 جہت سامنے آتی ہے۔ پیاس، دشت، گھرانہ، رن پڑنا، ایک کتاب اور ایک امید انا، ڈھالیں،
 شام، مسافر، چاک گریباں، قافلے بے سرو سامان، مہج بشارت، شام غریباں، قاتل، خنجر، خیمہ،
 لشکر، شاخ بریدہ، شکستہ پر، نوکِ سناں، سپاہِ شام، نیزے پر آفتاب کا سر، کاسرہ طلب، شہرِ زنگ
 سے مجتنب، یہ سب سامنے کی تعلیقے ہیں۔ یہ درد و کرب بنی نوع انسان کا بھی ہو سکتا ہے، اور
 ایک بستی یا پورے سماج کا بھی۔ بات کسی ایک شعر یا مصرعے کی نہیں، افتخار عارف کے یہاں پوری کی
 پوری غزلیں اس کیفیت سے سرشار نظر آتی ہیں۔ اور ان میں حق طلبی اور درد مندی کے نئے پہلو سامنے
 آتے ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار میں کہیں بھی امر واقعہ کا بیان نہیں بلکہ آج کے عذابوں کا ذکر ہے جن کو صدیوں کے
 تناظر میں دیکھا گیا ہے:

وہی پیاس ہے، وہی دشت ہے وہی گھرانہ ہے
 مشکینے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

دوسری غزل کے اختتامی الفاظ سے — بیاباں بھی مرا ہے — گریباں بھی مرا ہے — درد کے طویل
سلسلوں اور ترفع کا اندازہ ہوتا ہے تیسری غزل میں عدد، چاک گریباں، تیغ، رشتہ گلو، محرکہ لہو، پوری غزل کو
خاص معنیاتی رنگ میں رنگے دے رہے ہیں۔ دوسری غزلوں سے جو اشعار پیش کیے گئے ان میں بھی یہی کیفیت ہے،
لیکن یہاں ایک ادربات بھی توجہ طلب ہے یعنی شہر، بستی، خلقت اور شکر کا گہرا تعلق گھر سے ہے۔ ذرا یہ آخری
مصرع دیکھیے :

بابا ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

یہاں گھر سے مراد کیا ہے؟ گھر، گھر بھی ہے محدود معنی میں، اور پوری دنیا بھی جس میں ہم رہتے ہیں۔ یہ عدالوں
میں گھری ہوئی بستی بھی ہو سکتا ہے اور شہر مذہب بھی، جس کی طرف شاعر بار بار اشارہ کرتا ہے یہ شاعر کا
معاشرہ بھی ہو سکتا ہے جس سے وہ گہرے طور پر وابستہ ہے۔ ایسی غزلوں میں گھر کا استعارہ بار بار ابھرتا ہے
اور طرح طرح کی معنوی کیفیتیں پیدا کرتا ہے۔ شاعر اپنی زمین کو اپنا آخری حوالہ کہتا ہے ادھی کی در بدری کی
دہائی بھی دیتا ہے۔ اسے احساس ہے کہ ایک عمر گنوانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ جس میں رہ رہا تھا وہی
گھر اس کا نہ تھا۔ ان اشعار کے علامتی مفاہیم سے کوئی بھی سنجیدہ قاری سرسری نہیں گزر سکتا :

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے
یہ روشنی کے تعاقب میں بھاگتا ہوا دن
جو تھک گیا ہے تو اب اس کو مختصر کر دے
میں زندگی کی دعا مانگنے لگا ہوں بہت
جو ہو سکے تو دعاؤں کو بے اثر کر دے
میں اپنے خواب کے کٹ کر جیوں تو میرا خدا
اُجاڑ دے مری مٹی کو در بدر کر دے
مری زمین مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بار و بار کر دے

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
 کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا
 اس ایک خواب کی حسرت میں جل بھی نہ نکھیں
 وہ ایک خواب کہ اب تک نظر نہیں آیا
 حرم لفظ و معانی سے نسبتیں بھی رہیں
 مگر سلیقہ عرض ہنس نہیں آیا

خواب کی طرح بکھر جانے کو جی چاہتا ہے
 ایسی تنہائی کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے
 گھر کی وحشت سے لرزتا ہوں مگر جانے کیوں
 شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے

یہ اب کھلا کہ کوئی بھی منظر مرانہ تھا
 میں جس میں رہ رہا تھا وہی گھر مرانہ تھا
 میں جس کو ایک عمر سنبھالے پھر اکیس
 مٹی بتا رہی ہے وہ پیکر مرانہ تھا
 پھر بھی تو سنگسار کیا جا رہا ہوں میں
 کہتے ہیں نام تک سر تحفہ مرانہ تھا
 سب لوگ اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ تھے
 اک میں ہی تھا کہ کوئی بھی لشکر مرانہ تھا

کہیں سے کوئی حرفِ معتبر شاید نہ آئے
 مسافر لوٹ کر اب اپنے گھر شاید نہ آئے

تفس میں آب و دانے کی فراوانی بہت ہے
اسیروں کو خیالِ بال و پر شاید نہ آئے
کے معلوم اہلِ سبجہر پر ایسے بھی دن آئیں
قیامت کے گزرے اور خبر شاید نہ آئے

ان اشعار میں گھر کی مرکزیت ظاہر ہے۔ گھر کے ساتھ مٹی، زمین اور در بدری کے انسلالات بھی ہیں جو وطن کا صیغہ اظہار ہیں۔ شاعر نے انھیں آج کے تناظر میں رکھ کے نئی معنوی وسعتیں پیدا کی ہیں جن کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا۔ غزل کی رمزیت کا جواز یہی ہے کہ ایسے اشعار خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر بعض اوقات بیک وقت دونوں سطحوں پر کام کرتے ہیں۔ گھر کو نجی، ذاتی معنی میں لیجیے تو بھی خالی از لطف نہیں اور علامتی معنی میں لیجیے تو بھی معنی کے نئے امکانات سامنے آتے ہیں۔ افتخار عارف کی شاعری کے بارے میں اوپر جو کچھ کہا گیا اس سے آسانی سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ گہرا سیاسی احساس رکھتے ہیں اور طرح طرح کے جبر کے تئیں ان کا شعری ردِ عمل طرح طرح سے ظاہر ہوتا ہے۔ اپنے اظہاری بیرونیوں میں انھوں نے اردو کی شعری روایت سے بھی استفادہ کیا ہے اور انفرادی علامت کو بھی بڑھا ہے۔ اس طرح انھوں نے اپنا ایک انفرادی لہجہ پیدا کیا ہے جو آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔ زمینی اور ذہنی جلا وطنیوں کے حوالے، معرکہ، لہو، دشت، پیاس، نوکِ سنال، لشکر، شہر، بستی، گھر، گھرانا، مٹی، زمین، در بدری وہ کلیدی علامت ہیں جن سے افتخار عارف کی شاعریات کا شناخت نامہ مرتب ہوتا ہے۔ اس سے افتخار عارف نے ایک نئی معنوی فضا خلق کی ہے، جس میں جبر کے پنجے میں نچھرتی ہوئی انسانیت کی گمراہ ستائی دیتی ہے، یہ سیاسی نوعیت کی شاعری ہے لیکن وسیع تر انسانی درد مندی کے احساس کے ساتھ، یہ اس طرح کی سیاسی شاعری نہیں جو لیک پر چلنے کی پابند ہوتی ہے۔ اس بات کے ثبوت میں افتخار عارف کا پورا دیوان پیش کیا جاسکتا ہے۔ بہت سے اشعار اُدبِ درج کیے گئے ہیں۔ میں اقتباسات کو کم سے کم رکھنا چاہتا ہوں لیکن بعض اشعار گرفت میں لے لیتے ہیں اور ان سے صرف نظر ممکن نہیں۔ سرسری گزرنے والوں سے شکایت نہیں، لیکن جو شعر کا مطالعہ سنجیدگی سے کرتے ہیں، انھیں اتفاق ہو گا کہ اوپر جو مقدمہ پیش کیا گیا اس کی توثیق کے لیے ان اشعار کو نظر میں رکھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا بھی ضروری ہے :

اب بھی توہینِ اطاعت نہیں ہوگی ہم سے
 دل نہیں ہوگا تو بیعت نہیں ہوگی ہم سے
 روزاک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ
 رزقِ برحق ہے یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے
 اجرتِ عشق وفا ہے تو ہم ایسے مزدور
 کچھ بھی کر لیں گے یہ محنت نہیں ہوگی ہم سے
 ہر نئی نسل کو اک تازہ مدینے کی تلاش
 صہابو! اب کوئی ہجرت نہیں ہوگی ہم سے

یہ بستی جانی پھپانی بہت ہے
 یہاں وعدوں کی ارزانی بہت ہے
 سنگت لفظ لکھے جارہے ہیں
 مگر لہجوں میں ویرانی بہت ہے

بادل بادل گھومے پر گھر لوٹ کے آنا بھولے ناں
 اللہ سائیں ڈار سے بچھڑی کونج ٹھکانا بھولے ناں
 جب کبھی اُجلے اُجلے دن پر ٹوٹ کے برسی کالی رات
 ایک اپنی بستی کے نام کا دیا جلاتا بھولے ناں
 باغِ بنیچے میرے جب جب نذر لہو کی چپا ہیں
 میری برکت والی مٹی مجھے بلانا بھولے ناں

اس بار بھی دنیا نے ہفت ہم کو بتایا
 اس بار تو ہم شہ کے مصاحب بھی نہیں تھے

بیچ آئے سرِ قر یہ زرجو ہر پندار
جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے
مٹی کی محبت میں ہم آشفتمہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

نئے سکندر ہیں اور ظلمات کا سفر بھی نیا نیا ہے
فریب کی منزلوں میں اندازِ حیلہ گر بھی نیا نیا ہے
کڑی کمانوں کے تیرے اعتبار ہاتھوں میں آگے ہیں
دعائیں تھی سوا ب یہ خمیازہ اثر بھی نیا نیا ہے

کوئی جنوں کوئی سودا نہ سر میں رکھا جائے
بس ایک رزق کا منظر نظر میں رکھا جائے
ہوا بھی ہو گئی میثاقِ تیرگی میں فریق!
کوئی چراغ نہ اب رہگذر میں رکھا جائے
اسی کو بات نہ پہنچے جسے پہنچنی ہو
یہ التزام بھی عرضِ ہنر میں رکھا جائے

کس قیامت خیز چپ کا زہر سناٹے میں ہے
میں جو چیخا ہوں تو سارا شہر سناٹے میں ہے
ایک اک کر کے ستارے ڈوبتے جاتے ہیں کیوں،
جاگتی راتوں کا پھللا پہر سناٹے میں ہے

افتخارِ عارف کے یہاں عشقیہ جذبات کا اظہار بالذات طور پر بھی ہوا ہے۔ عشقیہ جذبات سے مراد

محض سن بلوغ کے جذبات کا اظہار نہیں، اگرچہ محبت کے معصوم جذبات کی حامل کچھ غزلیں اور نظمیں ان کے مجموعے میں مل جائیں گی لیکن یہ غالب رجحان نہیں۔ عام کیفیت اس محبت کی ہے جو گرم و سرد زمانہ کو دیکھ چکی ہے اور جس پر کئی جاڑے اور کئی برساتیں گزر چکی ہیں۔ ایسے اشعار میں محبت سے زیادہ محبت کی خلش کا احساس ہے ان میں ایسےبادل کی کیفیت ہے جو ویران کھیتوں پر برسنے کے بعد ہوا کے دوش پر اڑا جا رہا ہو۔ کہیں کہیں تو فنیق گناہ کی خواہش بھی ہے جو تہذیبِ باطن کی راہ سے تصدیق الہ چاہتی ہے۔ ایک نظم "تکمیل" میں شاعر نے گناہ کو منہ ہائے سرشتِ آدم کہا ہے۔ کیونکہ گناہ تخلیق کا ثمر ہے اور ایسا بیڑ ہے جس کے سائے میں مطلقاً نفس اپنے پیکر کو از سر نو تراشتا ہے۔ زیادہ تر نظموں میں خوف کے موسم کی کیفیت ہے، جبر کی دہشت ہے جس نے روح کو جکڑ لیا ہے، عذابِ در بدری، بے گھری اور بے زمینگی کے پیکر نظموں میں بھی بار بار ابھرتے ہیں۔ شاعر جھوٹی بشارتوں کی ضمانت نہیں دیتا وہ دیکھتا ہے کہ آرزو مند آنکھیں بشارت طلب دل اور دعاؤں کو اٹھے ہوئے ہاتھ سب بے ثمر ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ خود کو یہ کہنے پر مجبور پاتا ہے کہ جب کبھی رنگوں، خوشبوؤں، اڑانوں، آوازوں اور خوابوں کی توہین کی جائے گی، عذابِ زمینوں پر آتے رہیں گے۔ اُسے دکھ ہے کہ اہل اعتبار کتنے بدنصیب ہو گئے ہیں کیونکہ ان سے قرض آبرو بھی ادا نہیں ہوتا۔ چنانچہ شاعر قرآن مجید کا یہ فرمان دہرانے پر مجبور ہے:

اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ

پڑھا تو یہ تھا زمینِ عنبر پر کشتِ خاشاک کرنے والے نہیں رہیں گے
 سنا تو یہ تھا ہوا کے ہاتھوں پر بیعتِ خاک کرنے والے نہیں رہیں گے
 مگر ہوا یوں کہ نیزہ شام پر سر آفتاب آیا
 امانتِ نور جس کے ہاتھوں میں تھی اسی پر عذاب آیا
 اور اب مرے کم حلیف و کم حوصلہ قبیلے کے لوگ مجھ سے یہ پوچھتے ہیں
 ہماری قبریں کہاں نہیں گی؟
 خیامِ تسلیم و سائبانِ رضا کی ویرانیاں بتائیں

جو اپنی آنکھوں سے اپنے پیاروں کا خون دیکھیں اب ایسی مائیں کہاں سے لائیں

ایک اور نظم میں اس صورتِ حال کو یوں پیش کیا ہے :

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں
سارے خنجر ایک طرح کے ہوتے ہیں
گھوڑوں کی ٹاپوں میں روندی ہوئی روشنی
مقتل سے دریا تک پھیلی ہوئی روشنی
جلے ہوئے خیموں میں سہی ہوئی روشنی
سارے منظر ایک طرح کے ہوتے ہیں
ایسے ہر منظر کے بعد اک سناٹا چھا جاتا ہے
یہ سناٹا جمل و علم کی دہشت کو کھا جاتا ہے
سناٹا فریاد کی لئے ہے احتجاج کا لہجہ ہے
یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے بہت پرانا قصہ ہے
ہر قصے میں صبر کے تیور ایک طرح کے ہوتے ہیں
وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں

(ایک رُخ)

اس پیرائے میں افتخار عارف کی کسی نعلیں ہیں جو تاثر کے اعتبار سے سمجھوڑتی ہیں۔ ان میں آخری آدمی کا رجز، ”قصہ ایک بسنت کا“، ”جہانِ گم شدہ“، ”ایک اداس شام کے نام“، ”پتہ نہیں کیوں“، ”التجا“، ”دعا“، ”اعلانِ نامہ“ قابل ذکر ہیں۔ ”ابوالہول کے بیٹے“ میں اس عہد کا فسد محسوس کرتا ہے کہ فرعون کا ایک لشکر ہے اور فردا کیلا ہے اور اس کے ہاتھ عصا سے خالی ہیں، ایسے میں

ہستی دو بھر ہو جاتی ہے اور موت مقدر ہو جاتی ہے۔ التجا اور دعا کا پیرا یہ کئی جگہ ملتا ہے :

کوئی تو پھول کھلائے دعا کے لہجے میں !

عجب طرح کی گھٹن ہے ہوا کے لہجے میں

اگرچہ شاعر چاہتا ہے کہ کوئی معجزہ رونما ہو اور زمینوں کی عظمتیں پھر سے لوٹ آئیں لیکن اسے معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوگا کیونکہ انسان پابریہت سر کو چڑھتی رزق کی مصلحت کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے، اور اس کے آباد اجداد نے حرمت آدمی کے لیے اور کلمہ حق کے لیے صلیبوں پر جو خون بہایا تھا وہ لہو اب نہیں بولتا ہے۔ آج کے انسان کو تاریخ کے شہسواروں کا خون آواز نہیں دیتا، اس کے سامنے اس کے قبیلے کی خیمہ گاہیں جلائی جاتی ہیں لیکن وہ تماشائی بنا رہتا ہے۔ شاعر نے ان لوگوں کی بلیں شہید بھی مرتب کی ہے جنہوں نے رشتہ شہرت عام کو توڑنے کی ہمت دکھائی اور شہر نمود و نام کو تخریب دینے کا حوصلہ بھی کیا، لیکن اندر کا مزہ آدمی صبح و شام ڈرانے آجاتا ہے اور

نئے سفر میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے یہ سمجھانے آجاتا ہے

(بلیں شہید)

افتخار عارف کی نظم ”بار ہواں کھلاڑی“ خاصی مشہور ہے۔ اس نظم کو جبر، پامردی، احتجاج اور خوف، بزدلی، منافقت کے ان تضادات کے تناظر میں پڑھیے جو افتخار عارف کی شاعری ابھارتی ہے تو اس نظم کی پوری معنویت اجاگر ہوتی ہے :

خوشگوار موسم میں
ان گنت تماشائی
اپنی اپنی ٹیموں کو
داد دینے آتے ہیں
اپنے اپنے پیاروں کا
حوصلہ بڑھاتے ہیں
میں الگ تھلگ سب سے

بار ہویں کھلاڑی کو
 ہوٹ کرتا رہتا ہوں
 بار ہواں کھلاڑی بھی
 کیا عجب کھلاڑی ہے
 کھیل ہوتا رہتا ہے
 شور مچتا رہتا ہے
 داد پڑتی رہتی ہے
 اور وہ الگ سب سے
 منتظر کرتا رہتا ہے
 ایک ایسی ساعت کا
 ایک ایسے لمحے کا
 جس میں سانحہ ہو جائے
 پھر وہ کھیلنے نکلے
 تالیوں کی جھڑمٹ میں
 ایک جملہ خوش کن
 ایک نصرہ تھیں
 اس کے نام پر ہو جائے
 سب کھلاڑیوں کے ساتھ
 وہ بھی معتبر ہو جائے
 پر یہ کم ہی ہوتا ہے
 پھر بھی لوگ کہتے ہیں
 کھیل سے کھلاڑی کا
 عمر بھر کا رشتہ ہے

عمر بھر کا یہ رشتہ
 چھوٹ بھی تو سکتا ہے
 آخری دسل کے ساتھ
 ڈوب جانے والا دل!
 ٹوٹ بھی تو سکتا ہے
 تم بھی افتخار عارف
 بار ہویں کھلاڑی ہو
 انتظار کرتے ہو
 ایک ایسے لمحے کا
 ایک ایسی ساعت کا
 جس میں حادثہ ہو جائے
 جس میں سانحہ ہو جائے
 تم بھی افتخار عارف
 تم بھی ڈوب جاؤ گے
 تم بھی ٹوٹ جاؤ گے

(بارہواں کھلاڑی)

ہم زندگی کے کھیل میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی اپنی باری کے منتظر ہیں۔ کون میدان میں ہے اور
 کون میدان سے باہر، کسی کو خبر نہیں۔ جو میدان میں ہیں اور احساس کی دولت سے بہرہ مند ہیں وہ جانتے
 ہیں کہ جو میدان میں ہیں وہ بھی میدان سے باہر ہیں۔ کیفیت اس بے زمینی اور بے گھری سے الگ
 نہیں ہے جس کا ذکر مضمون کے شروع میں کیا گیا ہے۔ ایک زمین ہمارے وجود سے باہر ہے۔ ایک
 ہمارے دل کے اندر ہے۔ زندگی گرنے یا زندگی کی دہشت اور اس کے جبر سے مقابلہ کرنے کے لیے، یا
 سیاسی ظلم و استبداد کے خلاف نبرد آزار ہننے کے لیے، بار بار دل کی زمین کی طرف لوٹنے کی ضرورت
 پڑتی ہے۔ انسان جبنا نہاں خانہ باطن میں بھانکتا ہے، اتنا نیا ہوتا ہے، اس کا ایمان تازہ ہوتا ہے، اور

زندگی کے دکھ دودا اور ظلم و جور سے سنبھلڑانے کی تابِ مقادمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ مکالمہ سننے سے تعلق رکھتا ہے:

ہوا کے پردے میں کون ہے جو چیراغ کی نو سے کھیتا ہے
کوئی تو ہوگا

جو خلعتِ انتساب پہنا کے وقت کی رو سے کھیتا ہے
کوئی تو ہوگا

حجاب کو رمزِ نور کہتا ہے اور پرتو سے کھیتا ہے
کوئی تو ہوگا

”کوئی نہیں ہے

کہیں نہیں ہے

یہ خوش یقینوں کے، خوش گمانوں کے داہے ہیں جو ہر سوالی سے سعیتِ اعتبار لیتے ہیں
اس کو اندر سے مار دیتے ہیں

کوئی نہیں ہے

کہیں نہیں ہے؟

”تو کون ہے وہ جو لوحِ آبِ رواں پر سُورج کو ثبت کرتا ہے اور بادل اچھالتا ہے

جو بادلوں کو سمندروں پر کشید کرتا ہے اور بطنِ صدف میں خوشید ڈھالتا ہے

وہ سنگ میں آگ، آگ میں زنگ، زنگ میں روشنی کا امکان رکھنے والا

وہ خاک میں صوت، صوت میں حرف، حرف میں زندگی کا سامان رکھنے والا

نہیں کوئی ہے

کہیں کوئی ہے

کوئی تو ہوگا

(مکالمہ)

ان چند صفحات میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ افتخارِ عارف نے اپنے تخلیقی سفر میں جس ملکِ سخن کو دریافت کیا ہے، اس کے خاص خاص منطقوں کی کچھ آگہی حاصل ہو جائے۔ ان کی قلم و شعر میں وادیاں بھی ہیں اور چوٹیاں بھی، درد کے گھنے جنگل بھی ہیں اور رُوح کی گہرائیوں میں بہنے والی سبک سیز ندیاں بھی۔ کہیں انسانی رشتوں کی چاندنی ہے اور کہیں ظلم کے طوفانوں نے عافیت کے خمیوں کی طنائیں کاٹ دی ہیں۔ دشتِ بلا میں سموم اور صرصر کی آندھیاں چل رہی ہیں اور بیاسی ریت میں انسان کا لہو قطرہ قطرہ جذب ہو رہا ہے۔ اس منظر نامے کا پورا تعارف نہ تو مقصود تھا، نہ ممکن ہے کیونکہ کوئی بیان شاعری کا بدل نہیں۔ شاعری کا پورا تعارف خود شاعری ہے۔ اس مسافت کے لیے ضروری ہے کہ دیدہ بننا خود بیا ب سخن واکرے۔ افتخارِ عارف نے جس درد کی صلیب اٹھائی ہے وہ ہمارا اور ہمارے عہد کا درد ہے سب کا درد ہے۔ لیکن اس میں انفرادی شان انھوں نے اس طرح پیدا کی ہے کہ اس درد کو انھوں نے بے زمینوں کے احساس کے ساتھ قبول کیا ہے اور اس میں بستیوں، شہروں اور مٹیوں کی عظمت کے ساتھ ساتھ گھر دہلیز کی حرمتوں کا ڈھک درختی خلوص کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔ وہ آج کے انسان کا المیہ بیان کرتے ہیں۔ لیکن ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے نہ نوہ گری کی ہے نہ رجز خوانی، بس دردِ دل رقم کر دیا ہے ان کا درد ایسی قوت ہے جو باطن کا نور بن کر وجود کو منور کر دیتا ہے۔ ان کا پیرایہ بالعموم رمزیہ اور علامتی ہے لیکن ان کا لہجہ نامانوس نہیں۔ اس میں ایسی کشش اور دلآویزی ہے جو ان کی اپنی ہے۔ افتخارِ عارف کا شیوہ گفتار، کلاسیکی رچاؤ، شائستگی، اظہار، گہری درد مندی اور شدتِ احساس سے عبارت ہے۔ اس میں جو قوتِ نمونہ اور نفس و آفاق سے اسے جو نسبت ہے، اس کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ اس آواز کے نغمے تازہ و شیریں رہیں گے۔

نثری نظم کی شناخت

اس مضمون کو لکھنے کی ضرورت ہرگز پیش نہ آتی اگر نثری نظم کے بارے میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے، اس کی نوعیت محض نظری نہ ہوتی اور اطلاقی پہلو بھی پیش نظر رہتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ولادت نہیں اور حسب نسب اور رنگ و نسل کی بحث چھڑی ہوئی ہے، یا اگر ولادت ہو چکی ہے تو نومولود کو دیکھ بھالے بغیر اس کے عدم اور وجود کی گفتگو ہو رہی ہے۔ یا یہ کہ اتنی اولادوں کے ہوتے ہوئے نئی اولاد کی ضرورت بھی کیا ہے اور اگر ہے تو اس کو اولادِ نرینہ کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے یا کسی اور خانے میں رکھا جائے۔ نثری نظم اس میدان کا رزار کا منظر پیش کرتی ہے جس میں ہر طرف سے تیروں کی بارش ہے اور بالکل سایے میں وہ سبزۂ نودمیدہ ہے جو سراٹھاتے ہی پامال ہو رہا ہے۔ مجھ کم فہم کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں بنیادی مشکلات دو ہیں۔ اول یہ کہ اردو اپنے مزاج اور منہاج کے اعتبار سے مغربی زبانوں سے الگ ہے، اس میں نثری نظم کے فریم ورک کو ان سے ہٹ کر دیکھنا ہوگا اور اس کا واحد طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ اسے خود ان اردو تخلیقات سے اخذ کیا جائے جو نثری نظم کے نام سے لکھی جا رہی ہیں۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ وزن، موزونیت، آہنگ، نکلمی آہنگ، داخلی آہنگ یا شعری آہنگ کی جو بحث چھڑ گئی ہے، وہ بھی کئی الجھاؤوں کا شکار ہے۔ ایک الجھاؤ

تو ہماری اپنی مشرقی روایت کی دین ہے جہاں شاعری میں وزن بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور آہنگ وزن ہی کا پروردہ ہے یعنی وزن سے ہٹ کر آہنگ کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرا الجھاوا مغربی روایت سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ مغرب کے شعری آہنگ کی تطبیق اردو پر اس طرح نہیں ہو سکتی جس طرح مغربی زبانوں پر ہوتی ہے۔ رہی نئے تجربے کی ضرورت کی بات تو ضرورت کا معاملہ بھی اتنا آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ اس کے افادی اور "غیر افادی" پہلوؤں کو تو آسانی سے الگ کیا جاسکتا ہے لیکن اس میں کچھ گریہیں ایسی بھی ہیں جن کا تعلق جتنا شعوری رشتوں سے ہے اتنا لا شعوری تقاضوں سے بھی ہے۔ کسے معلوم تھا کہ غزل جسے حالی کے زمانے سے "غیر افادی" تسلیم کر لیا گیا تھا اور جسے وسط بیسویں صدی میں مصلوب کر دینے کی تیاریاں بھی ہو گئی تھیں، بغیر کسی مہینتی تبدیلی کے "غیر افادی" ہونے کے باوجود نہ صرف آبرومندی کی سند پا گئی، بلکہ ثقافتی جرطوں کے احساس کی بھی ضامن قرار پائی۔ یہ سارا عمل ایک صدی کے زمانے میں ہوا۔ نثری نظم کی بحث دس برس سے زیادہ پرانی نہیں۔ اتنے کم وقت میں کسی نئے تجربے کے بارے میں حکم لگانا شاید پیشین گوئی کے ذیل میں آئے گا، اور پیشین گوئی تنقید کا منصب نہیں۔ چنانچہ سر دست ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ نثری نظم کے نام پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو سامنے رکھ کر یہ جاننے کی کوشش کریں کہ اس کی نوعیت کیا ہے، اور کیا اس میں واقعی کوئی شعری تجربہ بیان ہوا ہے۔ اگر اس میں اظہار کی تخلیقی قوت نہیں ہے اور یہ بحیثیت نظم متاثر ہی نہیں کرتی تو اپنا اور دوسروں کا وقت خراب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ذیل میں بنیادی تنقیحات قائم کر کے اسی نوعیت کے مطالعہ کی کوشش کی جائے گی۔

(۱)

نثری نظم کی بحث کا آغاز بقول ڈاکٹر وزیر آغا ۱۹۷۴ء میں ہوا جب

اوراق کی ایک خاص اشاعت میں ذوالفقار احمد تالبش نے نثری نظم کا سوال اٹھایا اور بحث میں ڈاکٹر وزیر آغا، ریاض احمد، مرزا ادیب، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر سہیل احمد نے حصہ لیا۔ اس وقت نثری نظم لکھی تو جانے لگی تھی لیکن اس نے باقاعدہ رجحان کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ اس کے بعد چند برسوں میں یہ بحث دو دھڑوں میں بٹ گئی اور دو متضاد رویے سامنے آئے۔ ظاہر ہے ایک طرف وہ نئے شاعر ہیں جو نثری نظم کو نئے موثر وسیلے کے طور پر برتنا چاہتے ہیں اور اس بنا پر اس کی حمایت کرتے ہیں کہ "اس میں تخلیقی تجربہ غیر مسخ شدہ صورت میں سامنے آتا ہے" دوسری طرف وہ حضرات ہیں جو پابند شاعری کرتے ہیں یا پابند نظم اور آزاد نظم کے قائل ہیں۔ یہ لوگ نثری نظم کو اظہار کے عجز سے تعبیر کرتے ہیں اور اس تجربے کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ ڈاکٹر انور سدید کا خیال ہے کہ "مندرجہ بالا دو طبقوں کے ساتھ ایک طبقہ اور بھی پیدا ہو گیا ہے جس نے نثری نظم کو تحریک کے طور پر تو قبول نہیں کیا لیکن اس تجربے کو بیک نظر مسترد کرنے کی کاوش بھی نہیں کی، بلکہ نظم کے شعری آہنگ کو برقرار رکھنے کی تائید کی" انھوں نے اس مختصر طبقے میں ڈاکٹر وزیر آغا، وحید قریشی اور ریاض مجید کے نام لیے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شمس الرحمان فاروقی اور خود ڈاکٹر انور سدید کو بھی اسی طبقے سے متعلق سمجھنا چاہیے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا کہنا ہے کہ "آہنگ کی تلاش میں موجودہ نقائص اور اوزان کے جملہ دستور حرفِ آخر نہیں، آئندہ کے امکانات کو تلاش کرنا فنکار کا بنیادی حق ہے۔ نثری شاعری بھی آہنگ کو تلاش کرنے ہی کی ایک کوشش ہے"۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا کہنا ہے "سوال نثری نظم کو مسترد کرنے یا نہ کرنے کا نہیں، کیونکہ اس نئی صنفِ ادب کے وجود کا جواز بہر حال موجود ہے، لیکن اس کو شاعری کے تحت شمار نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ہر صنفِ ادب کا ایک کم سے کم وصف ضرور ہوتا ہے۔ نثری نظم کو اگر شاعری کے تحت شمار کیا گیا تو شاعری سے اس کا کم سے کم

وصف یعنی شعری آہنگ کا التزام بھی چھو جائے گا۔

شمس الرحمان فاروقی کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں "میں نثری نظم کا مخالف نہیں ہوں" لیکن "میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ نثری نظم ہماری شاعری کی کون سی صنفی یا ہئیتی ضرورت کو پورا کرتی ہے" (لیکن راقم الحروف کا ہے) آپ نے دیکھا وحید قریشی، وزیر آغا اور انور سدید "آہنگ" کو مسئلے کی جڑ قرار دیتے ہیں اور وزیر آغا سے اس لیے شاعری تسلیم نہیں کرتے کہ اس میں شاعری کی کم از کم شرط "شعری آہنگ" نہیں ہے، جب کہ شمس الرحمان فاروقی سرے سے نثری نظم کے صنفی جواز ہی کے قائل نہیں۔ ظاہر ہے کہ انور سدید نے جس گروہ کو مختصر قرار دیا ہے وہی مختصر گروہ نثری نظم کے رد میں سب سے زیادہ فعال ہے، اور اسی گروہ نے اپنے موقف کو تنقیدی دلائل سے استوار بھی کیا ہے۔

عالمی ادب کی شعری روایت پر نظر ڈالی جائے تو نثری نظم اتنی نئی صنف نہیں جتنا اردو میں اسے سمجھا جا رہا ہے۔ کئی زبانوں کی پرانی لوک روایتوں میں نثری نظموں سے ملتی جلتی منظومات یا ان کے ٹکڑے مل جاتے ہیں۔ البتہ ایک باقاعدہ ادبی تحریک کے طور پر سب سے پہلے نثری نظم نے فرانس میں سراٹھایا جہاں اسے خاطر خواہ کامیابی ہوئی، چنانچہ بولڈیر کو اس کا امام مانا جاتا ہے۔ رمبو، پلارے، لوتریاموں اور کئی دوسرے اہم شاعروں نے اسے پروان چڑھایا۔ فرانس میں نثری نظم کا عروج درحقیقت، وزن، بحر اور قافیے کی جکڑ بندیوں یا تمدن کی مصنوعی پابندیوں کے خلاف بغاوت پر مبنی تھا۔ انگریزی زبان میں اس کا رواج نسبتاً کم ہوا، اس لیے کہ انگریزی فری ورس میں آزادی کے امکانات پہلے سے موجود تھے۔ والٹ وٹمین کی نظموں کے بارے میں اب تک یہ بحث چلی آرہی ہے کہ اس کی بہت سی نظمیں مروجہ اوزان کے سانچوں پر پوری نہیں اترتیں اور فیصلہ نہیں ہو سکا کہ یہ آزاد نظمیں ہیں یا نثری نظمیں۔ نثری نظم لکھنے والوں میں تزگنیف، ریکے، سولز نٹلسن اور بورخس قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح جیمز جوائس، پاسٹرناک

اور ہر من ہس کی تحریروں کو بھی بعض لوگ بطور نثری نظم پڑھتے اور داد دیتے ہیں۔ ہندوستان میں ٹیگور کی گیتناجلی کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ نثر میں ہے لیکن اس کو بالعموم نظم سمجھا جاتا ہے۔ نیاز فتحپوری نے گیتناجلی کا ترجمہ "عرضِ نعمہ" کے نام سے بیسویں صدی کے شروع میں کیا تھا۔ شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے کہ میر ناصر علی ایسی تحریریں خیالات پریشاں کے عنوان سے عرضِ نعمہ سے بھی پہلے شائع کرا چکے تھے۔ بیسویں صدی کے ربعِ اول میں شعرِ منثور، ادبی شاہیا سے یا مختلف ناموں سے نثری نظموں سے ملتی جلتی چیزیں بالعموم لکھی جانے لگی تھیں، جن کا ایک ثبوت جوش ملیح آبادی کے پہلے مجموعے "روحِ ادب" (مطبوعہ ۱۹۲۰ء) میں ایسی نظموں کا اندراج ہے۔ بقول وزیر آغا ۱۹۲۹ء میں حکیم محمد یوسف حسن، مدیر نیرنگ خیال نے پنکھڑیاں کے عنوان سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کے مندرجات ہستیت اور مزاج کے اعتبار سے نثری نظم کے عین مطابق ہیں۔ آزادی کے بعد اس نوع کی باقاعدہ کاوش میراجی کے یہاں ملتی ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی کا بیان ہے "۱۹۲۸-۲۹ء میں بمبئی سے رسالہ خیال میراجی اور اختر الایمان نکالتے تھے، اس میں کچھ نظمیں چھپا کرتی تھیں، عنوان ہوتا تھا نثری نظمیں اور شاعر کا نام ہوتا تھا بسنت سہائے۔ اس نام کے آدمی کا غالباً کوئی وجود نہیں تھا نہ اب تک سنا گیا کہ ایسا کوئی آدمی تھا۔ میرا ذاتی قیاس یہ ہے کہ یہ نظمیں خود میراجی لکھ رہے تھے اور انھوں نے اس طرح کا ایک تجربہ کرنے کی کوشش کی تھی جس کو آزاد تلازمہ خیال کہتے ہیں، اور ہر نظم میں تو نہیں لیکن بعض نظموں میں یہ چیز دیکھی جاسکتی ہے جیسے ان کی نظم ہے "جاتری"۔ باقر مہدی کا خیال ہے "میراجی کی نظم جاتری میں نثری نظم کی طرف چلنے کا اشارہ ملتا ہے" (بحوالہ شاعر ص ۹۵-۹۶) تاہم نثری نظموں کا پہلا مجموعہ سجاد ظہیر کا پگھلا نیلم ہے جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ اگرچہ ان نظموں میں بعض مصرعے مروجہ اوزان میں ہیں۔ لیکن یہ امکان تو بعد کی نثری نظم میں بھی ملتا ہے۔ لگ بھگ اسی زمانے میں اعجاز احمد کی نثری نظمیں سویرا اور

سوغات میں شائع ہوتی رہیں جن پر داد بھی ملی۔ البتہ نثری نظم کی ترویج کی تازہ کوششیں ۱۹۷۴ء میں شروع ہوئیں۔ انیس ناگی انھیں رسالہ نصرت کی نثری نظموں کے لیے مخصوص اشاعت سے منسوب کرتے ہیں۔ ان دس برسوں میں ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی متعدد شعرا نے نثری نظم کو شعری اظہار کے ایک موثر وسیلے کے طور پر اپنایا ہے۔ ان میں پابند شاعری کرنے والے بھی ہیں اور نئے شعرا بھی۔ بعض نے کم نظیں کہی ہیں، بعض نے زیادہ اور بعض نے تو مجموعے بھی شائع کیے ہیں۔ ان میں سے بعض اہم نام یہ ہیں :

پاکستان : اعجاز احمد، احمد ہمیش، کشورناہید، منیر نیازی، ساقی فاروقی، صلاح الدین محمود، زاہد ڈار، قمر جمیل، مبارک احمد، رئیس فروغ (مرحوم) سارا سنگھت (مرحوم) یوسف کامران (مرحوم) انیس ناگی، فاطمہ حسن، جاوید شاہیں، اسد محمد خاں، عذرا عباس، افضل احمد سید، سعادت سعید، نسرین انجم بھٹی، سیمما خاں، شائستہ حبیب، ذی شان ساحل، عشرت آفریں۔

ہندوستان : خورشید الاسلام، باقر مہدی، بلراج کومل، قاضی سلیم، شہریار کمار پاشی، ندا فاضلی، عادل منصور، مخمور سعیدی، زبیر رضوی، صلاح الدین پرویز، حمید الماس، عین رشید، صادق ظفر احمد، صفیہ اریب، مشتاق علی شاہد، مصحف اقبال تو صفی، شین کاف نظام، پرت پال سنگھ ہیتاب، چندر بھان خیال، حمید سہروردی۔

ان کے علاوہ بھی دونوں ملکوں میں بہت سے نئے لکھنے والے نثری نظم کو وسیلہ اظہار بنا رہے ہیں، اور ان کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ایسے بہت سے نئے لکھنے والوں کی تخلیقات شاعر بمبئی کے نثری نظم اور آزاد غزل نمبر (مطبوعہ ۱۹۸۳ء) میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

(۲)

نئی نسل کے شاعر نثری نظم کو بالعموم ایک باغیانہ تحریک کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک وزن، بحر، ردیف اور قافیے سے نجات حاصل کرنا تخلیقی آزادی کے لیے ضروری ہے۔ اس رویے کی بہترین ترجمانی رئیس فروغ مرحوم کا وہ بیان ہے جسے انور سدید نے نقل کیا ہے :

”پروزیوٹم نے ہمیں وہاں سے پکارا تھا جہاں حرفوں کی جھاڑی میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ہم نے آگ سے مکالمہ کیا اور شہر میں جا کر اعلان کیا کہ ہمارے آدمیوں سے وزن، بحر اور قافیے کی بیگار کوئی نہ لے۔ پھر ہم نے اپنی تحریروں پر خون سے نشان لگا دیے تاکہ چمک اور گرج کے ساتھ آنے والا وقت جب چوپاٹیوں کے پہلو ٹھوں کو مارتا ہوا آئے تو خون کے نشانوں والی تحریروں کو چھوڑتا جائے، اس کے بعد یوں ہوا کہ بادل بہت زور سے کڑکا اور بڑے بڑے اڈے گرے اور کھڑی فصلیں برباد ہو گئیں۔“

یہاں کن بادلوں اور کس ترالہ باری کی طرف اشارہ ہے۔ اگر اس سے مراد پابند شاعری کرنے والوں کی مخالفت ہے یا بعض مقتدر نقادوں کا رویہ ہے تو یہ خدشات بے بنیاد بھی ہو سکتے ہیں، کیونکہ تخلیق اگر پُر جوش ہے اور زمین زرخیر ہے تو تازہ ہواؤں کے ساتھ نئی فصلیں پھر لہلہا اٹھیں گی۔ دراصل جب بھی کوئی چیز صدیوں تک چلن میں رہے، تو اس کی حیثیت اسٹیٹسمنٹ کی ہو جاتی ہے۔ ہر اسٹیٹسمنٹ اپنی جگہ پر جبر ہے۔ اگرچہ اس جبر میں اختیار کی راہیں بھی نکلتی ہیں جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اردو کے عروضی نظام کا تعلق

اس کے SUPER STRUCTURE سے ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو اصل کی تمام بحروں کو اردو جوں کا توں اپنالیتی۔ ایک خاموش دبا دبا سا تغیر کا عمل تاریخ میں برابر جاری رہا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں شرر اور اسماعیل نے آزادی کے حق میں آواز اٹھائی اور کچھ تجربے کئے گئے۔ پھر عظمت اللہ خاں نے ایک باغیانہ تحریک چلانے کی کوشش کی لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں اسی جذبے نے پھر آزاد نظم کے رجحان کے تحت انگریزی اور باوجود شدید مخالفتوں کے یہ تجربہ کامیاب ہوا اور آزاد نظم اردو شاعری میں راسخ ہو گئی۔ آزاد نظم کا تصور بھی بعض دیگر اصناف کی طرح ہم نے مغرب سے لیا۔ لیکن جتنی آزادیاں آزاد نظم کو مغرب میں حاصل تھیں اتنی اردو میں حاصل نہ ہو سکیں۔ اس کی وجہیں دوسری بھی ہوں گی لیکن ایک خاص وجہ ہماری دقیانوسیت بھی ہے اور دقیانوسی فضا میں تھوڑی سی آزادی حاصل کر لینا بھی ایک بہت اہم تاریخی اقدام تھا۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا نظم کی ساخت میں مزید وسعتیں پیدا کرنے کا کمزور سا رجحان بھی اسی کے ساتھ ساتھ پرورش پاتا رہا لیکن اس نے ایک فعال ادبی تحریک کی شکل حال ہی میں اختیار کی۔ نثری نظم کے رد و قبول کے سلسلے میں جو چیز بنیادی تضادات پیدا کر رہی ہے اور سب سے زیادہ الجھن کا سبب بنی ہوئی ہے وہ آہنگ کا تصور ہے۔ اسے داخلی آہنگ، شعری آہنگ، تکلمی آہنگ، نثری آہنگ، نامیاتی آہنگ وغیرہ مختلف اصطلاحوں سے موسوم کیا جا رہا ہے۔ آہنگ کے یہ مختلف تصورات اس قدر متضاد اور متناقض ہیں کہ خلطِ مجت کی صورت پیدا ہو گئی ہے یعنی وہ حضرات بھی جو نثری نظم کے مخالف ہیں اور وہ بھی جو نثری نظم کے حق میں ہیں، کسی نہ کسی طرح کے آہنگ ہی کا سہارا لیتے ہیں۔ پابند شاعری کے بارے میں تو معلوم ہے کہ آہنگ اس کا لازمی عنصر ہے، لیکن اگر نثری نظم کے لیے بھی آہنگ ضروری ہے تو پھر یہ معلوم کرنا ہو گا کہ اس آہنگ کی نوعیت کیا ہوگی۔ کیونکہ اگر یہ آہنگ بھی وزن اور بحر سے ملتی جلتی

کے ساتھ موزونیت بھی ہوتی ہے۔ لہذا اسے نثری نظم کہنا ایک طرح کا قولِ محال استعمال کرنا ہے، اسے نظم ہی کہنا چاہیے۔ (شعر، غیر شعر اور نثر)

(۳) "نثری شاعری کے لیے کوئی نظریاتی یا عروضی بنیاد قائم کرنا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے" (نثری نظم یا نثر میں شاعری)

(۴) "ہمارے یہاں... ایسا موزوں شعر ممکن نہیں ہے جو کسی بھی بحر میں نہ آسکے۔"
(ایضاً)

میں نے ان اقتباسات کو بعینہ اسی طرح پیش کیا ہے جس طرح شمس الرحمان فاروقی نے اپنے تازہ مضمون "نثری نظم یا نثر میں شاعری" میں درج کیا ہے۔ چنانچہ ان کو سیاق و سباق سے الگ کرنے کی ذمہ داری اگر کسی کی ہے تو انہیں کی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اقتباس دو میں فاروقی نثری نظم میں شاعری کے دوسرے خواص کے ساتھ موزونیت کو بھی دیکھتے ہیں، اور چونکہ بقول ان کے نثری نظم میں موزونیت ہوتی ہے، اس لیے وہ نثری نظم کو نظم ہی کہنا چاہتے ہیں۔ اقتباس (۱)، (۳) اور (۴) میں انہوں نے بالکل دوسری بات کہی ہے۔ یعنی یہ کہ نثری شاعری کے لیے عروضی بنیاد قائم کرنا بہت مشکل ہے اور نظم کی پہچان عروض سے نہیں کرنی چاہیے، جب کہ اقتباس (۲) میں رباعی کے مختلف الوزن مصرعوں کے حوالے سے انہوں نے جس "ہم آہنگی" یا "موزونیت" کا ذکر کیا ہے وہ دراصل عروض ہی کی دین ہے۔ ممکن ہے ان کے ذہن میں "موزونیت" کا کوئی دوسرا تصور ہو جس کا ان کے مضمون میں کوئی ذکر نہیں۔ چنانچہ اگر اقتباس (۲) کو جس کی وجہ سے ان کے بیانات میں تضاد لازم آتا ہے، نظر انداز کر دیا جائے تو اقتباس ایک تین اور چار کے بنیادی خیال سے اتفاق کرنا مشکل نہیں، کیونکہ ان بیانات میں انہوں نے دو بے حد اہم باتیں تسلیم کر لی ہیں، جن سے سجت کو آگے بڑھانے میں مدد ملے گی:

۱۔ شاعری اور نثر کا امتیاز عروض سے نہیں کیا جانا چاہیے۔

۲۔ SPEECH RHYTHM میں نظیوں لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم عروض کی بیجا

بندشوں سے اپنے کانوں کو آزاد کر لیں۔

باوجود اس کے کہ یہ بیانات صاف ہیں اور نثری نظم کے لیے کسی طرح کے عروضی سانچے کا سہارا نہیں لیتے، لیکن RHYTHM کے حوالے سے شمس الرحمان فاروقی نے آہنگ کا قسمہ لگا رہنے دیا ہے۔ اس آہنگ کی انھوں نے کوئی تعریف نہیں کی اور آہنگ کا یہی چکر سارے جھگڑے کی جڑ ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا آہنگ سے بالکل دوسری چیز مراد لیتے ہیں۔ انھوں نے جس آہنگ کو شاعری کا کم از کم وصف قرار دیا ہے، وہ اسے "شعری آہنگ" سے موسوم کرتے ہیں۔ اس شعری آہنگ سے ان کی مراد اصلاً "وہ آہنگ ہے جو شاعر کو ایک عالم خود فراموشی کے سپرد کر دیتا ہے، یعنی سوتے جاگتے کی سی کیفیت... جب تک شاعر اس آہنگ کی زد پر نہ آئے، اپنے شعری باطن کی سیاحت کر ہی نہیں سکتا۔ لہذا سوال محض یہی نہیں کہ کیا شعری آہنگ کو منہا کر دینے سے کوئی تخلیق شاعری کہلا سکتی ہے، بلکہ یہ بھی کہ کیا شعری آہنگ سے متصف ہوتے بغیر کوئی شاعر شعر کہہ بھی سکتا ہے کہ نہیں؟" گویا شعری آہنگ سے وزیر آغا کی مراد وہ نفسیاتی کیفیت ہے جو شاعر پر تخلیق شعر کے وقت طاری ہوتی ہے۔ اس اقتباس کو ان اقتباسات کے ساتھ ملا کر پڑھیں جو اس سے پہلے پیش کیے گئے ہیں، تو ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر آغا شعری آہنگ میں وزن کو ایک لازمی شے سمجھتے ہیں۔ مگر یہ ماورائے وزن ایک ذہنی کیفیت بھی ہے۔ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے اس کا رشتہ ثقافتی پس منظر میں جاری و ساری آہنگ سے بھی ملایا ہے۔ ان کا بیان ہے "ہر ملک (یعنی ہر ثقافتی اکائی) کی شاعری "وزن" کے مختلف تصورات میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ تصورات کا انتخاب نہیں کرتی بلکہ مجبور ہوتی ہے کہ اس خاص تصویر یا تصورات کو اپنائے جو اس کے اپنے ثقافتی ورثے کی دین ہیں جو اس کے تار و پود میں رچے بسے ہی نہیں اس کے ماحول اور سانکی میں بھی ہمہ وقت موجود ہیں" جب وہ ثقافتی مجبوری کی بات

کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ وزن وہی ہے جو نظام عروض کی دین ہے۔ کیونکہ ہر ثقافت کی سماعت اوزان کی ہم آہنگی کا اپنا الگ تصور رکھتی ہے۔ یہاں یہ غور طلب ہے کہ عروضی وزن تو اپنے تکنیکی نظام کی بنا پر تجرباتی بنیاد رکھتا ہے، جب کہ وہ وزن جسے وزیر آغا شعری آہنگ کہہ رہے ہیں (یعنی سوتے جاگتے کی کیفیت یا شعری موڈ) تو یہ سراسر نفسیاتی تصور ہے جس کی تجرباتی بنیاد کا فراہم کرنا ناممکنات کو دعوت دینا ہے۔ کوئی پیمانہ جس کی نوعیت تکنیکی ہو وہ غیر تجرباتی ہو ہی نہیں سکتا۔ وزیر آغا نے ان دونوں کو غالباً اس لیے ملا دیا ہے تاکہ وہ نثری نظم کو نثر کی ذیل میں لاسکیں حالانکہ وہ جس شعری آہنگ یا تخلیقی موڈ کا ذکر کر رہے ہیں وہ محض شاعری سے مخصوص نہیں بلکہ یہ نفسیاتی تخلیقی کیفیت تمام فنون لطیفہ کی جان ہے۔ قصہ ہوسیقی، مصوری، ادب، آرٹ کوئی چیز اس سے باہر نہیں۔ اور ادب میں یہ صرف شاعری ہی سے مخصوص نہیں بلکہ تخلیقی نثر بھی تخلیقی موڈ کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتی۔ نیز چونکہ مجوزہ شعری آہنگ کوئی ٹھوس تجرباتی EMPIRICAL بنیاد نہیں رکھتا، اس کی مدد سے نثری نظم کی کوئی منفی یا مثبت تعریف مرتب نہیں کی جاسکتی۔

وزن، موزونیت، اور شعری آہنگ کے مجوزہ مطالبات پر نظر ڈال لینے کے بعد اب ایک ہی چیز باقی رہ جاتی ہے، یعنی زبان کا نامیاتی آہنگ جو بقول انیس ناگی "صوت و معنی کا بہاؤ ہے اور ہر طرح کا لہجہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔" یہاں نامیاتی آہنگ کو عروضی آہنگ کے بالکل مخالف معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس سے مراد اگر وہ آہنگ ہے جس میں لفظوں کی ترتیب نثر کی طرح فطری اور سادہ ہوتی ہے تو بے شک یہ آہنگ نثر کا یا گفتگو کا بنیادی آہنگ ہے۔ شمس الرحمان فاروقی نے رباعی کے مختلف الوزن مصرعوں کا ذکر کر کے موزونیت اور تکلمی آہنگ میں جو خلطِ مجتہد پیدا کیا ہے، قطع نظر اس بیان کے ان کے متذکرہ SPEECH RHYTHM اور نامیاتی آہنگ میں دراصل زیادہ فاصلہ نہیں۔ آہنگ کے ان دونوں تصورات سے بات زبان کے فطری سانچوں یا ان پیمانوں تک پہنچ

جاتی ہے جن میں الفاظ کی ترتیب بالکل اس طرح ہوتی ہے جس طرح اصلاً وہ بولے یا بالعموم لکھے جاتے ہیں، نیز کلموں میں جو فطری اتار چڑھاؤ یا زیر و بم کی کیفیت ہوتی ہے جو زبان کا لازمی وصف ہے۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ہم میں سے وہ لوگ بھی جو نثری نظم کو وزن، بحر، ردیف اور قافیے سے نجات حاصل کرنے والی باغیانہ کوشش سمجھتے ہیں (انہیں ناگی) اور وہ بھی جن کے نزدیک نثری شاعری کی کوئی عروضی بنیاد نہیں ہو سکتی (شمس الرحمان فاروقی) یہ بھی آہنگ کا اصطلاحی سہارا لینے کے لیے مجبور ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ صدیوں سے اردو میں شعر کا جو تصور چلا آ رہا ہے، وہ بغیر آہنگ کے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تجربہ پسندی کی خاطر ہم نے بہت زور مارا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ وزن کی شرط نظم کے لیے ہے، شعر کے لیے وزن شرط نہیں۔ شعر کی یہ تعریف مانع ہے جامع نہیں۔ سو شعر کے لیے کیا چیز شرط ہے؟ یعنی اگر اس باغیانہ موقف کو تسلیم کر لیا جائے کہ نثری نظم کے لیے وزن شرط نہیں، تو پھر ہمیں بتانا پڑے گا کہ اس کے لیے کیا چیز شرط ہے تاکہ اس کی انفرادی حیثیت قائم ہو سکے۔ نظم کی صنفی تعریف کے لیے ہمیں کسی تلاش و جستجو کی ضرورت نہیں کیونکہ نظم خواہ پابند ہو یا آزاد، اس کی صنفی تعریف موجود ہے جس کا اطلاق نثری نظم پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن بطور ہیئت کے پابند نظم اور آزاد نظم کی الگ الگ تعریف ہے جن کی اپنی اپنی تکنیکی تجزیاتی EMPIRICAL بنیاد ہے جس کا اطلاق نثری نظم پر نہیں کیا جاسکتا۔ صرف اتنا ہی نہیں نثری نظم ان ہیئتوں اور ایسی تمام ہیئتوں کو رد کرتی ہے اور ان کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ نثری نظم کی اپنی ہیئت بنیاد کیا ہے اور کیا یہ لائق تجزیہ EMPIRICAL ہے کیونکہ اگر یہ EMPIRICAL نہیں تو الگ سے نثری نظم کا وجود قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے اس کی بنیاد نامیاتی آہنگ یا تکلمی آہنگ پر ہے۔ اگر اس آہنگ کی تجزیاتی نوعیت معلوم ہو جائے تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس آہنگ کی اب تک

کوئی تعریف نہیں کی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس بارے میں عروض سے مدد نہیں مل سکتی کیونکہ یہ عروض کی رد ہے۔ جمالیات سے بھی مدد نہیں مل سکتی، کیونکہ مسئلہ جمالیاتی قدر کا نہیں، ہیئت قدر کا ہے۔ یہ آہنگ چونکہ بول چال کا آہنگ یعنی زبان کا فطری آہنگ ہے، اگر کہیں سے مدد مل سکتی ہے تو صرف لسانیات سے اور لسانیات میں بھی صرف اس کی شاخ صوتیات سے جو ٹھوس تجزیاتی مشاہدے پر مبنی ہے۔ یہاں یہ عرض کر دوں کہ اصلاً راقم الحروف نے اس بحث کی تکنیکی تفصیل پیش نہیں کی تھی۔ اس مضمون کا پہلا مسودہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کے اردو شعریات پر منعقد ہونے والے سیمینار میں پڑھا گیا تھا، اس وقت بعض شرکار بالخصوص پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر مسعود حسین خاں نے اصرار کیا کہ اس بارے میں نثری آہنگ کی بحث بھی ضرور سامنے آنی چاہیے۔ سو اس کو انہیں حضرات کی خواہش کے احترام میں درج کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نثری نظم جس نئی بوطیقا کی تلاش میں ہے، اس کی تکنیکی بنیاد نثری آہنگ کی شناخت ہی پر رکھی جاسکتی ہے۔ اگر یہ شناخت ممکن ہے تو نثری نظم کی شناخت بھی ممکن ہے۔ اور اگر یہ شناخت ممکن نہیں تو نثری نظم کی کوئی تعریف قائم نہیں کی جاسکتی۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ بحث خاصی دقت طلب اور غیر دلچسپ ہے لیکن جن حضرات کی طبیعت ایسے مباحث سے الجھتی ہو، ان کے لیے اس مضمون کا پڑھنا ضروری نہیں۔

(۳)

نثری آہنگ کیا ہے؟

نثری آہنگ کیا ہے؟ نثری آہنگ وہی ہے جو تکلم یا بول چال کا آہنگ ہے، لیکن یہ آہنگ کیا ہے؟ اس کا جواب آسان نہیں۔ زبان آوازوں کا مجموعہ ہے۔ آوازیں حروف کی صورت میں لکھی جاتی ہیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ حروف ہی زبان ہیں۔ لیکن جب کوئی زبان بولی جاتی ہے اور آوازیں لفظوں میں ڈھلتی ہیں،

اور لفظ مل کر کلمے بنتے ہیں، تو کلمے میں صوتی زیر و بم اور بہاؤ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی صوتی زیر و بم اور بہاؤ کی کیفیت زبان کا آہنگ ہے۔ عام تحریر میں آوازیں تو حروف کے ذریعے ظاہر کر دی جاتی ہیں، لیکن صوتی بہاؤ کی یہ کیفیت ضبطِ تحریر میں نہیں آتی، حالانکہ کلمے میں کوئی آواز مجرد واقع نہیں ہوتی بلکہ اس صوتی بہاؤ ہی کا حصہ ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آوازیں (یعنی مصمتے، مصوتے، نیم مصوتے) تو الگ الگ بولے جا سکتے ہیں اور ان کی انفرادی صوتی حیثیت ہے، اس لیے یہ انفرادی طور پر لکھے بھی جا سکتے ہیں، لیکن صوتی بہاؤ کی کیفیت انفرادی صوت کی پہچان نہیں بلکہ آوازوں کے ملنے اور لفظوں کے کلمے میں بولے جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ کیفیت کسی خصوصیات کا مجموعہ ہے جو بیک وقت وارد ہوتی ہیں اور لفظوں اور کلموں پر چھائی رہتی ہیں۔ اس لیے خصوصیات

PHONOLOGY میں ان خصوصیات کو SUPRA-SEGMENTAL PHONEMES کہتے

ہیں۔ بعض ماہرین نے انہیں PROSODIC FEATURES کا نام بھی دیا ہے۔ جس طرح ہر زبان میں آوازوں کا اپنا نظام ہوتا ہے، اسی طرح ہر زبان ان بالا صوتی امتیازی خصوصیات سے بھی اپنے طور پر کام لیتی ہے۔ بعض زبانوں میں ان کی زیادہ اہمیت ہے، بعض میں کم، لیکن یہ خصوصیات پائی ہر زبان میں جاتی ہیں، اور بول چال کے آہنگ کی تشکیل انہیں بالا صوتی امتیازی خصوصیات سے ہوتی ہے۔

آوازوں یعنی حروف کی تعریف کرنا جتنا آسان ہے (کیونکہ انہیں الگ الگ لکھا جاسکتا ہے) بالا صوتی امتیازی خصوصیات کی نشاندہی کرنا اتنا ہی مشکل ہے، کیونکہ ایک تو یہ لہر کی صورت میں واقع ہوتی ہیں، دوسرے یہ موقع و محل کی رعایت اور بولنے والے کے جذبات کے اتار چڑھاؤ سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ واضح رہے کہ زبان میں ب یا پ یا م یا ن کی آواز کی صوتی حدود مقرر ہیں، اور اگر ان میں سے کوئی اپنی کسی ہم صوت آواز سے تکملی بٹوارے میں ہے تو اس کے وقوع کی حدود بھی معلوم ہیں، لیکن ایک ہی کلمہ کئی طرح سے بولا جاسکتا

ہے اور ایک ہی کلمہ میں زور کبھی ایک لفظ پر ہو سکتا ہے کبھی دوسرے پر۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو آوازیں ایک طرح سے نسبتاً جامد ہیں اور کلمے کا صوتی بہا و یا آہنگ نسبتاً سیال ہے۔ یہی سیال پن استعمال کی وہ UNIQUENESS رکھتا ہے جو اہل زبان کی خاص میراث ہے، اور غیر اہل زبان اس کو برسوں کی مشق کے بعد ہی سیکھ سکتا ہے۔ آوازیں تو نسبتاً جلد سیکھی جاسکتی ہیں، لیکن زبان کا بہجہ آتے آتے آتا ہے۔ اس آہنگ کے تین حصے خاص ہیں :

(۱) طول QUANTITY

(۲) بل STRESS

(۳) سُربہر INTONATION

طول

طول QUANTITY سے مراد آوازوں بالخصوص مصوتوں کی کمیت ہے۔ جو مصوتہ جتنا طویل ہوگا اس کے ادا کرنے میں اتنی زیادہ قوت صرف ہوگی اور وہ لفظ میں اتنا نمایاں ہوگا یعنی صوتی زیر و بم میں اس کا کردار نمایاں ہوگا۔ ویسے تو آوازوں کے زمانی وقفے تقریباً مقرر ہیں اور آوازیں انہیں کے مطابق وقوع پذیر ہوتی ہیں اور یہی مقررہ زمانی وقفے ہمارے عروض کی بنیاد ہیں، لیکن عروض کی بنیاد صوت پر نہیں، حرف پر ہے۔ اگرچہ حروف مصمتوں اور مصوتوں دونوں کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن عروض میں زیادہ تر مصمتی حروف سے کام لیا گیا ہے۔ آوازوں میں مصمتی حروف اور مصوتی حروف باہم متبادل ہو سکتے ہیں، چنانچہ اسی سے بحر و کاترئم پیدا ہوتا ہے اور ہر شاعر کا مزاج، معنیاتی ضرورت اور انتخاب الفاظ مقررہ بحر کے اندر ترنم پیدا کرنے میں کارفرما ہوتے ہیں، لیکن عروض مصوتوں کے گھٹانے بڑھانے کے سلسلے میں شدید بے ضابطگی کا شکار ہے جس کے جواز میں کوئی منطقی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔ بہر حال یہ بے ضابطگی، صدیوں کے

تاریخی عمل کے بعد عمرانیاتی چلن کا درجہ حاصل کر چکی ہے، اور جس کو اب دور کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ عروض ایک طرح کے الفاظ میں مصوتوں کی کمیّت کو کم کرنے کی اجازت دیتا ہے، جب کہ دوسری طرح کے الفاظ میں یہ اجازت نہیں۔ یہ زبان کے فطری بہاؤ کی پہلی بڑی آزادی ہے جس پر عروض نے غیر منصفانہ پہرہ بھٹا رکھا ہے۔ نثری نظم کی بنیاد چونکہ زبان کے فطری بہاؤ یا فطری آہنگ پر ہے، نثری نظم اس فطری آزادی کو بحال کرنے کی طرف پہلا بڑا قدم ہے۔ یوں تو بعض زبانوں میں مصمتوں کے وقفوں کو بھی طویل یا خفیف کیا جاسکتا ہے، لیکن اردو میں ایسا نہیں۔ البتہ اردو میں طویل اور خفیف مصوتوں کے سٹ موجود ہیں، جیسے زیر کی آواز اور یائے معروف کا سٹ یا زبر کی آواز اور الف کا سٹ، یا پیش کی آواز اور واؤ معروف کا سٹ۔ ان میں اور بعض دوسری مصوتی آوازوں میں خفیف اور طویل کی نسبت ہے۔ طویل مصوتوں کا زمانی وقفہ سات آٹھ سینٹی سیکنڈ اور خفیف مصوتوں کا تین چار سینٹی سیکنڈ ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا عام بول چال میں یہ وقفے جامد نہیں بلکہ سیال ہیں یعنی تین چار سینٹی سیکنڈ سے سات آٹھ سینٹی سیکنڈ تک ان کا پورا RANGE کام میں آتا ہے۔

بل

دنیا کی بہت سی زبانوں میں جن کا عروض لوچدار ہے، مصمتوں کو نہیں بلکہ مصوتوں کی کمیّت یعنی مقداری نوعیت کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ زبان کے فطری آہنگ میں یہ آزادی ایک اور آزادی سے مل کر کام کرتی ہے، یا یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ خصوصیت اس خصوصیت سے مربوط ہے کیونکہ زبان کا فطری آہنگ ایک عنصر کا نام نہیں، بلکہ ایک سے زیادہ عناصر باہم مربوط ہو کر کار فرما ہوتے ہیں۔ دوسری خصوصیت STRESS یعنی بل ہے جو مصوتوں کے ساتھ وارد ہوتا ہے، یعنی جہاں مصوتہ طویل ہوگا، بل بھی وہیں ہوگا۔ مصوتوں

کی کمیٹی عمل آوری دراصل بل یعنی زور سے جڑی ہوئی ہے۔ جن زبانوں میں بل امتیازی نوعیت رکھتا ہے، وہاں مصوتوں کی تخفیف و اشباع بل ہی کے زیر اثر وقوع پذیر ہوتا ہے اور بل ہی موزونیت کی اکائی قرار پاتا ہے۔ بل زبان کے فطری آہنگ کی آسان ترین اکائی ہے۔ لیکن ہر زبان میں ایسا نہیں۔ اردو میں بل امتیازی نوعیت نہیں رکھتا، یعنی لفظ میں اس کی جگہ بدل جانے سے معنی نہیں بدلتے جیسا کہ انگریزی میں ہوتا ہے۔ مثلاً انگریزی لفظ IMPORT میں اگر پہلے صوتی رکن پر بل ہو تو اس کے معنی ہیں اسم (درآمد) اور اگر دوسرے صوتی رکن پر بل ہو تو اس کے معنی ہیں فعل (درآمد کرنا)۔ یہی حال PERMIT، PERMIT اور سینکڑوں دوسرے الفاظ کا ہے۔ اردو لفظ میں بل کی جگہ بدل دیں تو معنی نہیں بدلتے مثلاً آنا، جانا، یا دادی، شادی یا کسی بھی لفظ میں پہلے صوتی رکن پر زور دے کر بولیں یا دوسرے صوتی رکن پر زور دے کر بولیں، معنی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ چنانچہ اردو میں بل اس طرح امتیازی نوعیت نہیں رکھتا جس طرح انگریزی میں رکھتا ہے لیکن اصل جگہ بدل دینے سے اردو لفظ اجنبی ضرور محسوس ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ اردو میں بل کا وجود ہے، اور یہ بل زبان کے فطری آہنگ کی تشکیل میں کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اردو میں بل کے غیر امتیازی ہونے سے ثابت ہے کہ یہ خاصا کمزور ہے، کم از کم یہ اتنا نمایاں نہیں جتنا انگریزی میں ہے۔ اس لیے اردو میں بل کی پہچان اور اس کے اصولوں کا تعین خاصا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ہندی اس معاملے میں اردو سے الگ نہیں۔ KELLOGG کی ہندی گرامر ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ہندی اردو بل کا سب سے پہلا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:

"ACCENT, THOUGH UNQUESTIONABLY EXISTING IN HINDI, IS MUCH LESS STRONGLY MARKED THAN IN ENGLISH, AND IS QUITE SUBORDINATE IN IMPORTANCE TO QUANTITY. EVEN IN

CONVERSATION THE HINDI HABITUALLY OBSERVES THE QUANTITY OF EACH SYLLABLE." 1

اردو میں بل پر سب سے پہلے ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے توجہ کی، اور اردو الفاظ میں بل کے وقوع کے اصول وضع کیے۔ اس کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ان سے بحث کی اور ان میں اضافہ کیا۔ یہ دونوں کتابیں پیرس میں لکھی گئیں۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً ماہرین اس پر کام کرتے رہے ہیں۔ میری نظر سے اب تک ذیل کے دس حضرات کا کام گزر چکا ہے :

1. MOHIUDDIN QADRI ZORE: HINDUSTANI PHONETICS (PARIS 1930) Pp 105-112.
2. T. GRAHAME BAILEY: "ONE ASPECT OF STRESS IN URDU AND HINDI," JOURNAL OF THE ROYAL ASIATIC SOCIETY, 1933, Pp124-126.
3. MASUD HUSAIN: A PHONETIC & PHONOLOGICAL STUDY OF THE WORD IN URDU (ALIGARH 1954) Pp31-36.
4. S.G. RUDIN: "NEKOTORYE VOPROSY FONETIKI JAZYKA XINDUSTANI," AKADEMIJA NAUK SSSR INSTITUT VOSTOKOVENIJA, YCENYE ZAPISKI (1958) Pp 233-263.
5. RAMESH CHANDRA MEHROTRA: "STRESS IN HINDI," INDIAN LINGUISTICS, VOL 26, Pp96-105.
6. RIPLEY MOORE: A STUDY OF HINDI INTONATION, DISSERTATION FOR THE PH.D. DEGREE OF THE UNIVERSITY OF MICHIGAN (1963-65) Pp89-102.
7. ڈاکٹر گیان چند جین: "اردو میں بل اور زور" اردو ادب شمارہ ۱ (۱۹۶۳) ص ۱۱۰-۱۲۷ (یہ مضمون "لسانی مطالعے" (دہلی ۱۹۷۳) میں شامل ہے۔ ص ۱۰۷-۱۲۷)
8. PUNYA SLOKA RAY: "HINDI URDU STRESS," INDIAN LINGUISTICS 27 (1966) Pp95-101.
9. ASHOK R. KELKAR: STUDIES IN HINDI-URDU, I: INTRODUCTION & WORD PHONOLOGY (POONA 1968) p 26.
10. ARYENDRA SHARMA: "HINDI WORD ACCENT" INDIAN LINGUISTICS, VOL 30 (1969) Pp115-118.

اس سلسلے میں گیان چند جین کا کہنا ہے کہ محی الدین قادری زور اور

1. S.H. KELLOGG : A GRAMMAR OF THE HINDI LANGUAGE, (LONDON 1875) II ED. 1893, P 20.

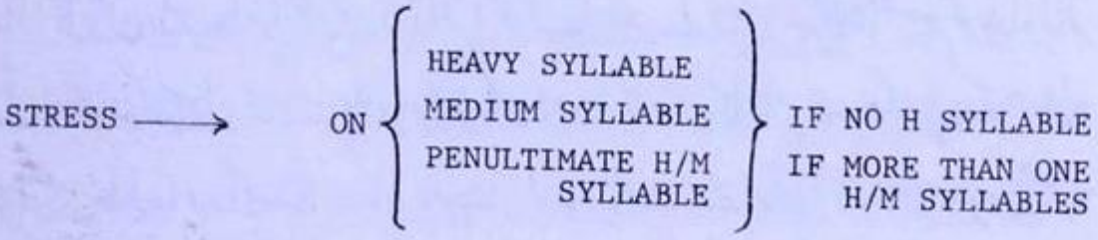
مسعود حسین خاں نے بل کی جو تعین کی ہے، انھیں اس کے بیشتر حصے سے اتفاق ہے۔ لیکن انھوں نے صوتی رکن کی صرف تین قسمیں مقرر کی ہیں؛ ایک ماترا کا رکن، دو ماترا کا رکن، تین ماترا کا رکن۔ ڈاکٹر اشوک کیلکر نے اس سہ گانہ تقسیم کو بنیاد بنا کر صوتی ارکان کو بھاری رکن، درمیانہ رکن اور ہلکا رکن کا نام دے کر بل کے اصولوں کو اور بھی سادہ اور آسان بنا دیا ہے۔ لسانیات کے ارتقا کا سارا سفر دراصل زبان کے خصائص کے تجزیے اور بیان میں "سادگی" کی تلاش کا سفر ہے۔ اس میں اصولوں کی سادگی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ آریندر شرما نے اشوک کیلکر کے اصولوں سے اختلاف کیا ہے اور ان کے رد میں مثالیں بھی دی ہیں، لیکن چونکہ یہ ساری مثالیں ہندی (سنسکرت) الفاظ کی ہیں، میرا خیال ہے کہ اردو کے لیے اب تک کی تحقیقات کی روشنی میں گیان چند جین اور اشوک کیلکر کے اصول سب سے جامع ہیں۔ ذیل میں مزید "سادگی" اور آسانی کے لیے ان تین اصولوں کو بھی صرف ایک اصول میں سمیٹنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سے پہلے دیکھیے کہ اشوک کیلکر نے صوتی ارکان کو تین شقوں میں بانٹا ہے۔ یہ گیان چند جین کے ایک ماترا، دو ماترا اور تین ماترا کے رکن ہیں، جن کی انھوں نے بالترتیب دو، چھ اور سات قسمیں بیان کی ہیں۔ کیلکر کی تین شقیں حسب ذیل ہیں:

ہلکا رکن : جو خفیف مصوتہ (یعنی زیر، زبر، پیش) پر ختم ہو، جیسے (LIGHT SYLLABLE) ادھر، ادھر، کدھر کا پہلا رکن۔

درمیانہ رکن : جو خفیف مصوتے کے بعد ایک مصمتے پر ختم ہو (جیسے (MEDIUM SYLLABLE) ان، کب) یا طویل مصوتے (الف، واؤ، یائے) پر ختم ہو (جیسے آ، جا، کھا / یا آنا، جانا، کھانا کا کوئی رکن)

بھاری رکن : مندرجہ بالا دو کے علاوہ کوئی سارکن (جیسے اؤن، دام، کاشت، حسرت، امن، پاؤ، آؤ) (HEAVY SYLLABLE)

اوپر کی تشریحات کی روشنی میں اردو لفظ میں بل کے اصولوں کو ایک قانون میں یوں سمیٹا جاسکتا ہے جو خاکسار کا وضع کردہ ہے :



یعنی موٹا اصول یہ ہے کہ اردو لفظ میں بل سب سے بھاری رکن پر آئے گا۔ اگر کوئی بھاری رکن نہیں ہے تو درمیانہ رکن چونکہ سب سے بھاری ہے، بل اس پر آئے گا۔

اور اگر کسی لفظ میں ایک سے زیادہ بھاری رکن ہوں / یا بھاری رکن کی غیر موجودگی میں ایک سے زیادہ درمیانہ رکن ہوں، تو بل آخری سے پہلے والے رکن پر آئے گا۔ بلکہ رکن پر بل آہی نہیں سکتا۔ اسی لیے قانون میں سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں ہے۔ اشوک کیلکر اور گیان چند جین نے ثانوی بل اور تیسرے درجے کے بل کی بحث بھی چھیڑی ہے۔ ایک ایسی زبان جس میں بل پہلے ہی کمزور اور غیر نمایاں ہے، یہ بحث محض نظری موشگافی ہے۔ ویسے بھی لفظ کا بل مجرد واقع نہیں ہوتا۔ جملے میں بل زور اور سُر لہر سے متاثر ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ بدل جاتا ہے۔ اس لحاظ سے البتہ مرکب الفاظ میں یا جملے میں ثانوی بل کا ہلکا سا جواز ہے جس کی وضاحت آگے آئے گی۔ بل کا نشان ہمیشہ مصوتے پر لگایا جاتا ہے۔ اوپر کے قانون کی روشنی میں ذیل کے لفظوں کو دیکھیے۔ بل کو کھڑے زبر سے ظاہر کیا گیا ہے۔ صوتی رکن جہاں ایک سے زیادہ ہیں، وضاحت کے لیے لفظ کو توڑ کر لکھ دیا ہے۔

گھاس بھی مجھ جیہ سی ہے
پاؤں تے بچھ کر ہی زرن + د + گی کی م + راد پاتی ہے

مگر یہ بھیگ کر کس بات کی گواہی بخداقتی ہے
شرم + ساری کی اُچّ کی
کہ جذبے کی حد + دت کی

واضح رہے کہ مندرجہ بالا الفاظ اگرچہ کلموں میں واقع ہوتے ہیں، لیکن لفظ میں بل کے وقوع کو دکھانے کے لیے ان میں لفظ کا بل الگ الگ ظاہر کیا گیا ہے۔ کلمے میں بل طول کے علاوہ آہنگ کے تیسرے عنصر یعنی سُر لہر سے بھی متاثر ہوتا ہے، اس کی بحث آگے آئے گی۔

سُر لہر INTONATION

زبان کے بالاصوتی عناصر میں طول اور بل کے ساتھ ساتھ سُر لہر کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ آہنگ کے نشیب و فراز یا زیر و بم کا کوئی تصور سُر لہر کے بغیر مکمل ہی نہیں۔ ہم ہمیشہ ایک سی بلندی سے نہیں بولتے۔ جملے میں آواز کبھی نیچے آتی ہے کبھی اونچی اٹھتی ہے۔ آواز کے اس اتار چڑھاؤ کو سُر TONE کہتے ہیں۔ آواز کی زیادہ بلندی یا کم بلندی کے لیے صوت درجہ PITCH کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ جملے میں اونچائی کے اختتامی حصے کو CONTOUR "لہریا" کہتے ہیں۔ جملے میں سُر ایک مسلسل کیفیت ہے جو آواز کے "صوت درجہ" PITCH اور لہریے CONTOUR سے مل کر بنتی ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کے مختلف درجے ہیں۔ طول اور بل کو تو الگ الگ لفظوں میں دکھا سکتے ہیں، لیکن سُر لہر (اردو میں) کلمہ یا اجزائے کلمہ کے ساتھ ہی واقع ہو سکتی ہے۔ جاپانی زبان یا اس سے ملتی جلتی زبانوں میں سُر لفظ کا امتیازی وصف ہے۔ ایک لفظ کو اونچے سُر کے ساتھ بولیں تو ایک معنی اور سُر بدل کر بولیں تو دوسرے معنی حاصل ہوتے ہیں۔ اردو میں ایسا نہیں۔ البتہ جملے کی اقسام اور جملوں کے معنی کی تفریق میں یعنی گرامر میں سُر لہر سے بیش بہا مدد ملتی ہے۔ مثلاً

حامد بازار گیا تھا

کو اگر ہموار سُر سے بولیں تو یہ بیانیہ جملہ ہے جس میں اطلاع دینا مقصود ہے۔ لیکن اگر اس کو اونچا اٹھتے ہوئے سُر سے بولیں تو یہی جملہ استفہامیہ بن جاتا ہے۔ مزید یہ کہ اگر حامد پر زور دے کر سُر کو فوری بلند کر کے بولیں تو یہی جملہ استعجابیہ بن جاتا ہے یعنی حامد تو بیمار ہے یا اُسے بازار جانا منع ہے، وہ کیسے بازار چلا گیا، یا کہا تو محمود سے تھا، تعجب ہے کہ حامد بازار چلا گیا۔ نیز اگر بجائے حامد کے بازار پر زور دے کر اور سُر کو بلند کر کے بولیں تو بھی معنی بدل جائیں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سُر لہر اردو لفظ میں تو امتیازی نہیں لیکن جملے میں امتیازی ہے۔

جس طرح بل اس بات پر منحصر ہے کہ لفظوں کو بولتے ہوئے پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا کے اخراج میں کتنا زور صرف ہو رہا ہے یا ادائیگی کتنی قوت سے کی جا رہی ہے، اسی طرح سُر لہروں کی تشکیل میں صوتی لبوں کا تناؤ اور ان کا ارتعاش کا فرما رہتا ہے۔ گویا بولتے وقت ہوا کے اخراج کے (۱) وقفے، یعنی طول (۲) قوت، یعنی زور یا بل، اور (۳) صوتی لبوں کا تناؤ یعنی سُر لہر مل کر زبان کے فطری آہنگ کی تشکیل کرتے ہیں۔

اردو (اور ہندی) میں سُر لہر (INTONATION) کے مسئلے پر اب تک درج

ذیل حضرات نے توجہ کی ہے :

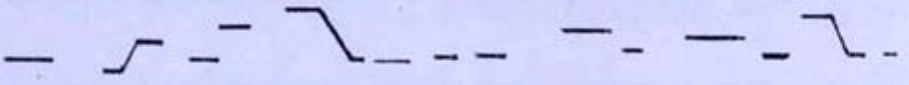
1. MOHIUDDIN QADRI ZORE: HINDUSTANI PHONETICS (PARIS 1930) Pp 113-116.
2. KATAYUN H. CAMA: "A STUDY OF THE NATIVE HINDUSTANI MELODY PATTERN & THE ACQUIRED ENGLISH MELODY PATTERN WITH SPECIAL REFERENCE TO THE TEACHING OF ENGLISH IN INDIA," ARCHIVES NEERLANDAISES DE PHONETIQUE EXPERIMENTALE XI (1939) Pp 103-110.
3. J.R. FIRTH: INTRODUCTION TO A.H. HARLEY, COLLOQUIAL HINDUSTANI (LONDON 1944); INTRODUCTION TO T. GRAHAME BAILEY, TEACH YOURSELF URDU (LONDON 1956).
4. W.K. MATTHEWS: "PHONETICS AND PHONOLOGY IN HINDI," MAITRE PHONETIQUE, SER 102 (1954) Pp 18-23.
5. VASUDEV NANDAN PRASAD: ADHUNIK HINDI VYAKARAN AUR RACNA (PATNA 1956)

6. گوپی چند نارنگ: "اردو کی بنیادی اور ذیلی آوازیں" اردو نامہ شمارہ ۱۴ (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۳) ص ۲۵-۷
- نیز دیکھیے: اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو (ایڈیشن دوم دہلی جنوری ۱۹۶۴) ص ۵۲-۵۴
7. PUNYA SLOKA RAY: "THE INTONATION OF STANDARD HINDI," (CHICAGO 1964) MIM.
8. RIPLEY MOORE: A STUDY OF HINDI INTONATION, DISSERTATION FOR THE PH.D. DEGREE OF THE UNIVERSITY OF MICHIGAN (1963-1965) p 129.

محی الدین قادری زور، میٹھوز اور واسدیونندن پرشاد نے دو سُر لہروں کا ذکر کیا ہے۔ فرتھ اور کاما نے سُر لہروں کے وجود کی توثیق کی ہے، درجہ بندی نہیں کی۔ راقم الحروف نے سب سے پہلے درجہ بندی کی اور نین امتیازی سُر لہروں کی نشاندہی کی۔ پنیہ شلوک رے اور رپلی مور دونوں اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ اردو (ہندی) میں تین طرح کے صوت درجے ہیں۔ اردو نامہ (۱۹۶۳) کے مضمون میں میں نے ان تین صوت درجوں کے لیے ۱ سے خفی، ۲ سے میانہ، اور ۳ سے جلی لہجہ مراد لیا تھا۔ رے کی دریافت ہے کہ بل کے ONSET سے لے کر سانس وقفہ تک PITCH (صوت درجہ) کی کارفرمائی رہتی ہے جو مسلسل کیفیت ہے اور جس کو انھوں نے لہریا CONTOUR کہا ہے۔ مور نے لہریوں کے پانچ خصائص بیان کیے ہیں:

- ۱۔ مائل بہ فراز
- ۲۔ مائل بہ نشیب
- ۳۔ ہموار
- ۴۔ فراز مائل بہ نشیب
- ۵۔ نشیب مائل بہ فراز

تماشا شروع ہونے میں تو ابھی آدھا گھنٹہ باقی ہے



عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جہاں طول زیادہ ہو یعنی رکن بھاری ہو، وہاں بل بھی نمایاں ہوتا ہے، اور جملے میں صوت درجہ بھی وہیں اونچا ہوتا ہے۔ رپلے مور کا کہنا ہے کہ ان تینوں عناصر میں سے استثنائی صورتوں میں صرف دو عنصر بھی مل کر آسکتے ہیں، یعنی صوت درجہ تو بلند ہو اور زور دینے کی وجہ سے بل میں شدت ہو، لیکن رکن میں طول نہ ہو۔ گویا بھاری رکن کے اصل بل سے ہٹ کر جملے میں کسی مقام پر زور دینے سے درمیانہ درجہ کے رکن پر بھی بل آسکتا ہے جہاں صوت درجہ بلند ہو گیا ہو، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ طول اور بلند صوت درجہ تو ہو لیکن زور نہ ہو، یا طول اور زور تو ہو لیکن بلند صوت درجہ نہ ہو۔ (ص ۶۰)

اوپر کے جملے میں سب سے زیادہ زور / آدھا گھنٹہ / پر ہے۔ لفظ میں بل کے قاعدے کی رو سے / آ / اور / دھا / دونوں درمیانے درجے کے برابر برابر رکن ہیں، سو آخری سے پہلے رکن یعنی / آ / پر بل آنا چاہیے۔ اسی طرح گھن + ٹہ میں / گھن / نسبتاً بھاری ہے، اس پر بل آنا چاہیے۔ لیکن جملے میں زور کی وجہ سے / آدھا گھنٹہ / ایک ہی STRESSGROUP میں آگئے۔ ایک ہی بل گروپ میں نمایاں بل صرف ایک ہی رکن پر آسکتا ہے دو پر نہیں۔ یوں "آ" "دھا" اور "گھن" تینوں درمیانے درجے کے رکن ہیں، "ٹہ" کا سوال نہیں کیونکہ وہ خفیف رکن ہے، قاعدہ ہے کہ بل سب سے بھاری رکن پر آئے گا، لیکن اگر ایک سے زیادہ ایک ہی جیسے رکن ہوں تو بل آخری سے پہلے رکن پر آئے گا۔ چنانچہ "دھا" پر بل آئے گا اور صوت درجہ PITCH بھی وہیں زیادہ بلند ہے۔ اسی طرح

ہونے میں / بھی ایک STRESSGROUP ہے۔ لفظی بل کے قاعدے کی رو سے / ہو / پر بل آسکتا تھا، لیکن جملے میں / میں / کے ساتھ آنے کی وجہ سے یہ بل آخری سے پہلے رکن یعنی / نے / پر آگیا۔ اس بات کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ اصلاً تو لفظ / ہونے / میں / ہو / پر بل تھا لیکن جملہ بولتے ہوئے کیونکہ / ہونے / میں / ایک گروپ میں آگیا، نمایاں بل / نے / پر وارد ہوگا، اور / ہو / کا بل کمزور پڑ گیا۔ اس کمزور بل کو ثانوی بل کہہ سکتے ہیں۔ اردو میں ثانوی بل کی یہی توجیہ ہو سکتی ہے، یا پھر مرکب الفاظ میں، مثلاً خوب صورت میں اصلاً خوب پر بھی بل تھا، اور صورت میں آخری سے پہلے رکن یعنی / سو / پر بھی بل تھا لیکن جب دونوں لفظ ملا کر بولے جائیں گے تو خوب، سو، اور رت میں سب سے بھاری صوتی رکن خوب ہے، سو نمایاں بل اس پر آئے گا، اور / سو / کا بل ثانوی بل ہو جائے گا۔ حق بات یہ ہے کہ ثانوی بل ایک نظری موشگافی ہے۔ نثری آہنگ کو سمجھنے کے لیے اصل بل کا جاننا ہی کافی ہے۔ جملے میں بل خاص الفاظ ہی پر آتا ہے حروف جار، ضمیر، تمیز، امدادی افعال یا جملے کے آخری الفاظ پر بالعموم نہیں آتا، اس لیے ہر لفظ پر بل ظاہر نہیں کیا گیا۔ بیانیہ جملے میں جس لفظ پر سب سے زیادہ زور ہو، اس کے بعد صوت درجہ گرتا چلا جاتا ہے۔ بیانیہ جملوں میں لہجہ عموماً ہموار ہوتا ہے سوائے اس لفظ یا الفاظ کے مجموعے کے جس پر زور دینا مقصود ہو۔ گالی یا رضامندی کے جملوں میں لہجہ مائل بہ نشیب رہتا ہے۔ شکوہ شکایت اور درخواست میں فراز مائل بہ نشیب۔ احترازی جملوں میں مائل بہ فراز۔ اسی طرح معلوماتی سوالوں میں مائل بہ نشیب، ہاں، نہیں والے سوالوں میں مائل بہ فراز، اور ندائیہ جملوں میں بھی مائل بہ فراز لہجہ ملتا ہے۔ لیکن غصے، خوشی، طنز اور دوسری جذباتی کیفیتوں کے تحت لہجہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تنہا لفظ ہی معنی کی تفریق میں مدد نہیں کرتے۔ یہ جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ لفظ معنی کی تفریق کرتے ہیں، وہ ادھوری سچائی ہے، جملے میں طول

بل اور صوت درجہ مل کر یعنی جملے کا آہنگ معنی کی پوری تشکیل کرتا ہے۔ بغیر آہنگ کے جملہ لفظوں کا مجموعہ تو ہے لیکن پوری طرح با معنی نہیں۔ آہنگ ہی جملے کو پوری طرح با معنی بناتا ہے۔

۵۔ اس سلسلے کی ایک ضمنی بحث زنگا امر اور زنگا ماضی کے فرق کی ہے۔ اردو نامہ کراچی شمارہ ۱۴ (اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۴۳ء) میں جب میرا مضمون "اردو کی بنیادی اور ذیلی آوازیں" شائع ہوا، اس سے پہلے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا مضمون "اردو صوتیات کا خاکہ" اور خاکسار کا مضمون "اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو" رسالہ اردوئے معلیٰ دہلی یونیورسٹی کے لسانیات نمبر میں ۱۹۴۱ء میں شائع ہو چکے تھے۔ ان میں اردو صوتوں اور مصمتوں کی بحث تھی۔ ان مضامین کا ذکر ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنے مضمون "اردو کی آوازیں" مطبوعہ اردو ادب شمارہ ۴ (۱۹۴۱ء) میں کیا ہے۔ بعد میں راقم الحروف کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند جین کا جو مضمون اردو نامہ شمارہ ۱۴ میں شائع ہوا، اور جس کا جواب میں نے شمارہ ۲۰ میں دیا تھا، اس میں زنگا (امر۔ کپڑے زنگا) اور زنگا (ماضی۔ کپڑا زنگا گیا تھا) میں فرق کرتے ہوئے میں نے سوال اٹھایا تھا کہ ان الفاظ میں فرق نون کے تلفظ کا نہیں جیسا کہ ڈاکٹر گیان چند جین کرتے ہیں۔ بلکہ فرق بل اور سُر لہر کا ہے۔ اس کا جواب ڈاکٹر گیان چند جین نے نہیں دیا۔ کیونکہ اس سے ان کی نون کی تقسیم پر سوالیہ نشان قائم ہو جاتا ہے، دوسرے اگر بل کا فرق تسلیم کر لیا جائے تو اردو میں بل امتیازی قرار پاتا ہے، اس لیے کہ دونوں الفاظ میں معنی کا فرق ہے، اور یہ فرق از روئے بل قائم ہو رہا ہے۔ کچھ مدت بعد جملے میں بل کی حیثیت پر غور کرتے ہوئے اس مسئلہ کا حل خود مجھے سوچھ گیا۔ وہ یہ کہ زنگا / ماضی میں قاعدہ کے مطابق بل پہلے رکن پر ہے۔ یہ جملے میں بھی قائم رہتا ہے، اس لیے کہ جملہ مائل بہ نشیب صوت درجہ (PITCH) پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس زنگا / امر بطور جملہ مائل بہ فراز صوت درجہ کے ساتھ ادا ہو گا جس سے بل جو پہلے رکن پر تھا، بدل کر دوسرے رکن پر آجاتا ہے۔ یعنی اصلی بل تو پہلے رکن ہی پر ہے، تبدیلی جملے کی سُر لہر کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اب نثر کے آہنگ کے مسئلے پر لکھتے ہوئے جب RUDIN کے مضمون کا (باقی اگلے صفحے پر)

دیل میں مینر نیازی کی نظم ”موسم نے ہم کو منظر کی طرح پریشان کر دیا ہے“ کا آہنگ ملاحظہ فرمائیے، پڑھنے کے انداز میں فرق ہو سکتا ہے، لیکن عام طریقہ یہی ہو گا جو درج کیا جا رہا ہے۔ بل طول کے ساتھ وارد ہوتا ہے، اس کو کھڑے زبر سے دکھایا گیا ہے، سُر لہر گراف سے ظاہر کی گئی ہے :

موسم نے ہم کو منظر کی طرح پریشان کر دیا ہے

کہیں پر ایک آبادی کا ٹکڑا ہے

— — — — —

اور کہیں پر سبز قطعہ اراضی

— — — — —

خالی زمین کا ایک وسیع رقبہ ہے

— — — — —

جس پر رات کی بوندا باندی کے نشان ہیں

— — — — —

اس رقبے پر دو حاملہ عورتیں چلی جا رہی ہیں

— — — — —

ایک خاموش خاموش ہے ایک شوخ اور مہنس نکھ

— — — — —

(پچھلے صفحے سے) انگریزی ترجمہ کم نیلسن کا کیا ہوا نظر سے گزرا تو معلوم ہوا کہ سمجھا / ماضی اور سمجھا / امر جوڑے کی روشنی میں RUDIN کو بھی اسی الجھن کا سامنا ہوا ہے، اور وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس مسئلہ کو جملے کے آہنگ یعنی SENTENCE PROSODY کی روشنی میں حل کرنا چاہیے۔ RUDIN کی رائے سے میرے خیال کی توثیق ہو جاتی ہے۔

ایک آدمی ان سے کچھ فاصلے پر ان کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے

ایک طرف درختوں کے جھنڈ میں

ایک خانقاہ کے آثار ہیں

دوسری طرف سرسوں کے کھیت کی پیلاہٹ کی مہک

(ساعت سیار ۱۹۸۳ء)

اس بحث سے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ نثری نظم میں مصرعے یا جملے آہنگ رکھتے ہیں۔ یہ آہنگ آواز کے وقفوں یعنی طول، زور یعنی بل، اور آواز کے زیر و بم یعنی سُر لہروں سے مل کر مرتب ہوتا ہے۔ بول چال کی فطری نغمگی اسخیں تین اجزا سے عبارت ہے۔ ان تین اجزا یعنی طول، بل اور سُر لہر کو بالترتیب DYNAMICS ، RHYTHM اور MELODY بھی کہا جاتا ہے۔ عروض میں یہ نغمگی اوزان کی خاص ترتیب اور موزونیت سے پیدا ہوتی ہے۔ بول چال یا نثر میں یہ جملے کے فطری آہنگ سے وجود میں آتی ہے۔ فطری آہنگ کے حق میں دو باتیں خاص کہی جاسکتی ہیں، اول یہ کہ اس میں خیال کے اظہار کو موزونیت کے لیے مسخ کرنے کی ضرورت نہیں۔ دوسرے یہ کہ جملے میں الفاظ اس وقت تک پورے معنی نہیں رکھتے جب تک وہ آہنگ کے ساتھ ادا نہ ہوں، یعنی آہنگ معنی کی کلی تفریق میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ چنانچہ زبان کے فطری آہنگ پر انحصار کرنے سے نثری نظم نہ صرف زبان کی فطری نغمگی کا ساتھ دینے کی ضمانت فراہم کرتی ہے، بلکہ اظہار کی مکمل آزادی کی ایسی راہ بھی کھولتی ہے جو اس سے پہلے موجود تو تھی لیکن شاعری کے لیے میسر نہ تھی۔

(۴)

نثری نظم کی نظریاتی بنیاد کو ثابت کرنے کے لیے زبان کے فطری آہنگ

کی وضاحت ضروری تھی۔ نثری آہنگ وہی ہے جو زبان کا فطری تکلیفی آہنگ ہے۔ تقریباً دس برس سے نثری نظم کے ضمن میں آہنگ کا ذکر چل رہا ہے لیکن اس کی تکنیکی بنیادوں کو واضح کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اوپر کی بحث سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ نثری آہنگ بھی نغمگی کے کسی بھی نظام کی طرح تجزیاتی EMPIRICAL بنیاد رکھتا ہے اور اس کی مدد سے نثری نظم کی ہیئت تعریف ممکن ہے۔ یہ آہنگ چونکہ زبان کی فطری ساخت پر مبنی ہے اور بحیثیت جوہر کے جملہ میں موجود ہے۔ (کیونکہ بغیر آہنگ کے عناصر کے جن کا ذکر اوپر کیا گیا، کوئی جملہ کلی طور پر بامعنی نہیں ہو سکتا) اس کے لیے کسی خاص التزام کی ضرورت نہیں۔ یہ وزن کی طرح تجزیاتی تو ہے لیکن چونکہ زبان کی فطری آزادی پر مبنی ہے اور جملے کے ساتھ از خود وارد ہوتا ہے، اس لیے وزن کی طرح اس کے لیے خود ساختہ التزام کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر زبان کی فطری نغمگی دوسری زبان کی نغمگی سے مختلف ہوتی ہے۔ اردو زبان کی بھی اپنی فطری نغمگی ہے، اور نثری آہنگ اسی فطری نغمگی اور اس کے امتیازی عناصر پر مبنی ہے جس کی تفصیل اوپر پیش کی گئی۔ اس بحث کے بعد آئیے اب دیکھیں کہ اردو میں نثری نظم کے نام پر جو تخلیقات پیش کی جا رہی ہیں وہ نظم کے تقاضوں کو کہاں تک پورا کرتی ہیں،؟ نثری نظم لکھنے والوں کے قافلے میں بہت سے نام ہیں اور نثری نظموں کے بہت سے مجموعے اور انتخاب بھی شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن یہاں استصواب کے لیے صرف ایسے شاعروں کو لیا جائے گا جنہوں نے محض کسی تبلیغی یا تحریکی جوش کے زیر نظر ایسی نظمیں نہیں لکھیں، بلکہ جو پابند شاعری میں بھی مستحکم حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے اس مفروضے کی بھی تصدیق یا تردید ہو جائے گی کہ نثری نظم عجز بیان کی دلیل ہے یا اسے صرف انہیں لوگوں نے وسیلہ اظہار بنایا ہے جو مروجہ پابند شاعری نہیں کر سکتے۔ سب سے پہلے یہ چھوٹے چھوٹے پائے دیکھیے :

پوری زندگی

کا حساب
 کون دے سکتا ہے
 حساب دینے کے لیے
 پوری زندگی چاہیے

یہ کتنی عجیب
 بات ہے کہ زمانہ
 بزدل کو ہمیشہ معاف
 کر دیتا ہے، مگر
 بہادر کو کبھی
 معاف نہیں کرتا

جو تمہیں نصیب ہے
 وہی تمہارے غموں
 کا باعث ہے
 اور جو تمہیں نصیب نہیں
 ہے، تم اسی کی
 بدولت زندہ ہو

جب خوابوں کے دن بیت گئے
 اور مایوسی برباد
 کرنے
 میں ناکام رہی

تب یہ راز کھلا
کہ زندگی خوشی
کے بغیر بھی ممکن

ہے

ان میں لفظوں کی ترتیب فطری اور سادہ ہے جیسے بالعموم نثر میں ہوتی ہے۔ کسی لفظ کو آگے پیچھے نہیں کیا گیا لیکن اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ ہر پارے میں کوئی تجربہ بیان کیا گیا ہے۔ لفظوں کو جس طرح سطروں میں بانٹا اور لکھا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تخلیق کار ان کو نظم کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہے۔ لفظوں کی سطروں میں بالقصد تقسیم اور پیشکش شاعری میں بے اہمیت نہیں ہے۔ یہ بحث آگے اٹھائی جائے گی، سر دست یہ ملاحظہ ہو کہ ان تمام پاروں میں صرف ایک ایک کلمہ بیان ہوا ہے۔ پہلے پارے کے دونوں حصے یعنی "پوری زندگی کا حساب کون دے سکتا ہے، حساب دینے کے لیے پوری زندگی چاہیے" باہم مگر مربوط ہیں۔ دوسرے پارے میں چوتھی سطر میں حرف "مگر" سے ارتباط ثابت ہے۔ تیسرے اور چوتھے پارے میں یہ تفاعل لفظ "اور" اور "تو" کا ہے اور پانچویں پارے میں کلمے کے دو اجزا میں ربط لفظ "تب" سے پیدا ہوا ہے۔ ان پاروں پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ نظمیں کہاں ہیں، یہ تو PARADOX ہیں یعنی ایسا بیان جو بظاہر متضاد ہو لیکن دراصل سچائی کا عنصر رکھتا ہو (قولِ محال) یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کلموں کے باہم مربوط حصوں کے معنی کو جس طرح مربوط کیا گیا ہے اس سے ان دونوں میں AXIOM یا EPIGRAM کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ یہ نثر کے شعری لوازم ہیں جو با وزن کلام میں بھی واقع ہو سکتے ہیں۔ بہر حال اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ ہر پارے میں ایک تجربہ بیان ہوا ہے اور اس کا اظہار شعریت سے عاری نہیں۔ اب ایک اور نظم دیکھیے:

جب
 جنگل کی چھوٹی چھوٹی
 کچی کچی جھونپڑیوں سے
 ناتراشیدہ، نیم برہنہ
 جوان لڑکیاں
 سال کے پیر جیسی سیدھی
 اپنے سینوں کے سڈول بوجھ
 اور چوکنی آنکھوں کے ساتھ
 شہر کے بازار میں
 ہوئے لے کر آتی ہیں
 تو بوڑھی زمین
 کی چھاتیوں میں
 دودھ اتر آتا ہے

اس پر شاید ویسا کوئی الزام عائد نہیں ہوتا جو پہلے کے پانچ پاروں پر عائد ہو سکتا تھا۔ یعنی ان کی نوعیت قولِ محال کی ہے اور ان میں خیال کا شعری ارتقا نہیں ملتا۔ اگرچہ تائید میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب پابند یا آزاد نظمیں ایک مصرعے یا ایک سطر کی ہو سکتی ہیں (منیر نیازی کے یہاں جس کی متعدد مثالیں موجود ہیں) تو پھر نثری نظم ایک کلمے یا ایک کلمے کے دو اجزا میں کیوں نہیں کہی جاسکتی۔ قطع نظر اس کے اوپر کی نظم میں جو تجربہ بیان ہوا ہے اگرچہ اس میں بھی دو نحوی ٹکڑے ہیں یعنی (ایک) جب جنگل کی چھوٹی چھوٹی کچی کچی جھونپڑیوں سے ناتراشیدہ، نیم برہنہ جوان لڑکیاں ہوئے لے کر آتی ہیں۔ (دو) تو بوڑھی زمین کی چھاتیوں میں دودھ اتر آتا ہے۔ لیکن اس میں قولِ محال کی کیفیت نہیں بلکہ خیال کا ارتقا ہے۔ پہلے حصے میں ناتراشیدہ، نیم برہنہ، سال کے پیر جیسی سیدھی، سینوں کے سڈول بوجھ،

جیسے پیکروں کے باوصف ایک واقعاتی بیان ہے۔ جب کہ بوڑھی زمین کی چھاتیوں میں دودھ اتر آنا یکسر استعاراتی پیرایہ ہے، جس سے پورا اظہار ایک نظمیت واحد کے میں ڈھل جاتا ہے۔ اب اگر یہ اظہار نظم ہے تو سطروں کو مصرعے کہا جاسکتا ہے۔ اب تک جو نظیں پیش کی گئیں وہ خورشیدالاسلام کی تھیں۔ اب ذرا مینر نیازی کے یہاں سے دو مثالیں دیکھیے۔ ہمارے عہد کی شاعری میں مینر نیازی کی جو امتیازی حیثیت ہے اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو:

اب میں اسے یاد بنا دینا چاہتا ہوں

میں اس کی آنکھوں کو دیکھتا رہتا ہوں
مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا
میں اس کی باتوں کو سنتا رہتا ہوں
مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا
اب اگر وہ کبھی مجھ سے ملے
تو میں اس سے بات نہیں کروں گا
اس کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں
میں کوشش کروں گا
میرا دل کہیں اور مبتلا ہو جائے
اب میں اسے یاد بنا دینا چاہتا ہوں

موسم نے ہم کو منظر کی طرح پریشان کر دیا ہے

کہیں پر ایک آبادی کا ٹکڑا ہے
اور کہیں پر سبز قطعہ اراضی
خالی زمین کا ایک وسیع رقبہ ہے

جس پر رات کی بوندا باندی کے نشان ہیں
 اس رقبے پر دو حاملہ عورتیں چلی جا رہی ہیں
 ایک خاموش خاموش ہے ایک شوخ اور مہنس مکھ
 ایک آدمی ان سے کچھ فاصلے پر اُن کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے
 ایک طرف درختوں کے جھنڈ میں
 ایک خانقاہ کے آثار ہیں
 دوسری طرف سرسوں کے کھیت کی پیلاہٹ کی مہک

پہلی نظم "چھ رنگین دروازے" سے لی گئی ہے جو ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اور دوسری نظم "ساعتِ سیار" سے جو ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ان دونوں نظموں میں ایسی کون سی بات ہے جو انھیں نظم تسلیم کرنے میں مانع ہو۔ کیا یہ ایک نظم کی طرح متاثر نہیں کرتیں۔ کیا ان میں شدتِ احساس، وحدتِ تاثر اور شعری معانی کا ارتکاز نہیں ہے۔ بلراج کو مل کا کہنا ہے "مینر نیازی کی نثری نظموں میں سحر کاری کی کیفیت ان کی مستحکم آہنگ آہنگ آہنگ آہنگ کے برابر ہے۔" ان میں لفظوں کا درو بست فطری اور سادہ ہے۔ لیکن زبان کا استعمال ہرگز سادہ نہیں۔ ان نظموں میں صوتی مناسبتیں ہیں، کہیں کہیں قافیہ ردیف کی کیفیت بھی ہے لیکن یہ ان نظموں کا لازمی جزو نہیں، سو یہ بحث غیر ضروری ہے۔ اصل چیز شعری تجربہ ہے اور زبان کے فطری آہنگ کے ساتھ اس کا "غیر مسخ شدہ" اظہار ہے۔ پہلی نظم میں ایک گہری نفسیاتی کیفیت کا اظہار ہے۔ راوی اُسے یاد کیوں بنا دینا چاہتا ہے یا وہ کیوں چاہتا ہے کہ اس کا دل کہیں اور مبتلا ہو جائے۔ جواب آنکھوں اور باتوں کے ذکر کے بعد "مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا" کی تکرار میں موجود ہے۔ یعنی اس کی آنکھوں کو دیکھتے رہنے اور باتوں کو سنتے رہنے سے حیرتِ حسن یار کی جو کیفیت پیدا ہوئی ہے وہ ماورائے بیان اور ماورائے ادراک ہے اور اس نے عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے۔ دوسری نظم بھی مزے کی ہے۔ مینر نیازی فطرت کے معصوم

حُسن کی تخیلِ زاتِ تصویر کشی میں جواب نہیں رکھتے، آبادی کا ٹکڑا، سبز قطعہ اراضی، خالی زمین کا رقبہ، رات کی بوندِ بادی کے نشان، دو حاملہ عورتیں، ایک خاموش، ایک شوخ، فاصلے پر آدمی، یہ پیکر پرکشش ہیں لیکن جس چیز نے اس بیان کو نظم بنا دیا ہے وہ خانقاہ کے پہلو بہ پہلو سرسوں کے کھیت کی پیلاہٹ کی مہک ہے۔ یہ وہ رمز ہے جو زندگی کو اس کے معنی دیتا ہے۔ یہاں ایک اور بات بھی غور طلب ہے۔ دونوں نظیہں CONCRETE ہیں۔ لیکن واقعاتی اور سٹھوس ہوتے ہوئے بھی یہ غیر واقعاتی ہیں۔ خیال یا تو پیکروں کے ذریعے سلسلہ در سلسلہ فروغ پاتا ہے یا پھر کوئی تصویرِ منظر بہ منظر رمز کو آشکار کرتی ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کوئی کہانی حلقہ در حلقہ بیان ہوتی ہے۔ یہ آخری بات بلراج کو مل کی اس نظم سے مزید واضح ہو جائے گی:

یہ سوچتے سوچتے ماں نے
آنکھوں ہی آنکھوں میں رات گزار دی
کہ کمرے میں بلی
کس راستے سے داخل ہوئی
جبکہ تمام کھڑکیاں دروازے اور روشن دان بند تھے

صبح اٹھنے پر ماں نے اپنی مشکل جب سنائی
تو میں اُس کو نظر انداز کر کے
گھر سے باہر چلا گیا

آج رات ماں کو نیند آگئی
اور میں نے ساری رات
آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دی
یہ سوچتے سوچتے

کہ جلی کس راستے سے کمرے میں داخل ہوئی

بظاہر اس نظم میں ایک واقعہ بصورت کہانی بیان کیا گیا ہے۔ اظہار انتہائی سادہ اور غیر مرصع ہے۔ لیکن معنی کا نظام تمثیلی اور استعاراتی ہے۔ یہ نظم ایک شدید نوعیت کی نفسیاتی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے، جس کے کسی البعاد ہو سکتے ہیں یعنی یہ کہ جب کوئی خوف اظہار کی راہ پاتا ہے تو اس کی شدت زائل ہو جاتی ہے۔ یا خوف یادداشت اس وقت تک دمہشت نہیں بنتی جب تک وہ ہمارے باطنی تجربے سے گزر کر ہمارے وجود کا حصہ نہ بن جائے۔ یا یہ کہ خوف کے اظہار میں ہمارے اطمینان قلب کا راز چھپا ہوا ہے۔ یا یہ احساس خوف ہی کی کوئی صورت ہے جو فکر کو ہمیز کرتی ہے اور اظہار کے نئے وسیلوں کی تلاش میں اُسے مضطرب کر دیتی ہے۔ کیا اس نظم کے شعری معنی سے یا ارتکاز سے یا زبان کے تخلیقی استعمال سے کوئی بھی شخص انکار کر سکتا ہے؟

یہاں پرنثری نظم کے سلسلے میں زبان کے تخلیقی استعمال پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے کیونکہ شاعری کی یہ وہ خصوصیت ہے جسے ہر شخص تسلیم کرتا ہے۔ نثری آہنگ تو قدر مشترک ہے جس کے لیے کسی التزام کی ضرورت نہیں، لیکن شعری حسن کاری کا اندازہ زبان کے استعمال سے ہو سکتا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے ٹھیک کہا ہے، "نظم کی سب سے بڑی پہچان اس کی زبان ہوتی ہے" (لفظ و معنی) یعنی زبان کا استعمال اگر تخلیقی ہے تو معنوی تہہ داری بھی پیدا ہوگی اور اظہار میں حسن بھی آئے گا۔ بلراج کو مل کا یہ بیان بھی قابل غور ہے "کوئی بیان اگر معنی کی سطح پر الفاظ کی میزان کے برابر رہ جاتا ہے تو نثر اور محض نثر ہے اور اگر وہ بیان ماورائے حدود لفظ ہو جاتا ہے تو بلاشبہ شعر ہے" اپنے مضمون سے حوالہ دینا کوئی اچھی بات نہیں۔ نثری نظم کے حوالے سے چند برس پہلے میں نے رسالہ الفاظ میں لکھا تھا :

”زبان روزمرہ کے استعمال کی چیز ہے، لیکن شاعری میں زبان سے جو اثر مرتب ہوتا ہے، وہ اس کے روزمرہ استعمال سے مرتب نہیں ہوتا۔ وہ اس لیے کہ شاعری میں زبان کا استعمال روزمرہ استعمال کی سطح سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ اس بارے میں پال ولیری نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ زبان کا کام ترسیل ہے، لیکن عام زبان میں جیسے جیسے بات کی ترسیل ہوتی جاتی ہے، لفظ یا جملے تحلیل ہوتے جاتے ہیں۔ عام گفتگو میں لفظ یا جملہ صرف اس حالت میں باقی رہتا ہے جب وہ سمجھ میں نہ آئے۔ اس صورت میں ہم بولنے والے سے کہتے ہیں کہ وہ اپنی بات دہرائے۔ چنانچہ دہرائی بات جیسے جیسے سمجھ میں آتی جاتی ہے، لفظ یا جملے کا اپنا وجود ختم ہوتا جاتا ہے، یعنی خیال و احساس اس کی جگہ لے لیتے ہیں اور الفاظ و جملے معدوم ہو جاتے ہیں۔ لیکن شاعری میں خیال و احساس کی ترسیل کے باوصف لفظوں یا زبان کا اپنا وجود باقی رہتا ہے۔ یعنی اخذِ معنی کے بعد لفظ تحلیل نہیں ہوتا، موجود رہتا ہے۔ اسی کو زبان کے روزمرہ استعمال سے ہٹا ہوا استعمال یا تخلیقی استعمال کہنا چاہیے ہماری لسانی جمالیات میں اجمال و ابہام اور استعارے و علامت کی جو اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں، ان کو بھی زبان کے عام استعمال کے برعکس تخلیقی استعمال کے اسی تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ گویا نثری نظم کی بنیادی پہچان یہی ہونی چاہیے کہ کیا زبان کے استعمال میں معنی و احساس کی ترسیل کے ساتھ ساتھ اپنے طور پر زندہ رہنے کی خوبی ہے یا نہیں۔ اگر یہ بنیادی خوبی نہیں تو نثری نظم میں خواہ اور جو بھی خوبیاں

ہوں، وہ نظم نہیں ہو سکتی اور اس میں اور عام نثر میں کوئی
فرق نہیں ہے

گویا زبان کا تخلیقی یا استعاراتی علامتی یا رمزیہ استعمال (یا بقول شمس الرحمن فاروقی
جدلیاتی استعمال) ہی دراصل وہ کلید ہے جس سے شاعری کی ایسی تعریف کی
جاسکتی ہے جو یونیورسل ہے۔ لسانیات کی ایک شاخ میں صرف LANGUAGE
UNIVERSALS پر غور کیا جاتا ہے یعنی META LANGUAGE زبان کے وہ تمام اجزا
جو زیادہ تر زبانوں میں ملتے ہیں اور جنہیں انسان نے مختلف زبانوں، مختلف
خطوں اور مختلف معاشروں میں لسانی سانچوں کے طور پر قبول کیا۔ یہ بات جتنی
لسانیات کے لیے صحیح ہے اتنی ہی شعریات کے لیے بھی صحیح ہے۔ یعنی ایک شعریات
تو ہر زبان کی اپنی ہوتی ہے اور ایک META POETICS ہے جس میں ایسے تمام
POETIC UNIVERSALS کا تصور شامل ہے جو تمام زبانوں کی شاعری میں بلا لحاظ
زمانہ و ثقافت و معاشرہ پائے جاتے ہیں۔ سونٹری آہنگ کا مسئلہ طے پا جانے
کے بعد نثری نظم کا وہ وصف جس کی وزیر آغا اور بعض دوسرے مقدر نقادوں کو
تلاش ہے، دراصل یہی عنصر ہے جس کو زبان کے تخلیقی استعمال سے موسوم کیا
جاسکتا ہے، زبان کا تخلیقی استعمال نہیں ہوگا تو نادر تجربہ شعری اظہار کی راہ نہیں
پائے گا اور اگر شعری اظہار نہیں ہوگا تو شعری معنی کا وجود قائم نہیں ہوگا۔ مزے
کی بات ہے کہ شعری زبان، شعری معنی کے برآمد ہونے کے بعد جیسا کہ کہا گیا، معنی
سے خالی نہیں ہو جاتی جب کہ عام زبان کا تفاعل افہام و تفہیم کے ساتھ ساتھ اُسے
معانی سے خالی کرتا جاتا ہے اور لفظ چھلکوں کی طرح زائل اور ازکار رفتہ ہوتے
جاتے ہیں۔ شاعری میں زبان کا تخلیقی یا پہلو دار استعمال اس کو قائم بالذات
حیثیت بخش دیتا ہے یعنی شعری زبان ہر قرأت کے ساتھ سامع یا قاری کو اُس
کے ذوق و ظرف کے مطابق معنی فراہم کرتی ہے پھر بھی جوں کی توں قائم رہتی
ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ عام زبان قائم بالغیر ہوتی ہے اور

شعری زبان قائم بالذات ہوتی ہے۔ نیز عام زبان میں لفظ و معنی میں ایک اور ایک کی نسبت ہوتی ہے جب کہ تخلیقی زبان میں لفظ و معنی میں ایک اور دو یا دو سے زیادہ کی نسبت ہوتی ہے۔ یہ شاعری کی وہ کم سے کم پہچان ہے جس کا اطلاق تمام زمانوں اور تمام زبانوں اور تمام شعری اصناف اور تمام شعری ہیئتوں پر ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی واضح رہے کہ شاعری میں زبان کا تخلیقی یا جدیدیاتی استعمال بالقصد اور بالارادہ ہوتا ہے جب کہ نثر میں اس کا وارد ہونا اتفاقی امر ہے، چنانچہ نثر کے ایسے پاروں کو جن میں زبان کا تخلیقی استعمال ملتا ہے، نظم کے طور پر منقلب کرنا اور انہیں نظم بنا کر پیش کرنا غیر شعری فعل ہے اور اصولاً غلط ہے۔ اس نکتے کا اثبات آگے چل کر کیا جائے گا۔ فی الوقت ساقی فاروقی اور کشورناہید کی یہ نظمیں ملاحظہ فرمائیے اور غور کیجیے کہ کیا ان میں نظم کا بنیادی تقاضا یعنی زبان کا تخلیقی استعمال ملتا ہے کہ نہیں، یعنی کیا ان کی پہچان زبان سے ہوتی ہے، نیز کیا ان کی معنیاتی تہ داری زبان کے تخلیقی استعمال کی دین ہے یا نہیں :

شیرامداد علی کا مینڈک

مگر تنگ نظر
 مٹیالے تالاب میں
 اُس ادھ کھلے کنول پر
 وہ بہا رہی تھی
 جو دیکھنے والی آنکھوں میں دھنک کھلاتی ہے
 پھر پانی کا بلا والاگ تھا
 اس ساحرانہ کشش سے ہار کر
 اپنا تہم راتا کر

وہ مُردہ پانی میں کود پڑے
 جل کنبھی سے اُلجھے
 تو ہفتے عشرے کے حمل کے مانند
 نرم اور خام سروں والے
 گل گتھنے
 (صدا کار میڈکوں کے
 دُمدار نیچے)
 شارک لہروں سے شور
 سے ڈر کے
 فر فر ہر طرف بھاگ کھڑے ہوئے
 اور شیرامداد علی گلے گلے پانی میں تھے
 اور کنول دور تھا —

بجلی چمکی
 اور ایک دُمدار آبِ خوار
 اس غبارے کی سُرعَت سے
 جس میں ہوا بھری ہو
 اور ہاتھ سے چھوٹ جائے
 چھپکلی کی تلوار زبان کی طرح
 سُن سُن کرتا ہوا
 ان کے کھلے منہ کی سُننگ میں اتر گیا —

دن گزرے

اور موسم بدلے
اور جگ بیت گئے

اک آواز تعاقب کرتی رہتی ہے :
”باہر آنے دو“

اس زنداں سے باہر آنے دو“
درجنوں ڈاکٹروں اور سرجنوں کے
اکسری کی خنک شعاعوں سے

جل کر دیکھ لیا

شہر بدل کر

ملک بدل کر دیکھ لیا

مگر لہو میں

وہی صدا ہلکورے لیتی ہے

”باہر آنے دو“

اس زنداں سے باہر آنے دو“

شیر امداد علی پانی کی امانت غصَب کیے

اپنے گھر میں زنجیر ہوئے بیٹھے ہیں

باہر پانی کھڑا ہے

اور پانی میں

پیل کے پتوں کی طرح

سالے

خشمگین آنکھوں والے

پیلے پیلے میڈک
اپنا گھیرا ڈالے
پڑے ہوئے ہیں

(ساقی فاروقی)

گھاس تو مجھ جیسی ہے

گھاس بھی مجھ جیسی ہے
پاؤں تلے بچھ کر ہی، زندگی کی مراد پاتی ہے
مگر یہ بھیگ کر کس بات کی گواہی بنتی ہے
شرمہ اری کی آنچ کی
کہ جذبے کی حدت کی

گھاس بھی مجھ جیسی ہے
ذرا سراکھٹانے کے قابل ہو
تو کاٹنے والی مشین
اُسے مخمل بنانے کا سودا لیے
ہموار کرتی رہتی ہے
عورت کو بھی ہموار کرنے کے لیے
تم کیسے کیسے جتن کرتے ہو
نہ زمین کی نمو کی خواہش مرتی ہے
نہ عورت کی

میری مانو، تو وہی پگڈنڈی بنانے کا خیال درست تھا
جو حوصلوں کی شکستوں کی آنچ نہ سہہ سکیں
وہ پیوندِ زمیں ہو کر

یونہی زور آوروں کے لیے راستہ بنا دیتے ہیں
مگر وہ پرکاش ہیں
گھاس نہیں

(کشورناہید)

گھاس تو مجھ جیسی ہے!

ساتی فاروقی کی خوبصورت نظم کے اظہاری اور معنیاتی الباد سے
میں اوراق اور شب خون میں تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں۔ اس بحث کو یہاں دہرانا
تحصیل حاصل ہوگا۔ اس نثری نظم کی اشاعت کو سات آٹھ سال گزر چکے ہیں۔
اب تک میری نظر سے کوئی ایسی تحریر نہیں گزری جس میں اس کی شعری حیثیت سے
انکار کیا گیا ہو۔ کشورناہید کی یہ نظم ان کے چوتھے مجموعے "گلیاں دھوپ دروازے"
سے لی گئی ہے جو ۱۹۷۸ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ تازہ مجموعہ "ملا متوں کے
درمیان" ہے جو ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا ہے۔ ان دونوں مجموعوں میں غزلیں
اور نظمیں بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ لیکن غالب حصہ نثری نظموں کا ہے۔ نثری نظموں
تو دوسروں نے بھی کہی ہیں لیکن اظہار کے اس نئے پیرایے پر جیسی توجہ کشورناہید نے
صرف کی ہے، دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ کشورناہید کی تخلیقی کاوش سے یہ نیا پیرایہ
اظہار ایک نئی توانائی اور حرارت سے آشنا ہو گیا ہے۔ انتظار حسین نے کشورناہید
کو اردو شاعری کی پہلی باغی عورت کہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کشورناہید
کی آواز اردو شاعری میں نسوانی ہستی کی پامالی کے خلاف پہلی شعری احتجاج کی
آواز ہے۔ انھوں نے پابند شاعری یعنی غزل اور نظم بھی لکھی ہے، اور ان کے
کلام کے پانچ مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ آج سے پندرہ بیس برس پہلے کشورناہید
نے نسوانی احساس اور عورت کے درد کے اظہار سے اردو شاعری میں ایک
نئی طرز کی بنیاد ڈالی تھی۔ کیا "گھاس تو مجھ جیسی ہے" میں یہی آواز نسوانی ہستی کی
صلیب اٹھائے نظر نہیں آتی؟ یہاں شمس الرحمان فاروقی جواز کا سوال اٹھا سکتے
ہیں، یعنی جب غزل یا آزاد نظم میں یہ احساس یا کوئی بھی احساس ادا کیا جاسکتا

ہے تو نثری نظم کا صنفی یا مہیتی جواز کیا ہے؟ قطع نظر اس سوال کی دوسرے جہات کے، یہی دلیل اس سوال کے رد میں بھی دی جاسکتی ہے کہ ایک احساس اگر غزل یا آزاد نظم میں ادا کیا جاسکتا ہے تو نثری نظم میں ادا کیوں نہ کیا جائے۔ سامنے کی بات ہے کہ بعض اصناف کا تصور معنیاتی یا موضوعاتی ہے، مثلاً مثنویہ یا شہر آشوب یا گیت یا بارہ ماسہ، لیکن بعض دوسری اصناف میں موضوع کی قید نہیں۔ چنانچہ اظہار کے وہ تمام معنیاتی مطالبات جو پابند نظم یا آزاد نظم سے کیے جاسکتے ہیں، وہ کہیں زیادہ وسیع پیمانے پر نثری نظم سے بھی کیے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ نثری نظم سے یہ توقع تو کی ہی جاسکتی ہے کہ اس میں تخلیقی تجربہ وزن کی ملفوظاتی REDUNDANCIES سے جو شعری نظام میں در آتی ہیں، آزاد ہو کر بیان ہو سکتا ہے۔ کسی بھی صنف کے جواز یا عدم جواز کا بنیادی سا نچہ دراصل تخلیق خود ہے۔ کیا قصیدے کی تشبیہ سے غزل کے برآمد ہونے سے پہلے، غزل کا کوئی صنفی جواز تھا، یا آزاد نظم کے پابند نظم سے برآمد ہونے سے پہلے آزاد نظم کا کوئی صنفی جواز تھا، غالباً اس سوال کا جواب دونوں طرح سے دیا جاسکتا ہے۔ تاہم مثبت جواب یہی ہوگا کہ اظہار کے نئے وسیلوں کی تلاش اور آزادی کی نئی فضا کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔

یہاں ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ بے حد ضروری ہے۔ اردو میں آزاد نظم کا تجربہ مغرب سے مستعار ہے۔ لیکن انگریزی میں اس ضمن میں جتنی آزادیاں ہیں، اردو میں وہ نہیں ہیں۔ اردو کے بارے میں معلوم ہے کہ آزاد نظم میں مصرعے چھوٹے بڑے ہو سکتے ہیں لیکن اوزان ایک ہی بحر کے ہوں گے۔ اس کے برعکس انگریزی میں آزاد نظم مختلف بحر میں ہو سکتی ہے اور آزاد نظم کی اتنی تعریفیں کی گئی ہیں کہ دراصل اس کی کوئی مرکزی تعریف رہی ہی نہیں۔ یعنی انگریزی کی آزاد نظم میں اظہاری پیرایے کی لچک کے لامحدود امکانات ہیں۔ انگریزی میں آزاد نظم کے تحت اکثر شعرا اپنی پسند

اور ضرورت کے مطابق ایک نئی وضع اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض لوگوں نے FREE VERSE کی یہ بھی تعریف کی ہے کہ ایسی نظم جو عروض کے مصنوعی آہنگ سے نجات دلا کر اظہار کی بنیاد بول چال کے فطری بہاؤ پر رکھتی ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آزاد نظم اور نثر کا فرق بنیادی طور پر تخلیق کار کے منشا کا معاملہ ہے۔ یعنی شاعر اگر کسی اظہاری پارے کو نظم کے طور پر پیش کرتا ہے تو اسے نظم / نثر کے طور پر پڑھنا اور جانچنا چاہیے۔ شمس الرحمان فاروقی نے بھی بورخس کے حوالے سے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ”ہر وہ تحریر جسے شاعری کی طرح تصور کیا جائے، شاعری ہے۔“ چنانچہ ہر وہ تحریر جس میں شاعری کا سا ارتکاز اور شدت ہو، اور جسے نظم کی طرح پیش کیا جائے، نظم ہے۔ البتہ مغرب میں نثری نظم پیراگراف میں بھی شائع کی جاتی ہے۔ اردو میں بالعموم نثری نظم سطروں اور بندوں میں لکھی جاتی ہے۔ اگرچہ پیراگراف میں لکھی جانے کی مثالیں موجود ہیں۔ بلراج کوئل کی ایک نثری نظم شاعر کے نثری نظم نمبر میں، پیراگراف میں شائع ہوئی ہے۔ لیکن اردو میں شاید پیراگراف کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ نثری نظم اردو میں دراصل عروض کی مصنوعی پابندیوں کو خیر باد کہہ کے وہ آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے جو انگریزی FREE VERSE میں پہلے سے موجود ہے۔ یہ بات سطروں اور بندوں کے التزام سے پوری ہو سکتی ہے تو پیراگراف کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ اردو میں انگریزی کی تقلید میں پیراگراف میں نثری نظمیں زیادہ نہیں لکھی گئیں۔ البتہ ہر وہ نثری نظم جس میں زبان کا تخلیقی استعمال ہو، اور شاعری کا سا ارتکاز اور شدت ہو اور جسے نظم کے طور پر سطروں اور بندوں میں پیش کیا جائے وہ نظم ہے، اور اسے نظم ہی کے طور پر پڑھنا چاہیے۔ اتنی

۵۔ انگریزی میں فری ورس نظم منظور کو بھی محیط ہے۔ ڈاکٹر حنیف کیفی: اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم

بات سب کو معلوم ہے کہ بہت سی پابند یا آزاد نظمیں، باوجود اپنے کم از کم عنصر یعنی بحر و وزن کے معنیاتی طور پر کوئی نقش نہیں چھوڑتیں اور شعری سرمائے سے زائل ہو جاتی ہیں، اور ایسی نظموں کی تعداد اصل اور کھری نظموں سے ہمیشہ کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ یہ شاعری کا عام اصول ہے تو نثری نظم اس عام اصول سے مستثنیٰ کیسے قرار پاسکتی ہے۔ نثری نظموں میں بھی بڑی تعداد ایسی نظموں کی ہو سکتی ہے جن میں شعری جوہر نہ ہو اور جو بحیثیت نظم کے قائم نہ ہوتی ہوں۔ اس کے برعکس اگر بعض مستند شاعروں نے ایسی نظمیں لکھی ہوں جن میں شعری جوہر بھی ہو اور جو متاثر بھی کرتی ہوں تو کیا اس کے بعد بھی اس نئے وسیلہ اظہار کے صنفی جواز کا وجود ثابت کرنا باقی رہ جاتا ہے۔ جس طرح ہر تخلیق اپنا جواز خود ہے اسی طرح ہر کامیاب نظم کا پیرایہ اظہار بھی اس کے صنفی جواز کا واضح طور پر اثبات کرتا ہے۔

اس مضمون میں کسی اور شاعر کی نظمیں نہ بھی پیش کی جاتیں اور صرف کشورناہید کی نظموں ہی سے استنباط کیا جاتا تو بھی شعری جواز کا مقدمہ فیصل ہو سکتا تھا۔ میری مشکل یہ ہے کہ کشورناہید کے یہاں اچھی نظموں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ایک یا دو نظموں کا ذکر کرنا بہت مشکل ہے۔ مثلاً "نیلام گھر"، "ہم نے خواہشوں کے سارے پرندے اڑا دیے ہیں"، "ترا لٹیاشہر بھنبھور"، "دھواں چھوڑتی بسیں"، "تمھاری خاموشی میرا جرم"، "ڈوبتی آنکھوں کا رزمیہ"، "مجھ سے چھپے رہو"، "ریل کی پٹریوں کے نیچے کٹی ہوئی نظم"، "دوسری پیدائش" ان سب میں آتش فشاں لاوے کی کیفیت ہے۔ چونکہ ان میں سے انتخاب کرنا مشکل ہے، بالکل سامنے کی دو نظموں کو پیش کیے دیتا ہوں۔

ایک نظم اجازتوں کے لیے

تم مجھے پہن سکتے ہو

کہ میں نے اپنے آپ کو
 دھلے ہوئے کپڑے کی طرح
 کئی دفعہ نچوڑا ہے
 کئی دفعہ دکھایا ہے
 تم مجھے چبا سکتے ہو
 کہ میں چوسنے والی گولی کی طرح
 اپنی مٹھاس کی تہہ گھلا چکی ہوں
 تم مجھے رلا سکتے ہو
 کہ میں نے اپنے آپ کو قتل کر کے
 اپنے خون کو پانی پانی کر کے
 آنکھوں میں جھیل بنالی ہے
 تم مجھے بھون سکتے ہو
 کہ میری بوٹی بوٹی
 تڑپ تڑپ کر
 زندگی کی ہر سانس کو
 الوداع کہہ چکی ہے
 تم مجھے مسل سکتے ہو
 کہ روٹی سوکھنے سے پہلے
 خستہ ہو کر بھر بھری ہو جاتی ہے
 تم مجھے تعویذ کی طرح
 گھول کر پی بھی جاؤ
 تو میں کلیساؤں میں سجتی گھنٹیوں میں
 اسی طرح طلوع ہوتی رہوں گی

جیسے گل آفتاب!

گود میں لحد

اب میں

سونے سے پہلے خود کو مار دیا کرتی ہوں

کہ میرے اندر سوئی ہوئی خواہشیں

مجھے سوتا رکھ کر باہر نہ آجائیں

کہ میرے اندر ٹھہرے

قوت برداشت کے سمندر

بپھر کر مجھے بہانہ لے جائیں

یاد ہے

میں نے تمہارے سگرٹوں کے سجھے ٹکڑوں سے

اپنا وجود بنانے کی کوشش کی تھی

مسئلے ہوئے ٹکڑوں سے

مسلا سا وجود بن تو گیا تھا

مگر اس میں آگ جیسی تپش دور دور تک نہیں تھی

پھر میں نے جوتوں کے گھسے ہوئے تلوں سے

اپنا وجود بنانے کی کوشش کی

یہ کام آسان بھی تھا

کہ ہر تیلے پر میرے جسم کے کسی نہ کسی حصے کا

نقش موجود تھا

مگر اس سارے وجود میں

کوئی حرکت، کوئی دھڑکن نہیں تھی

پھر میں نے اپنی آنکھوں کا پانی نچوڑ کر

دھنک بنانے کی کوشش کی

دھنک نے مجھ سے کہا

اپنی قاش قاش کو

میری طرح کماندار بنا لو

کوڑے کے ڈھیر جیسے میرے وجود نے

اس خیال کو بھی خواب سمجھا

اور میں کمرے کی تنہائی پہن کر بیٹھ گئی

ان نظموں میں کچلی ہوئی نسائی ہستی کے دکھ کی جو آگ ہے اور ان میں استخوان
سوزی کی جو کیفیت ہے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ یہی شدت ان نظموں
میں بھی ہے جن میں سماجی درد کا اظہار ہوا ہے۔ تیسرے درجے والوں کی پہلی
ضرورت، "نائٹ میئر"، "آگ اور برف کے درمیان آنکھیں" جیسی نظموں میں
عجیب و غریب کڑواہٹ اور آگ ہے۔ ذرا اس مختصر سی نظم کو ملاحظہ فرمائیے:

حضرت نوح کے زمانے کی کہانی

بدنمائی نہیں دیکھنی چاہتے ہو

تو ایک آنکھ بند کر لو

اب بھی نظر آتی ہے

تو دوسری آنکھ بھی بند کر لو

دلخاش آواز سنائی دیتی ہے

تو دونوں کان بند کر لو

کہ کانوں میں گونج رہ جائے

تو کان کھولنے کی ہمت ہی نہیں رہتی ہے

طوفان آنے کا خدشہ ابھی بہت دور ہے

فلڈ کنٹرول سیل کام کر رہا ہے
پانی کی زیر زمین گذرگا ہوں کو
بند کرنے کا،

کاغذ پہ لکھی تحریر منع ہے تو
پتوں کو پڑھ لو

کہ زمین بھی تو انسان کو شراب کی طرح
پی کر مدہوش ہونے کا شوق رکھتی ہے

اس میں بد نمائی کس چیز کا اشارہ ہے۔ دونوں آنکھیں بند کرنا یا دونوں کان
بند کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ طوفان آنے کا خدشہ ابھی بہت دور ہے، کیوں کہا
گیا ہے؟ فلڈ کنٹرول سیل سے کیا مراد ہے؟ زیر زمین گزرگا ہیں کیا ہیں؟ یہ
کیسا پانی ہے اور کیسا طوفان ہے، جو ہر چیز کو بہالے جانے کا امکان رکھتا ہے۔
آخر میں پتوں پر کی کس تحریر کو پڑھنے کی دعوت دی جا رہی ہے اور زمین انسان
کو شراب کی طرح پی کر مدہوش ہونے کا شوق کیوں رکھتی ہے۔ ان سب
سوالوں کے جواب سیاسی سماجی نوعیت کے ہیں۔ کیا اس نثری نظم میں شعری
یا معنوی جوہر کسی پابند یا آزاد نظم سے کم ہے؟ بعض نظموں میں نسانی ہستی کا
کرب سیاسی سماجی درد کے ساتھ مل کر اور بھی اذیت ناک ہو گیا ہے کیونکہ
صنعتی محرومیاں اور بے انصافیاں اصلاً معاشرتی نظام ہی کی پیداوار ہیں اور
پھر ایک خاص طرح کا جبران بے انصافیوں کو برقرار رکھنے میں مسلسل کارفرما
رہتا ہے۔ یہاں آخر میں شہریار اور جاوید شاہین کی ایک ایک نثری نظم
پیش کی جا رہی ہے جس سے مندرجہ بالا مقدمے کی مزید توثیق ہوگی:

ایک نظم

کیا تمہیں یاد ہے

تم نے رات کے ہاتھ پر قسم کھائی تھی
کہ صبح کے سورج کی تلوار کی چمک

اور کاٹ سے

تم خوف زدہ نہیں ہو گے

اور اپنی آنکھوں میں

تم نے خوابوں کے جو خزانے چھپا رکھے ہیں

انہیں کسی ایسے آدمی کو

بہ طور تحفہ دے دو گے

جو تم سے زیادہ

بلند حوصلہ، نڈر اور جبری ہو

تو اب کیا سوچتے ہو

(شہریار)

عدالت کو کیسے سمجھاؤں

صبح منہ اندھیرے

میں نے گھر کا دروازہ کھولا تو

دہلیز پر

آنے والے دن کی لاش پڑی تھی

لاوارث لاش

ایک میلی چادر میں لپیٹی تھی

نہ جانے کون اُسے

رات کی تاریکی میں

میرے گھر کے سامنے پھینک گیا تھا

میں ایک شریف شہری ہوں
 محلے میں میری کسی سے دشمنی نہیں
 میں تو کبھی اونچی آواز سے بولاتا تک نہیں
 پھر مجھے پریشان کرنے کے لیے
 یہ حرکت کس نے کی؟
 پولیس کو مجھ پر شبہ ہے
 وہ لاش ننگی کر کے
 چادر اپنے قبضے میں لے چکی ہے
 اُس کا موقف ہے
 کہ یہ وہی چادر ہے
 جسے میری بیوی
 اپنے بدن پر لپیٹ کر
 عدالت کے سامنے پیش ہوئی تھی
 اور فحاشی کے الزام سے
 بری قرار پائی تھی
 میں تسلیم کرتا ہوں
 کہ پولیس کا موقف درست ہے
 لیکن قصور میرا بھی نہیں
 میں نے تو اس چادر سے
 گھر کی چار دیواری بنالی تھی
 پھر وہی چادر
 ایک بے حد ضرورت مند
 مجھ سے خدا کے نام پر

مانگ کر لے گیا تھا
 اب میں عدالت کو کیسے سمجھاؤں
 کہ میرے ساتھ تو
 خدا کے نام پر
 بہت بڑا دھوکا ہوا ہے

(جاوید شاہین)

(۵)

اس سلسلے میں ابھی چند نکات مزید غور طلب ہیں۔ اول یہ کہ مغرب میں یہ تحریک دوسو برس پرانی ہے۔ انگریزی میں نثری نظم کم و بیش آزاد نظم ہی کا ایک روپ ہے۔ اردو میں اس کا رواج پہلے کیوں نہیں ہوا، اور اب کیوں سراٹھا رہی ہے؟ اس کا آسان جواب یہ ہو سکتا ہے کہ کسی بھی زبان میں کوئی رجحان اسی وقت زور پکڑتا ہے جب اس کے لیے زمین ہموار ہو۔ اردو میں عروض کی جگر ٹبت دیاں سخت ہیں۔ آزاد نظم نے تقریباً نصف صدی کے ارتقائی عمل میں انہیں کچھ نرم کیا ہے۔ نثری نظم اردو میں آزاد نظم کے راسخ ہونے کے بعد ہی آسکتی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ نثری نظم کے رد میں بعض احباب نے ایسی مثالیں پیش کی ہیں کہ اصلاً نثر ہیں لیکن ان کو شاعری کی طرح لکھا جاسکتا ہے۔ نظیر صدیقی نے محمد حسین آزاد، نیاز فتحپوری، اور ابوالکلام آزاد کی نثر سے مثالیں دی ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی نے خطوطِ غالب سے ایسے نمونے پیش کیے ہیں۔ انہوں نے انتظار حسین، سریندر پرکاش اور انور سجاد کی نثریروں سے بھی اسی طرح کا استنباط کیا ہے، اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان عبارتوں میں اور آج کی نثری نظم میں

کوئی فرق نہیں۔ یہ نتیجہ دراصل ان کے اس مقدمے سے تقویت حاصل کرتا ہے
 " اگرچہ یہ درست ہے کہ کبھی کبھی نثر، نظم بن سکتی ہے لیکن نظم کبھی نثر نہیں بن
 سکتی۔" (لفظ و معنی) یہ بیان متناقض ہے کیونکہ اگر نظم کبھی نثر نہیں بن سکتی تو وہ
 کون سا اصول یا دلیل ہے جس کی رو سے کبھی کبھی نثر، نظم بن سکتی ہے۔ میری حقیق
 رائے میں جس طرح نظم کبھی نثر نہیں بن سکتی، بالکل اسی طرح اس کا الٹ بھی صحیح
 ہے کہ نثر کبھی نظم نہیں بن سکتی۔ اس لیے کہ شاعر یا مصنف کے ارادے یا نیت
 کو نثر یا نظم کی تعریف میں خاصا دخل حاصل ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔
 نثر میں اگر کبھی شعری پیرایہ در آتا ہے، تو وہ اتفاقی ہے، اختیاری نہیں اور اس
 کو نثر کے سیاق و سباق سے الگ کر کے نظم کے طور پر لکھنا اس کے نثری
 قالب، منطقی ترتیب اور فطری حیثیت کو اسی طرح مجروح کرنا ہے جس طرح کسی
 نظم کو نثر کے طور پر لکھنا۔ نظم جس طرح منفرد اظہاری اکائی ہے اور اس کی نثری
 تقلیب غیر ادبی فعل ہے، اسی طرح نثر بھی ادبی اکائی ہے اور اس کے کسی حصے
 کی نظمیہ تقلیب بھی ویسا ہی غیر ادبی فعل ہے۔ اگر اس دلیل کو رد بھی کر دیا
 جائے (اگرچہ یہ رد خلاف اصول ہوگا) تو بھی اس سلسلے کی سب سے اہم بات
 فنکار کا منشا اور حق انتخاب ہے، اور اس پر کسی طرح کی پابندی عائد کرنا گویا
 فنکار کی تخلیقی آزادی سے انکار کرنا ہوگا۔ تسلیم کہ فنکار نثری نظم سے ملتا جلتا
 شعری اظہارِ اثنائے یا افسانے میں کر سکتا ہے جس کی متعدد مثالیں موجود
 ہیں، لیکن اگر وہ افسانہ یا اثنائے کے صنفی تقاضوں سے بے نیاز ہو کر اس
 شعری اظہار کو نثری نظم کی صورت میں پیش کرنا چاہے، تو کیا اسے ایسا کرنے
 سے روکا جاسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب اثبات میں نہیں دیا جاسکتا۔
 تیسری بات یہ ہے کہ کیا نثری نظم کے لیے واقعی صنف کی اصطلاح
 استعمال کی جاسکتی ہے جیسا کہ اکثر ہو رہا ہے۔ کیا نثری نظم کو صنف کہنا ہماری
 زیادتی نہیں، کیونکہ صنف تو بہر حال نظم ہے۔ غرض پابند نظم اور اس کی اقسام،

آزاد نظم، معری نظم، یہ سب نظم کی ہیئتیں ہیں، اسی طرح نثری نظم بھی نظم کی محض ایک ہیئت ہے۔ یہ الگ سے کوئی صنف نہیں۔ اسے صرف ایک ہیئت تسلیم کر لیا جائے (جو یہ واقعی ہے) تو صنفی جواز کا سوال خود بخود کالعدم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی سوال واقعی رہ جاتا ہے اور پوچھا جاسکتا ہے، تو وہ نثری نظم کے ہیئت جواز کا ہے۔ اور جہاں تک ہیئت جواز کا تعلق ہے، اس کا کافی وثافی جواب نثری آہنگ والے حصے میں پیش کیا جا چکا ہے۔

چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ جس طرح ایک شعر کی ایک سے زیادہ قرائتیں ہو سکتی ہیں، اسی طرح کسی بھی نثری نظم کی ایک سے زیادہ قرائتیں ممکن ہیں۔ کسی نثری نظم کے ایک کلمے یا مصرعے کو ایک شخص ایک طرح سے پڑھ سکتا ہے، اور دوسرا دوسری طرح سے۔ یعنی کوئی کسی لفظ پر زیادہ زور دے سکتا ہے، اور کوئی کسی اور لفظ پر، نیز سُر لہر کا بھی فرق ہو سکتا ہے۔ اس سے سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا آہنگ غیر معین ہے، اور اس کی نظریاتی بنیاد نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بنیاد ہے اور یقیناً ہے جیسا کہ ہم نثری آہنگ والے حصے میں ثابت کر چکے ہیں لیکن آہنگ بھی دراصل لفظ کی طرح معنی سے جڑا ہوا ہے۔ جس طرح شعر میں مختلف قرائتیں مختلف مطالب کے اعتبار سے ہوتی ہیں، اسی طرح اگر کسی نثری نظم کی یا اس کے کسی حصے کی کوئی دوسری قرأت ہو سکتی ہے، تو وہ معنی ہی کے اعتبار سے ہوگی جس کا شعری زبان میں امکان ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ لیکن کوئی بھی قرأت خواہ وہ کم مختلف ہو یا زیادہ، مبنی ہر حالت میں آہنگ ہی پر ہوگی، یعنی اس میں طول، بل اور سُر لہر کی صفات لامحالہ ہوں گی، اور یہ انہیں اصولوں کے تابع ہوں گی جو نثری آہنگ والے حصے میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ گویا ہر قرأت کا آہنگ لائق تجزیہ ہے، اور یہ مبنی بر اصول ہے۔ واضح رہے کہ ہر وہ ہیئت جو مبنی بر اصول ہے اور لائق تجزیہ ہے، اس کا نظریاتی وجود ثابت ہے۔

پس ثابت ہوا کہ :

۱۔ نثری نظم وزن و بحر پر مبنی عروضی نظام کی نفی ہے۔ جو چیز عروضی نظام میں کسی طرح بھی مصنوعی موزونیت کی جان ہے، وہ نثری نظم کی نفی ہے، اور جو چیز نثری نظم کی جان ہے یعنی زبان کا فطری آہنگ، وہ با وزن شاعری کی نفی ہے۔

۲۔ نثری نظم کی تکنیکی بنیاد نثری آہنگ پر ہے۔ نثری آہنگ تجزیاتی نوعیت رکھتا ہے اور اس کی شناخت کی جاسکتی ہے، اگرچہ اس کی پیروی کے لیے کسی التزام کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ زبان کے فطری آہنگ پر مبنی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ زبان کے فطری آہنگ کی آزادی کو بروئے کار لانے کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

۳۔ ایسی تمام تحریریں جنہیں شاعر نظم کی طرح پیش کرے، انہیں نظم کی طرح پڑھنا اور جانچنا چاہیے۔ چنانچہ نثری نظم بھی جس کو نظم کی طرح پیش کیا جائے، نظم ہے۔ نثری نظم صنف نہیں، محض ہیئت ہے۔ صنف نظم ہے جس کی متعدد ہتیتی اقسام ہیں۔ نثری نظم بھی نظم کی ایک قسم ہے۔

۴۔ نثری نظم میں زبان کے تخلیقی استعمال یعنی شعری استعمال کی بڑی اہمیت ہے۔ یعنی لفظ و معنی میں ایک اور ایک کی نسبت نہیں ہے، بلکہ ایک یا دو، یا دو سے زیادہ کی نسبت کا امکان ہوتا ہے۔ نیز ضروری ہے کہ معنی کی ترسیل کے با وصف زبان قائم بالذات ہو۔

۵۔ نثری نظم میں شدت احساس، از نکاز اور وحدت تاثر کی وہ جملہ خصوصیات ہونی چاہئیں جو پابند نظم یا آزاد نظم میں پائی جاتی ہیں۔

۶۔ نثری نظم میں لفظوں کی ترتیب اسی طرح فطری اور سادہ ہوتی ہے جس طرح عام بول چال یا تکلم میں ہوتی ہے۔ البتہ کلموں کی

پیش کش سطروں اور بندوں میں اسی طرح ہو سکتی ہے جس طرح بالعموم آزاد نظموں میں ہوتی ہے۔

۷۔ نثری نظم کا ڈھانچہ اگرچہ اکثر و بیشتر واقعاتی ہوتا ہے، اور اس میں کہانی کی سی کیفیت ہوتی ہے، لیکن اس کا معنیاتی تفاعل تمثیلی/علامتی/استعاراتی/رمزیہ ہوتا ہے جو اپنی وسعت کے اعتبار سے غیر واقعاتی ہوتا ہے، اور آفاقی نوعیت رکھتا ہے۔

۸۔ نثری نظم کی بنیاد اگرچہ اوزان و سحر کے کسی ایسے تصور پر ہرگز نہیں جو موزونیت کے خود ساختہ سانچوں کا محتاج ہو، تاہم اردو میں نثری نظم کو آزاد نظم ہی کی توسیع سمجھنا چاہیے کیونکہ مغربی زبانوں اور پرصغیر کی بہت سی علاقائی، ہند آریائی اور دراوڑی زبانوں میں آزاد نظم کی ایسی شکلیں موجود ہیں جن میں لفظوں کی ترتیب اوزان و سحر کی بنا پر نہیں بلکہ نثری آہنگ کی بنا پر قائم ہوتی ہے۔

آخر میں پروفیسر آل احمد سرور کا شکریہ واجب ہے کیونکہ یہ مضمون ان کی فرمائش پر لکھا گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور شمس الرحمان فاروقی کا شکر گزار ہوں کیونکہ ان کی آرا اس مضمون کا محرک ثابت ہوئیں۔ آہنگ والے حصے کے شمول پر پروفیسر مسعود حسین خاں نے بھی اصرار فرمایا، ان کا بھی شکر گزار ہوں۔

اس مضمون میں پیش کردہ بہت سی آرا سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔

میں پچھلے کئی برسوں سے اس بارے میں جو کچھ سوچتا اور محسوس کرتا رہا ہوں، وہ میں نے عرض کر دیا ہے جن نظموں کو میں نے پیش کیا ہے، ان سے اور بہت سی دوسری نظموں سے جن کی تفصیل کا یہ مضمون متحمل نہیں ہو سکتا تھا، میں اسی طرح لطف اندوز ہوتا ہوں جس طرح بعض اچھی پابند یا آزاد نظموں سے۔ اس بات کو بہر حال نظر میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ کسی دوسری زبانوں میں آزاد نظم لامحدود آزادیوں کی وجہ سے نثری نظم کو گود لیے ہوئے ہے۔ چنانچہ ان زبانوں میں نظم خواہ پابند

نظم ہو، آزاد نظم ہو، یا نثری نظم ہو، اسے نظم ہی کہا جاتا ہے۔ اردو میں بھی اگر نثری نظم کے نام پر لکھی جانے والی تخلیقات میں شعری جوہر ہے، تو ان کو نظم کہنا چاہیے۔ اگر ان تخلیقات میں واقعی تخلیقی جوہر ہے، تو یہ تخلیقات آئندہ ایسی مزید تخلیقات کے لیے راہ ہموار کریں گی، اور یہ رجحان بتدریج راسخ ہوتا جائے گا۔ نظم، نظم ہے اور اگر اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے، تو وہ باقی رہے گی، ورنہ خود بخود کالعدم ہو جائے گی۔

(ستمبر ۱۹۸۴ء)

خواجه حسن نظامی کی نثری ارضیت

خواجه حسن نظامی کا نام اردو کے ان ادیبوں میں ہمیشہ احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔ جو اردو کی ادبیت کے رمز شناس تھے اور جنہوں نے اپنے زور قلم سے اردو کے حسن کو نکھارا اور اس کی کشش کو سب سے تسلیم کرایا۔ ان کی تصانیف کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ وہ صوفی اور درویش دلریش تھے اور انہوں نے جو کچھ بھی لکھا، معاشرے کی دینی، اخلاقی اور روحانی اصلاح کے لیے لکھا۔ وہ تصوف کی ایک ایسی مہتمم بالشان روایت کے امین تھے جس کے فیوض و برکات برصغیر کی تہذیب اور روحانی تاریخ کا حصہ ہیں، اور جس کے نور ہدایت سے کروڑوں دلوں کو باطنی سکون کی دولت نصیب ہوئی۔ روحانیت کی یہ روایت صدیوں پرانی ہے، اور اردو زبان و ادب پر اس کا گہرا اثر رہا ہے۔ صوفیہ کا رابطہ چونکہ عوام سے تھا، اس لیے انہوں نے ہمیشہ عوام کی زبان کو ترجیح دی اور اردو کے سادہ اور سہل اسلوب کو اختیار کیا تاکہ اپنے مطالب کو عوام کے دلوں تک پہنچا سکیں۔ خواجہ حسن نظامی نے بھی سلیس اور عام فہم زبان کو اپنایا۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے :

” ہمارے مخاطب جاہل لوگ ہیں۔ ہم کو ان کی زبان میں بات کرنی

رہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو سمجھانے کے لیے ہنر اردو پڑھے لکھے عالم فاضل

صوجود ہیں، مگر ان غریبوں کا کوئی سہیہ۔“

مولوی عبدالحق اس معاملے میں ان سے بھی آگے تھے۔ خواجہ صاحب کا مسئلہ تو ان کے قارئین اور ارادت مندوں کا تھا۔ مولوی صاحب سادگی اور سہولت کا رشتہ اردو کے لسانی مزاج سے جوڑتے ہوئے لکھتے ہیں :

” آج کل اپنی جہالت چھپانے یا اپنی علمیت جتانے کے لیے خواہ مخواہ بعض لوگ عربی فارسی ترکیبوں اور مشکل اور دقیق الفاظ کا بوجھ بے چارگی اردو کی گردن پر ڈالتے ہیں کہ وہ اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہ اردو کی ترقی نہیں تیزی ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اردو مقبول ہو۔ مگر ان کی تحریروں سے وہ مر دود ہوتی ہے۔ جو فصاحت سادگی میں ہے، وہ ان پیچیدہ تحریروں میں کہہ پاؤں۔ یہ گڑبگڑ کوئی خواجہ صاحب سے سیکھے۔“

خواجہ صاحب نے سادہ و سلیس زبان کو تو اپنایا، لیکن ان کا اصل کمال اس میں ہے کہ انہوں نے نثر میں ایسا طراور ایسا پیرایہ بیان اختیار کیا کہ خشک اخلاقی و روحانی و اصلاحی مباحث کو نہ مہرب یا تصوف کے دائرے سے نکال کر ادب میں لے آئے۔ ان کی تحریروں کا غالب محرک شاید یہ جذبہ ہے کہ ان کی آواز دل سے اٹھے اور دل پر اثر کرے۔ خود انہوں نے اعتراف کیا ہے ”یہ تحریریں ان کے لیے ہیں جو دل رکھتے ہیں۔“ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ :

”خواجہ صاحب حسن نظارگی کی عبارت میں جو نچلا ہے، جو سیدھی سادی

بات کو چھوڑنے کی طرح شگفتہ کر دیتا ہے۔“

لیکن یہ خوبی ان کی سب تحریروں میں یکساں نہیں ملتی۔ خواجہ حسن نظامی نے دینی مضامین بھی لکھے، قصے کہانیاں بھی لکھیں، تاریخی واقعات بھی لکھے، اخبار نویسی اور صحافت بھی کی، لیکن ان کی عبارت کے جوہر ان چھوٹے چھوٹے مضامین ہی میں کھلتے ہیں جن میں سیدھی سادی باتوں کو انہوں نے اپنے چونچلے یعنی نثر کی تخلیقیت سے ”چھوٹوں کی طرح شگفتہ“ کر دیا ہے۔ یہی وہ تحریریں ہیں جن کے ذریعے انہوں نے صوفیانہ مضامین کو تصوف سے نکال کر ادبی سطح پر پیش کیا۔ یہ مضامین چھوٹی چھوٹی معمولی چیزوں پر ہیں مثلاً دیاسلانی، لائین، کولہ، مچھڑ ہٹی کا تیل، مکھی، اوس، روئی، سوئی، پسینہ، ہچکی، ایسی

تحریروں میں بات سے بات پیدا کرتے ہوئے جس طرح تمثیل اور تجسیم کے پیرائے میں خواجہ صاحب نے بذکرہ سنجی کا حق ادا کیا ہے، دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اردو میں مضمون یعنی انشائیے کا وجود تو پہلے سے تھا اور تمثیلی مضامین یا کہانیاں بھی لکھی جا چکی تھیں، لیکن اس نوعیت کے عارفانہ انشائیے جن میں تصوف و ادبیت کا امتزاج ہو، اس سے پہلے نہ تھے۔ اس رنگ کی ابتدا کرنے والے خواجہ صاحب ہی تھے، اور یہ انہیں کے ساتھ ختم بھی ہو گیا، اگرچہ بہتوں نے تقلید کی کوشش کی لیکن کسی سے نہج نہ سکا۔ خواجہ صاحب کی کاروباری ذہنی اور صحافتی تحریروں کے مقابلے میں معمولی چیزوں پر لکھے گئے یہ پھوٹے پھوٹے مضامین ہی ان کا اصل ادبی کارنامہ ہیں، اور یہی اردو ادب میں ان کی شہرت اور بقا کے ضامن بھی ہیں۔ پال والیری نے زبان کے ادبی استعمال کے بارے میں بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ زبان کا مقصد چونکہ ترسیل ہے اس لیے عام زبان معانی کی ترسیل کے ساتھ ساتھ تحلیل ہو جاتی ہے، یعنی الگ سے اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ اور اگر وجود باقی رہے یعنی زبان اپنی حیثیت سے قائم بالذات رہے تو یہی اس کی ادبیت کی پہچان ہے۔ خواجہ صاحب کے مضامین اس اعتبار سے ادبی امتیاز کے حامل ہیں کہ ان میں مطالب کی ترسیل کے ساتھ ساتھ زبان کی اپنی حیثیت بھی برقرار رہتی ہے۔ ان مضامین کو انشائیے ان کی زبان کی اس خوبی نے بنایا ہے جس کی شیرازہ بندی، فحری ندرت، بات میں بات پیدا کرنے کے ملکہ، اور سامنے کی چیزوں میں روحانی جہت دیکھنے کی صلاحیت سے ہوتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے اسلوب کی سلاست و لطافت اور دزمرے و محاورے کی سب نے داد دی ہے، لیکن ان کی نشر کا نسب نامہ جس طرح محمد حسین آزاد یا غالب سے ملایا جاتا ہے، اسلوبی اعتبار سے وہ مناسب نہیں ہے۔ اگرچہ خواجہ صاحب نے محمد حسین آزاد کو اپنا معنوی استاد تسلیم کیا ہے، لیکن ایسا صرف تجسیم و تمثیل کے انداز کی حد تک ہے جو بہر حال خواجہ صاحب کے یہاں بڑے پیمانے پر نہیں ملتا۔ خواجہ صاحب کی نشر کا مزاج محمد حسین آزاد کی نشر سے جو انتہائی مزین اور سنجیلی نشر ہے، بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس طرح جن لوگوں نے خواجہ حسن نظامی اور غالب کی نشر کا ذکر ایک سانس میں کیا ہے، اور کہا ہے کہ بس فرق صرف اتنا ہے کہ غالب کی طنز و ظرافت کی جگہ خواجہ صاحب کے یہاں سوز و گداز نے لے لی ہے، تو یہ بھی کچھ صحیح نہیں، کیونکہ اسلوب شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اور دونوں کی شخصیتوں میں قطبین کا فرق ہے۔ کہاں غالب کی انانیت اور کہاں خواجہ صاحب کی سپردگی! کہاں امارت کی خوبو اور کہاں عوام سے خطاب کی ضرورت۔

مکالمے کے استعمال سے البتہ دھوکا ہو سکتا ہے۔ غالب کے یہاں مکالمے کا استعمال ذاتی وجہ سے
کے اظہار اور ایک نئے ادبی طرز کی طرح ڈالنے کے لیے ہے، جبکہ خواجہ صاحب کے یہاں یہ عوام کے دل
تک پہنچنے کے لیے ہے۔ چنانچہ اس سوال کو بعد میں لیا جائے گا کہ اگر خواجہ حسن نظامی کے اسلوب کا
رشتہ کسی سے ملانا ہی ہے تو اس انداز کی نشر کا جد امجد کون ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی نشر کی ایک نمایاں خوبی اس کی دار فتگی اور سپردگی ہے۔ ان کے بیشتر مضامین
میں ایک مقام پر پہنچ کر مناجات کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سطح پر ان کی نشر کے جوہر کھلتے ہیں۔
ملاوا حدی نے تصدیق کی ہے کہ خواجہ صاحب کو مضامین تین حالتوں میں سو بھتے تھے، گانے یا سماع
میں، تھپیڑ یعنی ڈرامے میں یا کسی آشفتمہ حال عاشق کو دیکھنے سے۔ اس سے غالباً ان کے حساس دل
پر چوڑھی لگتی تھی اور یہی چوڑھی نشر کی تخلیقیت میں اپنی تلہیر کی راہ تلاش کر لیتی تھی۔ ذیل کے اجزا
میں احساس کی محویت ملاحظہ ہو :

” میری بیٹی خوربانو نے پاؤ پارہ قرآن شریف کا صبح سے شام تک یاد کر لیا
// پکانے والی نے آٹا گوندھا تھا // اب روٹی پکا رہی ہے // مگر میں اس کو کعبہ کی
کالی چادریں / مدینہ کے سبز غلاف میں / اجمیر کے صندل میں / دہلی کے نظام الدین
میں / نماز کے سجدے میں / بیوہ کی آہ سرد میں / یتیم کی آہ سرد میں / یتیم کی چشم تر
میں / منظلوم کی مایوسی میں / ظالم کی خود فراموشی میں / ڈھونڈ چکا // ہر دروازہ
کی کنڈی بجا چکا // آنسو بھی بہائے / ہاتھ بھی پھیلائے / لیکن اس کا دامن نصیب
نہ ہوا // میں نیا گرفتار نہیں ہوں // میری اسیری پرانی ہے // مگر اب بھی مجھ کو فریاد
کوئی نہیں آتی // اس کی ناز برداریاں نہیں جانتا // کوئی ہے جو مجھے بتائے کہ میں اسے
کیوں کر پاؤں //“

(کعبے والے خدا کو کیوں کر پاؤں)

” موسیٰ کے زمانہ کا چرواہا ہوتا / تو تجھ کو اپنے گھر بلاتا / پاؤں دباتا / سر دھلاتا /
ٹھنڈا دودھ پلاتا / تو سوتا / تو پنکھا بھلتا / تو سنتا / تو گانا گاتا / روتا رلاتا /
جاتا تو روکتا / پیروں پڑتا / ہاتھ جوڑتا //“

داتا تو کہاں ہے // میرے من کی بتیا کے دیکھن ہار // مولا / مولا / سن / الجھنوں
 میں ہوں / گردنوں میں ہوں // بے قراری دیکھ / آہ دزاری دیکھ / اشکباری دیکھ //
 // آنسو دے / ان میں نہاؤں / سوزش دے / ترپوں / لوٹوں / تجھ کو پاؤں /
 بلال کا دل دے / اور آتاں پر سر کراؤں // عبت تجھ سے ہے / ذلت تجھ سے ہے /
 میرے پر بھو بھگوان // اپنے بھگت کے بس میں آجا / دے جا / دلا جا //

// یہ رات کی نوکری کئے // تو یاد آتا ہے / کلیجہ منہ کو آتا ہے / اپنے داس کو درشن
 دے / روپ دکھا / جلوہ افروز ہو / آنکھ بے ہوش / اور من سنتوش ہو // کس کا بلقان /
 کیسا ایران / تیری رحمت کا چشمہ / اور اس میں اشنان / اس میں ہیں دونوں جہان //
 دین اندھیری / بدلی کالی / رستہ بھاری // دشمن سر پر / غفلت دل میں // ہاتھ پکڑا /
 بھگوان / میں قربان // تجھ کو دیکھوں / اور نہ دیکھوں کوئی / سب ہوں گم / تو کہے گرم //
 شوکت والے / طاقت والے / تو لوپوں اور سنگینوں والے / زخموں اور مرہم والے /
 دکھ کے کرتا سکھ سرورپ / تیرے بھوکے / تیرے پیاسے // یہ ہے اچھا / تو ہو پاس /
 پھول بھی تو / خار بھی تیرا / نور بھی تو / ناز بھی تیری / آنکھیں میری / سب کچھ تیرا / اور زمین
 کے اندر ڈیرا تیرا / بس میں آ بھگوان //

// سر ہے حاضر کھنچے کناری / عشق کی گنی چتا ہماری // مست پکاریں / دست بن جائیں
 / جزو کو تیاگیں / کل ہو جائیں / شیرب پہنچیں / مکہ دکھیں / بیچ سمندر تھنڈا گاڑیں / مہدی
 باپو گونجیں گزھیں / ان کے آگے چل کر رکھیں // تیر چلیں سب سینوں پر / دشمن پھدے
 سنگینوں پر //

(بھگت کے بس میں آ بھگوان)

یہ نثر تخیلی سرشاری کا پتہ دیتی ہے، اس لیے دارتگی کے ساتھ اس کی اہم خوبی اس کا صوتی آہنگ اور
 متوازی کلموں کا غیر ارادی وغیر شعوری استعمال ہے۔ سیمول لوین (SAMUEL LEVIN) نے زبان کے
 ادبی حسن کی ایک پہچان COUPLINGS کے استعمال کو قرار دیا ہے، یعنی ایسے کلموں یا صرئی و نحوئی اجزا کی ہم آہنگی
 یا تکرار جن میں صوتی، صرئی یا نحوی مطابقت ہو۔ خواجہ صاحب کی نثر میں قدم قدم پر اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

علم بلیغ میں صحیح و ترصیح کا تصور پایا جاتا ہے، لیکن دونوں کی بنیاد حروف یا وزن کی محدود اور جامد مطابقت پر ہے، جبکہ COUPLINGS کا تصور اس سے کہیں زیادہ متحرک، وسیع اور جامع ہے اور یہ ہر طرح کی صرفی و نحوی اور صوتی مطابقت اور متوازنیت پر حاوی ہے۔ مثلاً کلمہ اسمیہ کی جگہ اسمیہ خواہ وہ ایک لفظ کا ہو دو کا یا زیادہ کا یا فعلیہ کی جگہ فعلیہ نیز مطابقت صرف حروف کی نہیں، صوتی نظام کی یا پورے اجزائے کلام کی بھی ہو سکتی ہے۔ خواجہ صاحب کے یہاں جگہ جگہ پر یہ چیز فطری طور پر پیدا ہو گئی ہے۔ اور جو اقتباس پیش کیا گیا، اسے اس نظر سے ایک بار پھر ملاحظہ کر لیا جائے۔ دو آڑی لیکروں کے درمیان جتنے کلمے ہیں ان میں باہم دیگر متوازنیت ہے۔ یہ متوازنیت کئی قسم کی ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ صرف ایک نظر دیکھ لینے ہی سے اس کا احساس ہو گا کہ اس نثر کی موسیقیت اور ادبیت میں اس غیر ارادی متوازنیت اور مطابقت کا گہرا ہاتھ ہے۔

ان تمام جملوں میں خطاب کی کیفیت ہے۔ خواجہ صاحب کی تحریروں میں خطاب کہیں خدا سے ہے، کہیں بے جان اشیاء سے اور کہیں ہزاروں لاکھوں ارادت مند انسانوں سے۔ اس نثر میں مکالمے سے کام لینے کا جواز بھی یہی ہے۔ اسلوبیاتی اعتبار سے اسے مکالماتی نثر کا نام دینا نامناسب نہ ہو گا۔ خواجہ حسن نظامی کے مکالماتی اسلوب نے کہیں کہیں بیگماتی زبان سے بھی فیضان حاصل کیا ہے۔ غدر کے افسانے، بیگمات کے آنسو اور مضامین میں موقع و محل کی رعایت سے دہلی کی عورتوں کی زبان اور ڈرامے کی چمک دکھی جاسکتی ہے:

”یہ غریب نہیں، بڑی قسطا مہ ہے۔ میں نے آواز دی کہ درانچے کو سلا دے
تو کانوں میں بول مار کر چپ ہو گئی اور سنی ان سنی کر دی“

_____ بیگمات کے آنسو

”تہو رخاں کی بیوی آخر کا فقرہ سن کر جل کر کباب ہو گئیں اور دانت پس کر
بولیں، اللہ اللہ اس بٹی کی سی آنکھوں والی کو یہ دن لگے۔ اگر اس کی چوٹی پکڑ کر بھری
مخفل میں جوتیاں لگوائیں تو میرا نام پٹ کر رکھ دینا۔“

_____ اولاد کی شادی

”کیا اس کی میا مرقی ہے یا کانوں سے بھری ہے جو بچے کے بلکنے کی اسے خبر نہیں

ہوتی یا قصائی ہے کہ ننھی سی جان کو بھڑکار رکھا ہے۔“

سیوی کی تعلیم

اس نثر کی ایک اور خوبی اس کا پراکرتی احساس ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے کئی مضامین کے عنوانات یوں ہیں ”ہردواری گنگا کے کنارے“، ”چندامن سورتی“، ”رس کے بھرے تورنے میں“، ”ہم ہیں بالک ایک پتا کے“، ”بھگت کے بس میں آبھگوان“، ”پردیسی پتیم دکھی تہاری پریت“، ”گیان کتھا“، ”شملہ کی دیہی ماما“، ”من کہ ایک دھوبی کاغذی گھاٹ پر“، ”رام آپدیش“، ”ایکو برہم دو تیوناستی“۔ لیکن ان عنوانات سے یہ قیاس نہیں ہونا چاہیے کہ خواجہ حسن نظامی کی پراکرتیت صرف انھیں مضامین تک محدود ہے۔ یہ چونکہ ان کے تخلیقی مزاج کا حصہ ہے، اس کی جھلک ہر جگہ دیکھی جاسکتی ہے، اور اس کا معنوی اور اسلوبیاتی رشتہ لوک ساہتیہ کی اس عظیم روایت سے مل جاتا ہے جو صوفیہ حضرات کی عوامی دستگی کے طور پر ہردو میں کم و بیش موجود رہی ہے۔ ہندوستانی ادبیات اور یہاں کے لوک ساہتیہ میں صوفیہ کا جو بیش بہا حصہ ہے، وہ دھرتی کے اسی احساس کی ترجمانی کرتا ہے۔ اسی روایت کا ایک سرا عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سنگیت سے اور دوسرا ادبیات سے جڑا ہوا ہے۔ کہیں یہ احساس راگ راگینوں میں ڈھل کر ابھرتا ہے، اور کہیں یہ بولیوں، ٹھمریوں، دادرے و سپلیو اور سیندت کے بول بن کر کانوں میں رس گھولتا ہے۔ قدیم صوفیہ حضرات سے ہندوی کے جو کلمات، اجزایا ریختہ غزلیں منسوب ہیں۔ وہ بھی اسی کیفیت کی تصدیق کرتی ہیں کہ صوفیہ کا رشتہ ہندوستانی زبان کی لوک روایت یعنی عوامی روایت سے کبھی منقطع نہیں ہوا۔ حضرت بابا فرید گنج شکر ہوں یا حمید الدین ناگوری، شرف الدین برعلی قلندر ہوں، نظام الدین اولیا، مولیٰ یا برہان الدین غریب، بندہ نواز گیسو دراز یا بہاؤ الدین باجن، ہندوستانی زبان کے لوک ساہتیہ کے اولین نقوش انھیں حضرات کے یہاں ملتے ہیں۔ امیر خسرو اسی روایت کی نہایت روشن تصویر پیش کرتے ہیں۔ امیر خسرو کو اگر اس کا نقطہ آغاز تسلیم کیا جائے تو خواجہ حسن نظامی اس کا نقطہ ارتقا ہیں۔ آج سے پچھ سات سو سال پہلے کی بات اور تھی۔ اس وقت زبان نا پختہ اور ان گھڑ تھی، اور صوفیہ حضرات عوام سے خطاب کرنے کے لیے ملی جلی زبان کو اختیار کرنے پر مجبور تھے، لیکن بیسویں صدی میں جب زبان کے معیار اور اسالیب ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکے ہیں، یہ غور طلب ہے کہ خواجہ صاحب کو معیاری زبان میں بولی ٹھولی کی آمیزش کی کیا ضرورت تھی۔ بات دراصل اردو کے عوامی مزاج کی، اس کے نسلی

تقاضوں کی اور اپنی دھرتی پر سپر رکھنے کی یعنی لاکھوں کر دروں لوگوں سے ان کے شعوری اور غیر شعوری احساسات کی سطح پر ان سے ہم کلام ہونے کی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی نشر سے ظاہر ہے کہ ان کو عوامی تقاضوں کی ارضیت کے اس راز کا عرفان تھا۔ ان کی تحریر میں اکثر جگہ ان کا پراکرتی احساس بے تابانہ ابھر کر سامنے آتا ہے اور پھر پورے کے پورے اجزا اسی کیفیت میں ہو جاتے ہیں۔ ہم نے شروع میں کہا تھا کہ خواجہ حسن نظامی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے روحانی اور اخلاقی مسائل کو مذہب یا تصوف کے دائرے سے نکال کر ادب میں داخل کیا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ادبیت کو پراکرتی احساس سے جلا دی، اور اس کا رشتہ لوک ساہتیہ کی صدیوں پرانی اس تاریخی روایت سے جوڑ دیا جس کی کارفرمائی قدیم صوفیہ کے یہاں ملتی ہے، اور جس نے تصوف اور بھگتی تحریک دونوں سے فیضان حاصل کیا تھا۔ خواجہ حسن نظامی کو ان کی ارضیت اور پراکرتی احساس کی بنا پر اگر اردو نشر کا نظیر اکبر آبادی کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ دونوں رسمیات سے بالاتر تھے دونوں کی زندگی بے لوث اور بے ریا تھی، دونوں عوام کے لیے لکھتے تھے، دونوں کی ترغیب ذہنی کا تعلق عوام کے تقاضوں سے تھا اور دونوں کی طاقت اور تخلیقیت کا راز ان کی عوامی وابستگی میں پوشیدہ ہے۔ دونوں نے اسی اصناف کو اپنا یا جن کا اس وقت زیادہ رواج نہیں تھا یعنی نظیر نے نظم کے مختلف سانچوں کو اور خواجہ حسن نظامی نے مضمون نگاری کو، اور دونوں نے اپنی تخلیقی اور سانی غذا معمولی آدمی سے اور دھرتی کے سینے سے حاصل کی۔

لوک روایت سے صوفیہ کی وابستگی میں اور خواجہ حسن نظامی کی وابستگی میں ایک ہلکا سا فرق ہے۔ وہ یہ کہ جن صوفیہ کے یہاں کرشن جی اور دوسرے ہندوستانی اساطیر و علامہ کا ذکر ملتا ہے، وہاں اکثر و بیشتر ہندوستانی احساس اور اسلامی احساس کی دو الگ الگ سطحیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس خواجہ حسن نظامی کے یہاں یہ دونوں سطحیں گھل مل کر ایک ہو گئی ہیں، اور ان کی تخلیقیت ایک طرح کے رموز و علامہ سے دوسری طرح کے مضامین کو شدت تاثر اور دل کو چھو لینے والی کیفیت کے ساتھ ادا کرنے پر قادر ہو جاتی ہے۔ اساطیری اور تاریخی رموز و علامہ کا ہندی اختلاف، نیز معنوی توسیع پسندی اور ہم آہنگی اتنے بڑے پیمانے پر اردو نشر میں کہیں اور دکھائی نہیں دیتی۔ اس طرح خواجہ حسن نظامی نے ان رموز و علامہ کو جن کا تعلق دھرتی کے رشتوں اور نسلی تقاضوں سے ہے، ایک نئی معنوی جہت عطا کی ہے جو بجائے خود ایک تخلیقی نشان رکھتی ہے۔ بعض مضامین پورے کے پورے اس رنگ

میں ہیں۔ بعض کو وہ ایک رنگ میں شروع کرتے ہیں، پھر دوسری کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور بالآخر دونوں کیفیتیں گھل مل کر ایک مخلوق کیفیت کو راہ دیتی ہیں مثلاً "مست الست کی دعا" یوں شروع ہوتی ہے:

"بجلی میں چمکنے والے، چاند میں جھلکنے والے، رات کے اندھیرے

سورج کی روشنی، آسمان کی بلندی، دریا کی روانی، جنگل کی سنسناتی دلگیری

و دل داری کے مالک عرش کی اقامت میں جہد، دل کے گھر ارض میں خدا

ہم تیرے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ اگر تُو عرش پر ہے تو ہم کو سر بلند کر

فرش میں ہے تو وسعت و ثابت قدمی عطا فرما۔ اگر تُو گھر جگد ہے تو

ہم کو بھی گھر جگد پہنچا۔"

عین اس کے بعد یہ دوسری کیفیت ابھرتی ہے:

"ہے پر جھوپڑ شوم، پر آتما، اگر تو نرگن ہے تو ہم کو سوگن بنا دے۔

نرا کار ہے تو ہماری شکلیں بھی مٹا دے، سگن بن جا، ساکار ہو جا اور اپنی

پریم شکتی کو دنیا میں پرکٹ کر، ہم کیسے سے فریاد کریں۔ تیرے سوا کیسے کو

دیکھیں۔ ارے مکڑ کے سیاہ پوش مکان پر نظر خاص رکھنے والے ...

ارے ہر دوار کے دو ارے رہنے والے ہم یقین دلاتے ہیں کہ تو ہی ہے

اور کوئی نہیں۔ تو نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اور جو کچھ ہے، کچھ بھی نہیں

تو ہی تو ہے اور بس۔"

اسی طرح ایک مضمون جو "منظر فراق" یعنی وفات الرسول کے بارے میں ہے، یوں شروع

ہوتا ہے:

"پتی کے ستی بی بی عائشہ کی افسردگی دیکھی نہیں جاتی۔ ست پتی کی

جائی ست پتی کی من موہنی، برج کائنات کے سب سے بڑے شام

سند رکی منظور نظر، صیدیق کی گود میں پلنے والی، کیسی ادا، نڈھال

سر رسول کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ آج اس کی راجد ہانی اس کے

ہاتھوں سے چھن رہی ہے۔ آج اس کا دھنی دنیا سے مندا موڑ رہا ہے۔"

” اچھی بابل کیا لاڈلی بیٹی کو بھول گئے“ ایک خط کے پیرائے میں لکھا گیا ہے جس میں اُمت کی سُسرال کی طرف سے مدنی میکے سے خطاب کیا گیا ہے۔ سارا مضمون زمینی احساس کی تقلیب اور توسیع پر مبنی ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں :

” ہائے بابل وہ دن یاد آتا ہے جب میں آپ کی انگنائی میں کھیلتی پھرتی تھی اور آپ مجھ کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے تھے۔ میں بگاڑتی تھی۔ آپ سنوارتے تھے۔ میں روتی تھی آپ آنسو پوچھتے تھے۔ میں فصد کرتی تھی آپ ناز برداری کرتے تھے۔ میری فکر میں اپنے رات کو سونا چھوڑ دیا تھا۔ سات سات دن فاقے جس کے لیے ہوتے تھے، وہ یہی چھوٹی قسمت کی کینز ہے۔“

اچھی بابل میرا بیاہ رچا دو، اچھی بابل مجھے مہندی لگا دو، اچھی بابل میرا منڈھا۔
چھوڑ دو، سب پریتوں کے بانس کٹواؤ، سب باغوں کے پھول پتے منگواؤ، مجھے سہاگ کی چوڑیاں پہناؤ، اپنی لاڈلی کو بھول نہ جاؤ۔ وہ تم ہی پر آسرا رکھتی ہے۔“

” مدنی شام سُندر کی مرلی“ میں بھی خواجہ حسن نظامی کے اس اسلوبیاتی اختلاط کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے :

// زلفوں والے پیتم پیارے / یثرب باسی / مومن کنہیا کی بانسری کے بلہاری /
حجازی پریت میں کھڑے ہو کر ایسی بجائی / کہ جنم جنم کے دکھ کلیش دور ہو گئے // روح، آتما،
بیو، شریر، سب کو سرشار و پر کیف بنا دیا //

// مگر اب زمانہ گزر گیا / راتیں بیت گئیں / شام سُندر کی مرلی کی آواز سنائی
نہیں دیتی // جنگل کے ہرن / باغوں کے مور / آم کی ٹہنی / سب اس پیاری اور سرلی صدا
کی راہ دیکھ رہے ہیں / جس کی کوک کلیجہ میں ہوک پیدا کرتی ہے // برسات کا موسم قریب آیا //
کالی گھٹائیں منڈا منڈا کر آئیں گی اور کرشن کنھیا کی بانسری کو ڈھونڈیں گی // کوئی چا تر سمجھ دار
سکھی سہیلی ایسی نہیں جو شام سُندر کو سندھیالے جائے //

یہ مضمون یوں ختم ہوتا ہے :

// آہا // وہ دیکھو // شامِ شندرمرلی لیے بن سے نکلے / وہ ہمارے سیتا پتی تیر
 کمان سنبھالے نمودار ہوئے // اب کوئی دم میں مرلیا باجے گی / اور نین کی بدلی
 برسے گی // ندی نالے سوکھے تھے / گنگا جمنایا سی تھیں / گھٹ کے تیر لہے سونے
 تھے // بھگتی کا تھا کال پڑا / ست کے گلے جنجال پڑا //
 // اب مرگ کی ترشنا دور ہوئی / اور چنتا من کا فور ہوئی // اب ہر کی آمد آمد ہے /
 اب ہر کی آمد آمد ہے // سنسار کا دانا آتا ہے / اور ہر کا جھنڈا لاتا ہے / بانس کی مرنی
 صو رہے یہ / اور پتک کا مسطور ہے یہ //

اس اقتباس میں اور اس سے پہلے جو اجزا پیش کیے گئے، ان میں اس صوفی دنیوی
 و صوفی مطابقت و متوازنیت کی بھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا
 ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر کے اس مطالعے کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک منفرد اسلوب
 اور طرزِ خاص کے مالک تھے جس میں دہلوی زبان کا چٹخارہ اور روزمرے اور محاورے کا لطف،
 سادگی اور سلاست، بانگین و شگفتگی اور تے بکلفی و بے ساختگی کی جملہ خوبیاں تو تھیں ہی، لیکن
 ان کا کارنامہ یہ ہے کہ جہاں انھوں نے خشک تدرہبی اور اصلاحی مباحث کو تصوف کے دائرے سے
 نکال کر ادب میں داخل کیا، وہاں ان کا رشتہ ہندوستانی لوک ساہتیہ کی پراکرتی روایت
 سے بھی جوڑ دیا۔ اس رنگ کی تقلید کی کوشش بیسیوں نے کی لیکن کوئی اسے پانہ سکا۔ خواجہ
 حسن نظامی کی نثر کا نسب نامہ محمد حسین آزاد یا غالب سے ملانا مناسب نہیں، البتہ اگر اس
 کا رشتہ ملانا ہی ہے تو اس کا سراغ اس سے بھی پہلے کے زمانے میں لگانا چاہیے۔ چنانچہ
 زمینی احساس کی اس نثر کا اگر کوئی جہدِ مجدد ہو سکتا ہے تو وہ میرامن دہلوی ہیں۔ دونوں
 کے یہاں دھرتی کی بُو باس ہے۔ دونوں کے یہاں دہلوی زبان بغیر کسی تصنع کے سامنے آتی
 ہے۔ دونوں کے یہاں سارا زور لطف و تاثیر پر ہے۔ دونوں کی عبارت میں بولی کھولی،
 کہاوتوں اور دوہوں کے اجزا تحلیل ہو گئے ہیں، اور اس طرح میرامن کے زمینی احساس
 کی دین کا رشتہ خواجہ حسن نظامی کی ارضیت سے مل جاتا ہے۔ دہلوی اردو کو سنوارنے،

نکھارنے اور اس کے سبجل رُوپ کو پیش کرنے والوں کا جب جب نام لیا جائے گا،
خواجہ حسن نظامی کا ذکر احترام سے کیا جائے گا۔

(۱۹۷۶)

ذکر صاحب کی نثر: اردو کے بنیادی اسلوب کی ایک مثال

ڈاکٹر ذاکر حسین کی تربیت اقتصادیات میں ہوئی تھی، لیکن ان کا دل قومی کارکن کا اور ذہن ادیب کا تھا۔ ماہرِ تعلیم ہونا یا ادیب بننا ان کی زندگی کا کبھی مقصد نہیں رہا، لیکن جس طرح ان کی قومی لگن نے انہیں معلم سے ماہرِ تعلیم بنا دیا، اسی طرح ان کی تخلیقی صلاحیت اور شائستگی متانت نے ان کی ہر بات میں ادبیت کی شان پیدا کر دی۔ ان کی قومی اور تعلیمی خدمات نے انہیں اردو میں زیادہ نہیں لکھنے دیا، لیکن جتنا کچھ بھی انہوں نے لکھا، اُس کی مدد سے ان کے اسلوب کے بارے میں رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

اردو کا بنیادی اسلوب کیا ہے؟ اس سلسلے میں رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں سرسید کے بعد حالی، عبدالحق اور ڈاکٹر سید عابد حسین کی نثر پر بجا طور پر زور دیا ہے۔ ان مصنفین کے ہاں اردو کے لسانی جینیس (GENIUS) سے آگہی اور اس سے انصاف کی کوشش ملتی ہے۔ اردو ایک انتہائی متنوع اور متمول زبان ہے۔ اس کی بنیاد ہند آریائی ہے، لیکن اس میں سامی، ایرانی اور دراوڑی لسانی خاندانوں کے عناصر بھی برسرِ کار نظر آتے ہیں۔ صوتیات اور لفظیات کی سطح پر لسانی اثرات کی کئی مختلف الاصل پرتیں ایک ساتھ کام کرتی ہیں، اسی طرح جملوں کی ترتیب و تہذیب کے بھی اس میں کئی رنگ ملتے ہیں۔ اردو کی اس رنگارنگی اور تنوع کا مطالعہ اگر اس کی سات آٹھ صدیوں

کی تاریخ کے پس منظر میں کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شروع ہی سے اس میں اسالیب کے دو دھارے ایک دوسرے کے متوازی بہتے رہے ہیں، اور اردو کے لسانی جینیس کی تشکیل میں مدد دیتے رہے ہیں۔ اتنی بات واضح ہے کہ ہندستان کی تاریخ میں اردو ایک عجیب و غریب مفاہمے کا نام ہے۔ یہ مفاہمہ دو عظیم ایشیائی تہذیبوں اور دو اہم لسانی گروہوں کے درمیان ہوا تھا۔ اس لحاظ سے اردو نام ہے ایک تہذیبی اور لسانی توازن کا جو ایک طرف ہند آریائی اور دوسری طرف سامی و ایرانی عناصر کے درمیان صورت پذیر ہوا۔ اگر اس توازن کو ایک طرح کی ”قدر“ تسلیم کیا جائے (جو یہ یقیناً ہے) تو ماننا پڑے گا کہ جس طرح کوئی اخلاقی قدر کسی شخصیت میں یا کوئی تہذیبی قدر کسی دور میں اپنی سو فی صد مکمل حالت میں نہیں ملتی، بلکہ کوئی شخصیت یا عہد اس کی تکمیل کی کوشش ہی میں اپنی کامیابی کی حد تک اس سے منسوب کیا جاتا ہے، اسی طرح اردو کے کسی ایک اسلوب کو بھی اردو کے لسانی توازن کی مکمل شکل کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ کسی بھی قدر کی طرح اردو کا لسانی توازن بھی ایک ”نصوّر محض“ ہے، جس کا سو فی صد حصول نامکمل اجمل ہے۔ البتہ جو اسلوب اس توازن کو پالینے اور اس کے فطری ربط و تناسب اور خوش آہنگی سے انصاف کرنے میں جس حد تک کامیاب رہا ہے، اسی حد تک اسے اردو کے بنیادی اسلوب سے قریب تر قرار دیا جائے گا۔ اردو کی کئی صدیوں کی تاریخ شاہد ہے کہ اس توازن کو پانے اور اس سے انحراف کرنے کی کوششیں ہر دور میں جاری رہی ہیں، اور ان دونوں میں عمل اور ردِ عمل کا وہ سلسلہ بھی موجود رہا ہے جس سے زندہ زبانوں کے ارتقا میں مدد ملتی ہے۔ اردو میں لسانی امتزاج و توازن کی تلاش اور اس سے انحراف کی انہیں کوششوں کو اوپر ہم نے اردو اسالیب کے دو بنیادی دھاروں سے تعبیر کیا ہے جو ہر دور میں ایک دوسرے کے متوازی بہتے رہے ہیں۔ ادبی معنویت سے قطع نظر محض لسانی مزاج کے اعتبار سے گویا لگ بھگ ہر زمانہ میں جہاں ایک مرزا محمد رفیع سودا رہا ہے، وہاں ایک میر تقی میر بھی رہا ہے۔ اسی طرح ایک میر عطا خاں تحسین کے بعد ایک میر امن، ایک ناسخ کے دور میں ایک آتش، ایک شاہ نصیر کے بعد ایک ذوق، ایک رجب علی بیگ سرور کے زمانے میں ایک غالب، ایک محمد حسین آزاد کے ساتھ ایک حالی اور ایک ابوالکلام آزاد کے ساتھ ایک مولوی عبدالرحمن کی موجودگی اردو اسالیب کے انہیں دور جحانات کی تصدیق کرتی ہے۔ ایک لسانی دھارا عربی فارسی عناصر کی طرف جھکنے اور ان کی مدد سے زبان میں پڑسکواہ اور غیر عام فہم الفاظ و تراکیب کے استعمال

کا ہے۔ دوسرا ملکی اور غیر ملکی لسانی عناصر میں ایک خوشگوار توازن کو پانے کی جستجو کا اور زبان کے ٹھیک ٹھاک کو نباہنے کا ہے۔ ظاہر ہے اگرچہ پہلے دھارے کو اردو کے لسانی جینیس سے ہٹا ہوا کہا جائے گا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ اس کے منافی بھی نہیں۔ اس لیے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے اور اس میں تازگی اور تہنید یعنی لسانی رد و قبول کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ پہلے لسانی گروہ کے ادیب و شاعر اگرچہ فارسی زدگی مشکل پسندی اور بوجھل ترکیبوں کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن جس حد تک ان کی تخلیقی صلاحیت کسی لسانی عنصر کو قبول عام کے درجہ تک پہنچانے میں مدد کرتی ہے، اس حد تک زبان کو ان سے فائدہ پہنچتا ہے۔ دوسرے لسانی گروہ کے لکھنے والے زیادہ تر ان عناصر کو لیتے ہیں جو زبان میں رچ بس چکے ہیں یا جنہیں چلن یا استعمال عام نے قبولیت کے درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ یہ لوگ لفظوں کی آرائش یا زبان کے ظاہری شکوہ پر توجہ صرف نہیں کرتے۔ اس کے بجائے زبان کی امتزاجی کیفیت پر نظر رکھتے ہیں اور اس کے پوشیدہ امکانات کو بروئے کار لاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس گروہ کے لکھنے والوں کے اسلوب کو اردو کے بنیادی اسلوب سے قریب تر سمجھا جائے گا۔

ذکر صاحب کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔ اس کا سلسلہ جدید دور میں سرسید، حالی اور مولوی عبدالحق سے ہوتا ہوا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بعض کارکنوں تک پہنچا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کارکنوں سے ہماری مراد ذکر صاحب کے علاوہ ڈاکٹر سید عابد حسین اور محمد مجیب ہے، بلکہ خواجہ غلام السیدین کو بھی اسی صف میں شریک سمجھنا چاہیے۔ اگرچہ جامعہ سے سیدین صاحب کا وہ منصبی تعلق نہیں رہا جو دوسروں کا رہا ہے، لیکن خیالات اور خدمات کے اعتبار سے وہ بھی اسی گروہ کے ساتھ جگہ پائیں گے۔ ان چاروں نے انگریزی کے علاوہ اردو کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اگرچہ ایک کا خصوصی مضمون اقتصادیات، دوسرے کا فلسفہ، تیسرے کا تاریخ اور چوتھے کا تعلیم رہا ہے، لیکن بنیادی طور پر چاروں معلم ہیں۔ چاروں نے تعلیم ہی کے ذریعے ملکی اور قومی خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ چاروں نے اس سلسلے میں "نیشنلسٹ نظریہ" کو اپنایا۔ چاروں نے کچھ اپنی افتاد ذہنی کی وجہ سے، کچھ قومی خدمت کی ضرورتوں کے پیش نظر، اور کچھ گاندھی جی کے خیالات کے نتیجے کے طور پر انتہائی دل نشین پیرایہ بیان اختیار کیا اور دل کی بات دل تک پہنچانے کے لیے نسبتاً عام فہم اور آسان اسلوب کو اپنایا۔ چاروں نے تخلیقی نثر کے نمونے بھی پیش کیے۔ (مجیب صاحب اور عابد صاحب

نے ڈرامے اور انشائیے، سیدین صاحب نے شخصی خاکے اور ذاکر صاحب نے کہانیاں بھی لکھیں، لیکن اصلاً چاروں نے اردو نثر کو علمی کاموں کے لیے استعمال کیا۔ چاروں کے انفرادی اسالیب کی ذیلی خصوصیات ان کے موضوع کی رعایت سے الگ الگ ہیں، لیکن چاروں کا اصل کارنامہ جس کی بدولت انھیں اردو نثر کی تاریخ میں الگ سے پہچانا جائے گا اور جس کی وجہ سے انھیں جدید اردو نثر کے ”عناصرِ اربعہ“ کہا جاسکتا ہے، یہ ہے کہ اس دور میں انھوں نے اردو کی علمی نثر کے دامن کو وسیع کیا اور ایسے اسلوب کی مثالیں پیش کیں، جو اردو کے بنیادی اسلوب سے نہایت قریب ہے۔

۲

ترسیل کے نقطہ نظر سے نثر نگار تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنھیں مخاطب یاد رہے یا نہ رہے، اپنی ذات ضرور یاد رہتی ہے، دوسرے وہ جنھیں اپنی ذات یاد رہے یا نہ رہے، مخاطب ضرور یاد رہتا ہے، اور تیسرے وہ جنھیں نہ اپنی ذات کا پتہ ہوتا ہے نہ مخاطب کا۔ ذاکر صاحب کی نثر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو نہیں بھولتے۔ ان کی نثر میں ان کی ذات کچھ اس طرح سے گم ہے کہ مخاطب ہی مخاطب نظر آتا ہے۔ یہ خوبی ہر جگہ چاندنی کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور ان کی تحریر کی تاثیر اور دل نشینی میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ مخاطب سے براہ راست باتیں کرتے ہیں۔ گفتگو کا یہ انداز ان کے اسلوب کی جان ہے۔

محمد مجیب نے تعلیمی خطبات کے پیش لفظ میں صحیح لکھا ہے:

”ان خطبات میں انداز تقریر کا ہے، تحریر کا نہیں۔ ان میں کوشش کی گئی ہے کہ ... آپ سے براہ راست بات کہی جائے۔“

(ص ۷، ۸)

یہاں ذاکر صاحب کے اسلوب کے تجزیہ کے لیے مندرجہ ذیل اقتباسات کو استعمال کیا جائے گا:

(۱)

اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں، اگر ہم انسانیت کی ایسی معاشی

تنظیم چاہتے ہیں جس میں امیر و غریب کا فرق انسانوں کی اکثریت کو انسانیت کے شرف ہی سے محروم نہ کر دے، اگر ہم دولت کی شرافت کی جگہ تقویٰ کی شرافت کا قیام چاہتے ہیں، اگر ہم نسل اور رنگ کے تعصبات کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں، تو ان سب فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے خود اپنے پیارے وطن میں ہے جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں اور جس کی مٹی میں ہم پھر واپس جائیں گے چنانچہ ہمارے نئے مدرسوں کی تعلیم نوجوانوں کے دل میں جماعتی خدمت کی وہ لگن لگائے گی کہ جب تک ان کے ارد گرد ان کے اپنے گھر میں غلامی رہے گی اور افلاس، فلاکت رہے گی، اور جہل، بیماریاں رہیں گی اور بد کرداریاں، پست حوصلگیاں رہیں گی اور مایوسیاں، یہ چین کی نیند نہ سوتیں گے، اور اپنے بس بھر ان کو دور کرنے میں اپنا تن من دھن سب کھپائیں گے، یہ روٹی بھی کمائیں گے اور نوکریاں بھی کریں گے، پر ان کی نوکری خالی پیٹ کی چاکری نہ ہوگی بلکہ اپنے دین کی اور وطن کی خدمت ہوگی جس سے ان کے پیٹ کی آگ ہی نہیں بجھے گی، دل اور روح کی کلی بھی کھلے گی۔ یہ اپنے دینی نصب العین ہی کی وجہ سے اپنے دین کی کہ کبھی دنیا سے جنت نشاں کہتی تھی، پر جو آج بے شمار انسانوں کے لیے دوزخ سے کم نہیں، سیوا کریں گے، اور ایسا بنائیں گے کہ پھر اس کے بھوکے، بیمار، بے کس، بے امید غلام باسیوں کے سامنے انھیں اپنے رحمن و رحیم، رزاق و کریم، حی و قیوم خدا کا نام لینے وقت شرم سے سر نہ جھکانا پڑے گا کہ انھیں بعض کی زیادتیوں اور بعض کی کوتاہیوں نے بعض کے ظلم اور بعض کی غفلت نے آج اس حال کو پہنچا دیا ہے کہ ان کا وجود محدود و ننگا ہوں کو اس کی شانِ ربوبیت پر ایک دھبہ سا معلوم ہوتا ہے۔

(تعلیمی خطبات ص ۵۳-۵۵)

(ب)

... یہ نصب العین یہ تھا کہ اس ملک کے مسلمانوں میں اعلیٰ اور متوسط طبقے کے افراد کی جتنی تعداد اپنا پیٹ پال لے، سرکاری نوکریاں پا کر آرام، چین، اور ہاں تھوڑی سی،

حکومت کے ساتھ زندگی کے دن کاٹنے کے قابل ہو جائے، اچھا ہے۔ یہ چند افراد اپنی خوش حالی کا معیار جس قدر بڑھالیں اتنی ہی قوم خوش حال سمجھی جائے، اس راہ میں جو رکاوٹیں ہوں وہ ہر طرح کم کی جائیں، مستقبل کے مشتبہ منصوبوں سے حال کی یقینی بہرہ مندیوں میں حرج نہ ہو اور قومی آخرت کا تصور انفرادی دنیا کے عیش میں خلل نہ ڈالنے پائے۔ معاشرت بدلی جائے، اپنی پرانی معاشرت بُری ہے اور بُری اس لیے ہے کہ ایک با اقبال صاحب اقتدار قوم کی معاشرت سے مختلف ہے۔ سیاست سے بے تعلقی رکھی جائے۔ اس لیے کہ انفرادی ترقی و ترفع کے لیے اپنی جماعت کے سیاسی اقتدار کی ضرورت کچھ بہت واضح نہ تھی۔ حکومت کی جو شکل بھی ہو، بس وہ امن قائم رکھ سکے، محکموں کے معاملات باہمی میں انصاف کر سکے، نوکریاں دے، چند افراد کو مراتب بلند تک پہنچائے کہ اس کا کام نکلے اور ہماری عزت بڑھے۔ مذہب، کہ صدیوں اس جماعت کی زندگی کا مرکزہ چکا تھا، چھوٹا تو کیسے، ضرور قائم رکھا جائے، مگر اس طرح کہ دوسرے ارادوں میں بھی مانع نہ ہو، اور ترقی کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔ معاملات پر کہ اہل دنیا سے متعلق ہیں، اس کی تعلیمات اور ان کی حکمتوں کو زیادہ نہ ابھارا جائے، چپ چپاتے دوسرے زیادہ ترقی یافتہ اہل دنیا کے اسالیب عمل کو اختیار کر لیا جائے“

(تعلیمی خطبات ص ۳۹، ۴۰)

(ج)

”لیکن اس کے مقابلے میں ایک دوسرا خیال بھی ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ وہی زیادہ صحیح بھی ہے، یعنی یہ کہ اصلی چیز اور ابتدائی چیز سماج ہے اور اکیلا آدمی، فرد اس کے سہارے اور اسی کے لیے ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ سماج کی حیثیت جسم کی ہے اور اکیلا آدمی یا چھوٹے چھوٹے سماجی گروہ اس جسم کے حصے ہوتے ہیں۔ جسم کے حصوں کو جسم سے اور پتھروں کے ڈھیر کو پتھروں سے جو تعلق ہے اس کا فرق ظاہر ہے۔ اس خیال کے مطابق میں سمجھتا ہوں کہ ذہنی زندگی تو بغیر سماج کے ممکن ہی نہیں۔ اکیلا آدمی بطور جانور کے سمجھ

میں آسکتا ہے، مگر پورے انسان کی حیثیت سے، جس کی امتیازی خصوصیت ذہن ہے، اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ذہنی زندگی تو کسی ذہنی زندگی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ چراغ ہمیشہ کسی دوسرے چراغ ہی سے جلایا جاسکتا ہے۔ ذہنی زندگی کے لیے جو اصلی معنوں میں انسانی زندگی ہے، سماج کا وجود لازمی ہے، مگر اس حد تک کہ وہ کل جسم سے وابستہ ہے اور اس کے اندر اپنی خدمت انجام دے رہا ہے۔ ایک حصے کے کٹ جانے سے جسم میں کمی آجاتی ہے، مگر وہ باقی رہ سکتا ہے، مگر حصہ جسم سے الگ ہو کر باقی بھی نہیں رہ سکتا۔ درخت میں ہر ڈالی اور پتی بھی اپنا الگ وجود رکھتی ہے، لیکن ڈالی یا پتی کے ٹوٹ جانے سے درخت ختم نہیں ہوتا، درخت سے الگ ہو کر ڈالی اور پتی کے لیے سوائے فنا کے اور کچھ نہیں۔“

(تعلیمی خطبات ص ۱۳، ۱۴)

(۵)

”تعلیمی نظام ہمارے ہاتھ میں ہو تو اس وقت بھی کیا مدرسے صرف کتابیں پڑھا دینے کے لیے قائم ہوا کریں گے اور ان کا مقصد بھی تندرست اچھے سچے آدمی پیدا کرنے کی جگہ چلتے پھرتے کتب خانے پیدا کرنا ہوگا؟ کیا اس وقت بھی بچوں کی قدرتی صلاحیتوں کا خیال کیے بغیر سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکا جایا کرے گا اور اس طرح قوم کی ذہنی قوت کو، کہ اس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، برباد کیا جائے گا؟ یا مختلف صلاحیت والوں کے لیے مختلف قسم کے مدرسے ہوں گے جن میں ابتدائی تعلیم کے بعد سچے سچے بھیجے جاسکیں گے اور اپنے خاص رجحان ذہنی کے مطابق تعلیم پائیں گے۔ کیا اس وقت بھی مدرسے اور قوم کی زندگی میں اتنا ہی کم تعلق ہوگا جیسا کہ اس وقت ہے، یا بچپن ہی سے ایسے موقعے بھی ملا کریں گے جن سے ہر ہندوستانی کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ قوم کی سیوا کر کے ہی وہ اپنی ترقی کی راہ نکال سکتا ہے؟ کیا اس وقت بھی ہمارے مدرسے خود غرضی اور شخصی مقابلے ہی کے عملی سبق دیا کریں گے اور دوسروں کی خدمت اور مدد کے موقعے ان میں ناپید ہوں گے؟ کیا اس وقت بھی مدرسوں کو بس اس سے

سروکار ہوگا کہ علم سکھا دیا لیکن علم کے برتنے اور سیرت پر اثر انداز ہونے کا کوئی سامان نہ ہوگا۔“

(تعلیمی خطبات، ص ۲۴)

اس تحریر میں وہ کیا چیز ہے جو ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے؟ جن مسائل کا ذکر ہے وہ علمی اور ملکی اور قومی نوعیت کے ہیں، لیکن نثر بوجھل نہیں۔ لکھنے والے کی ذات الفاظ کے پیچھے چھپی ہوئی ہے، لیکن اس کی کشش ہر جگہ محسوس ہوتی ہے۔ زبان علمی ہے، لیکن انداز خشک کتاب کا سا نہیں۔

اقتباس (الف) میں جملوں کے دروبست اور افعال کے استعمال کو دیکھیے۔ پہلے جملے کے چار کلمے جو ”اگر“ سے شروع ہوئے ہیں اور حال پر ختم ہوئے ہیں، فوراً توجہ کو گرفت میں لے لیتے ہیں۔ حال کا یہ صیغہ بعد کے دو کلموں میں بھی جاری رہا ہے۔ اس کے بعد ”چنانچہ“ سے فعل کے استعمال کا رخ مستقبل میں بدل گیا ہے اور آخر تک یہی رہا ہے۔ حال اور مستقبل کے یہ صیغے اردو فعل کی سادہ ترین شکلوں میں سے ہیں۔ اقتباس (ب) میں بنیادی خیال یعنی ”نصب العین“ کی وضاحت کے لیے شروع میں مضارع ”پیٹ پال لے“ ”قابل ہو جائے“ استعمال ہوئے ہیں۔ اب پورے پیراگراف میں افعال کو دیکھتے جاتیے، معلوم ہوگا کہ مضارع کے استعمال کی جو فضا پہلے جملے میں تیار ہو گئی تھی، وہ پورے پیراگراف میں برقرار رکھی گئی ہے۔ یہی عالم اقتباس (ج) اور (د) کا ہے۔ اقتباس (د) کی فعلیہ فضا استفہامیہ ہے، اور جہاں تک بنیادی معنوی نکتے کی وضاحت کی ضرورت تھی، فعل کا استعمال استفہامیہ انداز سے ہوا ہے۔ اقتباس (ج) میں بھی شروع سے آخر تک فعل کا سادہ صیغہ یعنی حال استعمال ہوا ہے۔

ذکر صاحب کی تحریروں کو کہیں سے کھول کر پڑھیے، اول تو فعل کے استعمال میں مسلسل ہمواہری ملے گی یعنی تبدیلیاں بار بار اور یک لخت نہیں ہوتیں اور استعمال میں ایک طرح کا تواثر پایا جاتا ہے۔ دوسرے ہر فعل کے استعمال کی انتہائی سادہ شکلیں سامنے آئیں گی۔ استفہامیہ سے توجہ برقرار رکھنے میں، مضارع اور حال سے تصویر کھینچنے میں اور مستقبل سے امید ابھارنے میں جو مدد ملتی ہے، ذکر صاحب کو اس کا گہرا احساس تھا۔ ان کے ہاں افعال کی ان سادہ اور ہواہر شکلوں کے استعمال کی بڑی وجہ مخاطب کا تصور ہے، جو ان کے ذہن میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ سادہ افعال کے ہموار استعمال سے مخاطب

تک بات پہنچانے کے امکانات کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔

ذکر صاحب کے اسلوب میں ان کے جملوں کی نحوی ساخت کا کیا درجہ ہے، اس سلسلے میں مزید بحث کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذکر صاحب کی نثر کے بارے میں ”گفتگو کا انداز“ اور ”خطاب کا انداز“ کی جو ترکیبیں زیر نظر مضمون میں استعمال کی گئی ہیں، ان سے متعلق چند باتوں کی وضاحت کر دی جائے۔ اول یہ کہ ”گفتگو کا انداز“ کے تصور میں ”گفتگو کا لہجہ“ شامل نہیں۔ گفتگو کے انداز میں نثر لکھنے کے لیے ضروری نہیں کہ اسے گفتگو کے ”لہجے“ میں لکھا جائے۔ دوسرے یہ کہ ”خطاب کا انداز“ کے تصور میں ”خطابت“ شامل نہیں۔ ”خطاب کا انداز“ سے مراد محض یہ ہے کہ مخاطب ہر وقت نظر میں رہتا ہے اور متکلم اور مخاطب میں کوئی تیسرا واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ”خطابت“ سے مراد ایک طرح کے جذباتی، جوشیلے اور مرعوب کرنے والے اسلوب سے ہے۔ ذکر صاحب کا اسلوب اس کی واضح ضد ہے اس کی بنیاد ہی تھمے ہوئے جذبات اور سنبھلی ہوئی عقلیت پر ہے۔ ان کی تحریروں کے چار پانچ صفحات میں ہمیں اس عام رنگ سے ہٹے ہوئے صرف دو مختصر سے پیرا گراف مل سکتے ہیں:

”کیا اسلام کے پیش نظر جماعت کا یہی تصور ہے کہ وہ الگ الگ افراد کا بس ایک اتفاقی اور افادی مجموعہ ہے؟ کیا اسلام کی مذہبیت ایسی ہی رسمی اور خارجی چیز ہے جیسی کہ ان مدرسوں کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے؟ کیا اسلام کی سیاست ایسی ہی عافیت پسندی اور درویش گری کی سیاست ہے؟ کیا شخصی مفاد کی خاطر اسلام اپنے ماحول اور اپنی جماعت کے مقاصد کی طرف سے ایسی ہی بے اعتنائی سکھاتا ہے جیسی کہ ہم نے اپنی تعلیمی کوششوں سے پیدا کی ہے؟ نہیں اور ہزار بار نہیں۔“

(تعلیمی خطبات ص ۴۲)

”اور اگر آپ اپنی قومی زندگی کی موجودہ پستی پر مطمئن ہیں تو میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ آپ کے ثانوی مدرسے ہی کیا آپ کا سارا تعلیمی نظام بالکل ٹھیک ہے۔ اس میں ذرا تبدیلی نہ کیجیے، وہ معاشرت میں اتھلی تقلید، مذہب میں کھوکھلی رسمیت، سیاست میں محکومیت پسندی کے پیدا کرنے، علم میں ذوق تحقیق سے اور فنون میں ذوق تخلیق

سے نوجوانوں کو بے بہرہ رکھنے اور کمزور جسم، بے نور دماغ اور بے سوز دل پیدا کرنے کے نہایت کامیاب کارخانے ہیں۔“

(تعلیمی خطبات ص ۴۴)

یہ کس کی آواز ہے؟ ان جملوں میں تاکید و تنبیہ کا جو انداز ہے، وہ کس کا ہے؟ لہجے کی اٹھان میں مقرر کی علمی اور ذہنی برتری کا جو تصور ہے اور ”بشارت“ دینے میں جو طنز ہے وہ کس کے اسلوب کی یاد دلاتا ہے؟ ان جملوں میں ابوالکلام آزاد کے انداز کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ کسی حد تک یہ خطا کا انداز ہے۔ یہ ذاکر صاحب کا اپنا رنگ نہیں۔ ذاکر صاحب کے ہاں تیزی اور طغیانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ برتری کے بگولوں اور علمیت کی آندھی دونوں سے دور رہتے ہیں۔ ان کی نثر تو جوئے دل نشین کی طرح نرم خرامی کی کیفیت رکھتی ہے۔ وہ مخاطب کو طلسماتی فضا میں لے نہیں اڑتے بلکہ نرمی اور خلوص سے اس کے دل کو مٹھی میں لے لیتے ہیں؛ وہ مخاطب کا احترام کرتے ہیں، اس کی کم علمی پر طنز نہیں کرتے، اس کے ذہن کو ماؤف کر کے اُسے اسیر نہیں بناتے، بلکہ اسے جگا کر اس کے دل و دماغ سے رابطہ قائم کرتے ہیں؛ یہ ”خطاب کا انداز“ ہے، ”خطابت“ نہیں۔

ذاکر صاحب کی نثر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ چاہے خیال کتنا ہی مجرد ہے اور موضوع چاہے کتنا ہی فلسفیانہ ہو، کیا مجال کہ ان کی نثر میں کہیں سے پیچیدگی یا ژولیدگی پیدا ہو جائے۔ وہ فلسفیانہ مباحث کو بھی اسی سادگی اور صفائی سے پیش کرتے ہیں، جس طرح سامنے کی باتیں کر رہے ہوں۔ اس سلسلے میں اقتباس (ج) دوبارہ ملاحظہ ہو۔ سماج اور فرد کے تعلق کی بحث ہے، لیکن کہیں کوئی نامانوس لفظ یا ترکیب استعمال نہیں ہوئی۔ عربی فارسی جمع سے بھی مدد نہیں لی گئی اور عطف و اضافت بھی کہیں نہیں آئے۔ مستعار الفاظ بھی جتنے استعمال ہوئے ہیں، کثیر استعمال الفاظ کی ذیل میں آتے ہیں۔ نیز جملوں کی ترتیب اور ان کا نحوی ڈھانچہ انتہائی سادہ اور صاف ہے۔

سادگی سے عام طور پر چھوٹے چھوٹے جملوں کا استعمال مراد لیا جاتا ہے۔ لیکن ذاکر صاحب کے ہاں سادگی کی بنیاد چھوٹے جملوں کے استعمال پر نہیں۔ اوپر کے اقتباسات میں سے کسی ایک کو اس نقطہ نظر سے ایک بار پھر غور سے پڑھ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ذاکر صاحب کے جملے زیادہ تر خاصے طویل ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود نثر پیچیدہ یا مشکل نہیں ہوتی۔ یہاں اس مقصد سے اقتباس (الف) کا

از سر نو تجزیہ کیا جاتا ہے :

(۱)

” اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں / اگر ہم انسانیت کی ایسی معاشی تنظیم چاہتے ہیں / جس میں امیر و غریب کا فرق انسانوں کی اکثریت کو انسانیت کے شرف ہی سے محروم نہ کر دے / اگر ہم دولت کی شرافت کی جگہ تقوے کی شرافت کا قیام چاہتے ہیں / اگر ہم نسل اور رنگ کے تعصبات کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں // تو ان سب فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے خود اپنے پیارے وطن میں ہے / جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں / اور جس کی مٹی میں ہم پھر واپس جائیں گے // چنانچہ ہمارے نئے مدارس کی تعلیم نوجوانوں کے دل میں جماعتی خدمت کی وہ لگن لگائے گی / کہ جب تک ان کے ارد گرد ان کے اپنے گھر میں غلامی رہے گی اور افلاس / فلاکت رہے گی اور جہل / بیماریاں رہیں گی اور بد کرداریاں / پست حوصلگیاں رہیں گی اور مایوسیوں / یہ چین کی نیند نہ سوتیں گے / اور اپنے بس بھران کو دور کرنے میں اپنا تن من دھن سب کھپائیں گے // یہ روٹی بھی کمائیں گے / اور نوکریاں بھی کریں گے // پر ان کی نوکری خالی پیٹ کی چاکری نہ ہوگی / بلکہ اپنے دین کی اور وطن کی خدمت ہوگی / جس سے ان کے پیٹ کی آگ ہی نہیں بجھے گی / دل اور روح کی کلی بھی کھلے گی // یہ اپنے دینی نصب العین ہی کی وجہ سے اپنے دیس کی کہ // کبھی دنیا سے جنت نشاں کہتی تھی / پر جو آج بے شمار انسانوں کے لیے دوزخ سے کم نہیں // سیوا کریں گے / اور ایسا بنائیں گے / کہ پھر اس کے بھوکے، بیمار، بے کس، بے امید غلام باسیوں کے سامنے انھیں اپنے رحمن و رحیم، رزاق و کریم، حی و قیوم خدا کا نام لیتے وقت شرم سے سر نہ جھکانا پڑے گا / کہ انھیں بعض کی زیادتیوں اور بعض کی کوتاہیوں نے / بعض کے ظلم اور بعض کی غفلت نے / آج اس حال کو پہنچا دیا ہے / کہ ان کا وجود محدود دنگا ہوں کو اس کی شانِ ربوبیت پر ایک دھبہ سا معلوم ہوتا ہے //“

بیس سطروں کے اس اقتباس میں صرف چار جملے ہیں۔ پہلا جملہ جو ”اگر ہم دنیا... سے شروع ہو کر“... پھر واپس جائیں گے“ پر ختم ہوتا ہے، چھ سطروں کا ہے۔ دوسرا ”چنانچہ ہمارے...“ سے شروع ہو کر ”تن من دھن سب کھپائیں گے“ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ بھی چھ سطروں کا ہے۔ اگرچہ تیسرا جملہ ”یہ روٹی بھی... کئی بھی کھلے گی“ صرف تین سطروں کا ہے، لیکن چوتھا جملہ ”یہ اپنے دینی نصب العین... دھبہ سا معلوم ہوتا ہے“ سات سطروں کا ہے۔ اس طرح کے جملوں کو اردو زبان کے طویل ترین جملوں میں شامل سمجھنا چاہیے۔ سات سطروں کے جملے کا مطلب ہے عام سائز کی کتاب کے تہائی صفحے کا جملہ! حیرت کی بات یہ ہے کہ اس قدر طویل جملوں کے باوجود ذاکر صاحب کی نثر صاف اور عام فہم ہوتی ہے۔ اس کا راز کیا ہے؟

پہلے جملے پر نظر ڈالیے جو چھ سطروں کا ہے۔ یہ شروع ہوتا ہے، ”اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں۔ اس کلمے کا PHRASE STRUCTURE یعنی نحوی ساخت کیا ہے؟

S → NP + VP ہم مجبور ہیں
 VP → N + Adj + V ہم مٹانے پر مجبور ہیں
 NP → N₁ + N₂ ہم غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں
 NP → N₁ + M + N₂ ہم ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں
 NP → N₁ + Adv + M + N₂ ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں
 NP → C + N₁ + Adv + M + N₂ اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں
 کلمہ اسمیہ، Noun Phrase = NP حرف ربط، Conjunction = C
 کلمہ فعلیہ، Modifier = M صفاتیہ، Verb Phrase = VP

بالکل یہی ساخت ”اگر ہم انسانیت...“ سے شروع ہونے والے دوسرے کلمے کی ہے۔ اس کے بعد ”جس میں...“ سے شروع ہونے والا تابعی کلمہ ضمیر یہ Relative Phrase ہے، جس میں دوسرے کلمے کے اسم ”معاشی تنظیم“ کی تعریف ہے۔ پھر ”اگر ہم دولت...“ سے شروع ہونے والا تیسرا کلمہ ہے اور اس کے بعد

” اگر ہم نسل ... “ سے شروع ہونے والا چوتھا کلمہ۔ آخری دونوں کلموں کی نحوی ساخت پہلے دو

STRUCTURAL کے انداز پر ہے۔ گویا ان چاروں کلموں میں ساخت کے اعتبار سے نحوی متوازیت

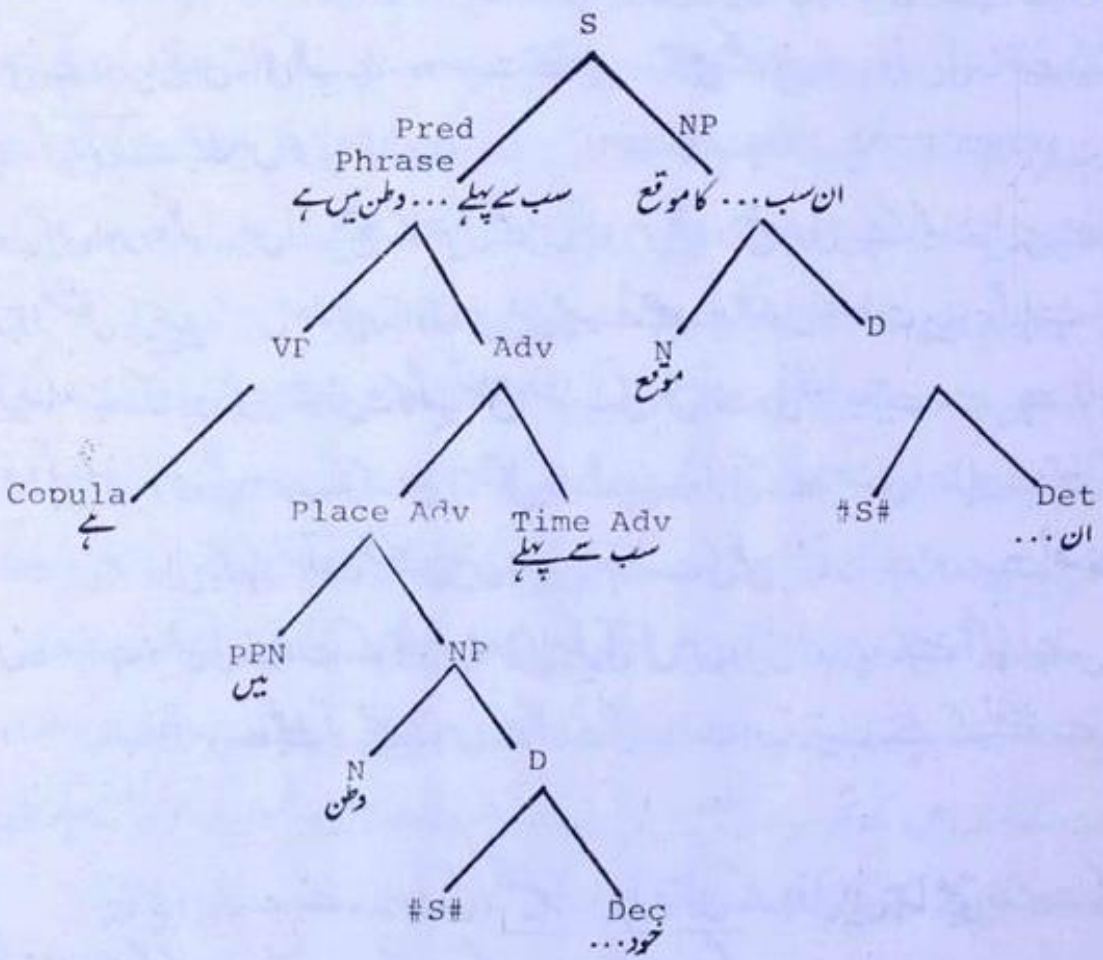
PARALLELISM ہے۔ اس کے بعد معنوی اعتبار سے آدھا جملہ ختم ہو گیا ہے۔ اس سارے نصف

جملے کی نحوی ساخت بنیادی طور پر وہی ہے جو چار کلموں کی تھی، یعنی اگر ہم (فعل) ہیں۔

اس کے بعد جملہ کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جس کا پہلا کلمہ خاصا طویل ہے :

ان سب فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے خود اپنے پیارے وطن میں ہے۔ اس کی

نحوی ساخت ملاحظہ ہو :



اس تجزیہ سے ظاہر ہے کہ اس طویل کلمے کے دو حصے ہیں اور ان دونوں کی اندرونی ساخت

(EMBEDDED SENTENCES) میں دو بنیادی جملے (DEEP STRUCTURE)

STRUCTURAL PARALLELISM ہیں جس سے کلمہ کے دونوں حصوں میں ایک طرح کی نحوی متوازنیت پیدا ہو گئی ہے۔

اس کے بعد دو تابعی کلمے ہیں جو دونوں "جس" سے شروع ہوتے ہیں اور جن دونوں کی ساخت یوں ہے:

$P+N_2+N_1+V$ جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں

$P+N_2+N_1+(A)+V$ جس کی مٹی میں ہم پھر واپس جائیں گے

ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بھی ساخت کے اعتبار سے نحوی متوازنیت ہے۔

جملے کے پہلے حصے میں پانچ کلمے ہیں، دوسرے میں تین ہیں۔ پہلے پانچ میں چار کی ساخت ایک جیسی ہے اور پانچواں تابعی کلمہ ہے۔ دوسرے حصے میں دو تابعی کلمے ہیں اور دونوں کی ساخت ایک جیسی ہے۔ گویا پورے جملے میں نحوی متوازنیت (STRUCTURAL PARALLELISM) چار

کلموں میں اور دو کلموں میں اور بیچ کے طویل کلمے میں کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ جملہ طویل ہونے کے باوجود مشکل یا پیچیدہ نہیں معلوم ہوتا اور اس میں چھوٹے چھوٹے جملوں کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔
ذکر صاحب کے ہاں نحوی متوازنیت کا گہرا تعلق اسلوب کی اس اندرونی موسیقیت سے ہے جس کی موجودگی یا غیر موجودگی اسلوب کو آسان یا مشکل بنانے میں مدد کرتی ہے۔ محضی اعتبار سے جملے کے پہلے نصف میں جو سوال بار بار مختلف شکلوں میں ذہن پر تھوڑے کی طرح پڑتا رہا ہے، دوسرے نصف میں اس کا جواب وطن کی خدمت کے ٹھوس معنوی پیکر کی شکل میں واضح طور پر سامنے آ گیا ہے۔
اب دوسرے جملے کو لیجیے۔ اس کے کلمات کی ساخت اور ترتیب نیچے کے نقشے سے واضح ہے:

چنانچہ (ہمارے نئے مدرسوں کی) تعلیم نوجوانوں کے (دل میں جماعتی خدمت کی) لگن لگائے گی کہ جب تک ان کے ارد گرد (ان کے اپنے گھر میں)

غلامی رہے گی اور افلاس
فلاکت رہے گی اور جہل

بیماریاں رہیں گی اور بدکرداریاں
پست حوصلگیاں رہیں گی اور فایوسیاں
یہ (چین کی نیند) نہ سونیں گے

اب یہ بات ظاہر ہے کہ ذاکر صاحب کے طویل جملوں کے عام فہم ہونے کا راز جملے کی سادہ نحوی ساخت اور اس ساخت کی متوازنیت یعنی جملے کے داخلی توازن اور تکرار اور ٹھوس معنوی پیکروں کے استعمال میں پوشیدہ ہے۔ اب آخری دو جملوں کو بھی ملاحظہ کر لیا جائے۔ ان کی ساخت سے بھی اسی تجربے کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس اقتباس میں کلموں کی نحوی تقسیم کو ایک آڑی لکیر سے، معنوی موڑ کو دو آڑی لکیروں سے اور نحوی متوازنیت کو پورے کلمے کے نیچے کی لکیر سے ظاہر کر دیا گیا ہے۔ جملے کی حد بندی # سے کی گئی ہے۔ تیسرے جملے میں ”پیٹ کی آگ“ اور ”دل اور روح کی کلی“ اور چوتھے جملے میں ”جنت نشان“ اور ”دوزخ“، اور ”بیمار، بے کس“ اور ”رحمن و رحیم“ کے متضاد معنوی پیکروں سے جو کام لیا گیا ہے، اس کی اہمیت ظاہر ہے۔

اقتباس (الف) جس کا تجربہ اوپر پیش کیا گیا، مستثنیات میں سے نہیں۔ ذاکر صاحب کی تخریروں کو کہیں سے کھول کر دیکھیے، جملے کے اندر کلموں کی نحوی متوازنیت اور ان کے باہمی ربط و توازن کا تقریباً یہی انداز ملے گا۔ ذاکر صاحب کے ہاں چھوٹے جملے بھی کہیں کہیں ملتے ہیں، لیکن زیادہ تر طویل جملوں کے اندر نحوی متوازنیت ملتی ہے جس سے طویل جملوں میں چھوٹے جملوں کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔ مزید ثبوت کے لیے اقتباس (ب) کو نشان زد کر کے دوبارہ نیچے پیش کیا جاتا ہے۔ اقتباس (الف) کی وضاحت کے بعد اس کے تجربے کی تفصیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ کلموں کی نحوی تقسیم کو نظر میں رکھنے سے تجربے کے نتائج خود بخود واضح ہو جائیں گے۔

(ب)

”یہ نصب العین یہ تھا // کہ اس ملک کے مسلمانوں میں اعلیٰ اور متوسط طبقے کے افراد کی جتنی تعداد اپنا پیٹ پالے / سرکاری نوکریاں پاپا کر آرام، چین، اور ہاں ٹھوڑی سی، حکومت، کے ساتھ زندگی کے دن کاٹنے کے قابل ہو جائے //

اچھا ہے ✖ یہ چند افراد اپنی خوش حالی کا معیار جس قدر بڑھالیں / اتنی ہی قوم خوش حال سمجھی جائے // اس راہ میں جو رکاوٹیں ہوں / وہ ہر طرح کم کی جائیں // مستقبل کے مشتبہ منصوبوں سے حال کی یقینی بہرہ مند یوں میں حرج نہ ہو / اور قومی آخرت کا تصور انفرادی دنیا کے عیش میں خلل نہ ڈالنے پائے ✖ معاشرت بدلی جائے // اپنی پرانی معاشرت بُری ہے / اور بُری اس لیے ہے / کہ ایک با اقبال صاحب اقتدار قوم کی معاشرت سے مختلف ہے ✖ سیاست سے بے تعلق رکھی جائے / اس لیے کہ انفرادی ترقی و ترقی کے لیے اپنی جماعت کے سیاسی اقتدار کی ضرورت کچھ بہت واضح نہ تھی ✖ حکومت کی جو شکل بھی ہو ہو // بس وہ امن قائم رکھ سکے / محکموں کے معاملات باہمی میں انصاف کر سکے / نوکریاں دے / چند افراد کو مراتب بلند تک پہنچائے // کہ اس کا کام نکلے / اور ہماری عزت بڑھے ✖ مذہب // کہ صدیوں اس جماعت کی زندگی کا مرکز رہ چکا تھا / چھوٹا تو کیسے // ضرور قائم رکھا جائے // مگر اس طرح / کہ دوسرے ارادوں میں بھی مانع نہ ہو / اور ترقی کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے ✖ معاملات پر // کہ اہل دنیا سے متعلق ہیں // اس کی تعلیمات اور ان کی حکمتوں کو زیادہ نہ اٹھا جا جائے / چپ چپاتے دوسرے زیادہ ترقی یافتہ اہل دنیا کے اسالیب عمل کو اختیار کر لیا جائے ✖

اب تک جو نمونے پیش کیے گئے، وہ علمی نثر کے تھے۔ ایک اقتباس بیانیہ نثر کا بھی دیکھ لیا جائے:

” جنگل ہی جنگل تھے اور پھر پہاڑیاں ہی پہاڑیاں۔ ساتویں جنگل کے پیچھے اور ساتویں پہاڑی کے پرے ایک مچھیرا ہتا تھا، جو ان اور خوبصورت۔ وہیں ایک گڈریا ہتا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی، جیسے چاند کا ٹکڑا۔ یہ سچی بھیریں چرایا کرتی تھی۔ غریب اور بھولی بھالی تھی، جیسی اس کی بھیریں۔ دونوں کو ایک

دوسرے سے محبت ہو گئی۔ لڑکی کی نظریں مچھیرا کسی شہزادے سے کم نہ تھا اور مچھیرے کے نزدیک کوئی شہزادی اس غریب لڑکی کی برابری نہ کرتی تھی، مگر تھے دونوں بہت غریب۔“

”سچی محبت“ مشمولہ ابو خاں کی بکری اور دوسری کہانیاں)

اس نثر کا عام رنگ بیانیہ ہے، لیکن دو باتیں توجہ طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ انداز کہانی لکھنے کا نہیں، سنانے کا ہے یعنی مخاطب نظر میں ہے اور انداز گفتگو کا ہے۔ دوسرے اگرچہ جملے چھوٹے چھوٹے ہیں، لیکن نحوی متوازنیت یہاں بھی موجود ہے۔ خط کشیدہ کلموں کو دیکھیے۔ اگرچہ پہلا کلمہ ”پھر پہاڑیاں ہی پہاڑیاں“ حصریہ ہے، دوسرا ”جو ان اور خوبصورت“ صفا تہیہ ہے، اس کے بعد تیسرا ”جیسے چاند کا ٹکڑا“ چوتھا ”جیسی اس کی بھیڑیں“ اور پانچواں ”مگر تھے دونوں بہت غریب“ تینوں صفا تہیہ ہیں، لیکن دراصل پانچوں کلمے اختتامیہ ہیں۔ اصل جملے جو اسم و فعل سے مکمل ہیں، ان سے فوراً پہلے آتے ہیں۔ ان کلموں میں سے پہلے چار میں فعل سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ پہلے آنے والے جملے کی معنوی توسیع کے لیے یا بات کا وزن بڑھانے کے لیے یا اس پر زور دینے کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ پہلے جملے کے ساتھ مل کر یہ دو دو کا سٹ بنتے ہیں، اور اس لحاظ سے ان میں اور ان سے پہلے آنے والے جملے میں نحوی متوازنیت ہے جس سے نثر میں ایک طرح کا داخلی توازن اور ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔

جملوں کے نحوی تجزیے کے بعد ایک نظر اگر الفاظ و ترکیب کے استعمال پر بھی ڈال لی جائے تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اسلوبیات (STYLISTICS) میں تجزیے کی معروضیت کے لیے ضروری ہے کہ نثر کو کہیں سے بھی لے لیا جائے۔ اس لیے موضوعی طور پر نئے اقتباسات منتخب کرنے کے بجائے ایک بار پھر ہم ان چار اقتباسات سے کام لے سکتے ہیں، جنہیں شروع میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اردو الفاظ کا ایک تجزیہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مصنف کی تحریر میں مستعار اور غیر مستعار الفاظ کا باہمی تناسب معلوم کیا جائے۔ لیکن چونکہ اردو کی خوش آہنگی عربی فارسی اور دیسی الفاظ کے باہمی تناسب سے کہیں زیادہ مانوس مستعار اور غیر مانوس مستعار الفاظ کے باہمی تناسب پر منحصر ہے؛ اور مانوس اور غیر مانوس کا یہ تصور خاصا اضافی اور دہلانی ہے، اس لیے ایسا تجزیہ زیادہ کارآمد نہ ہوگا۔ چنانچہ زیر نظر تجزیے کو ہم صرف عطف و اضافت اور عربی فارسی جمع کے استعمال کی بحث تک محدود رکھیں گے۔

عطف و اضافت کا استعمال اردو کی ان خصوصیات میں سے ہے جو اردو کو ہندی سے ممتاز کرتی ہیں، لیکن عطف و اضافت کا حد سے بڑھا ہوا استعمال بھی مستحسن نہیں۔ مندرجہ بالا اقتباسات میں اس کی مثالیں یہ ہیں:

- (۱) شانِ رُبُوبیت؛ امیر و غریب، رزاق و کریم، رحمن و رحیم، حی و قیوم۔ کل پانچ بار
 (ب) صاحبِ اقتدار، معاملاتِ باہمی، مراتبِ بلند، اہلِ دنیا، اسالیبِ عمل؛ ترقی و ترفیح۔ کل چھ بار
 (ج) _____
 (د) رجحانِ ذہنی
 صرف ایک بار

اردو کی علمی نثر میں عطف و اضافت کے استعمال کی جو بھی حدود ہوں، مندرجہ بالا تجزیہ کی روشنی میں ظاہر ہے کہ ذاکر صاحب کے ہاں عطف و اضافت کا استعمال ان حدود کے اندر ہی قرار پائے گا۔ اب جمع کی شکلوں کو لیجیے:

مستعار الفاظ کی ایسی جمع

مدرسوں، نوجوانوں، بیماریاں، یالوسیاں، بدکرداریاں،
 پست حوصلگیاں، زیادتیوں، کوتاہیوں، نگاہوں
 منصوبوں، بہرہ مندیوں، محکموں، صدیوں، حکمتوں
 حصوں، معنوں
 بچوں، صلاحیتوں

مستعار جمع

(۱) تعصبات، فرائض
 (ب) معاملات، مراتب،
 تعلیمات، اسالیب

(ج) صفر

(د) صفر

آخر میں ایک نظر اس نثر کی صوتیات پر بھی ڈال لی جائے۔ اس بحث میں ث، ص، ط، ح، ع وغیرہ آوازوں کو نہیں لیا جائے گا، کیونکہ ان کی بنیادی آوازیں بالترتیب س، ت، ہ اور مختلف موصولیوں کی کوئی امتیازی حیثیت نہیں۔ البتہ ز (جو اردو میں ذ، ظ اور ض کی بھی آواز ہے) ث، ف، خ، غ اور ق کو لیا جائے گا جو اردو کی مستعار امتیازی آوازیں ہیں اور اردو کو ہندی سے ممیز کرتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں اردو کی معکوسی

آوازوں ٹ، ڈ، ژ اور ہکار آوازوں (بھ، پھ، تھ، دھ، وغیرہ) کو لیا جائے گا جو اردو کی غیر مستعار امتیازی آوازیں ہیں اور اردو کو فارسی سے ممیز کرتی ہیں۔ اردو میں ہکار آوازوں کا دائرہ خاص وسیع ہے اور یہ تمام بندشی آوازوں کے علاوہ م، ن، ہ اور ی کے ساتھ اور تینوں معکوسی آوازوں کے ساتھ بھی استعمال ہوتی ہیں، لیکن بہ حیثیت مجموعہ اردو میں ان کا وقوع (OCCURRENCE) بہت زیادہ نہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں: الفاظ کے دو گروہ خاص ہیں، اسما اور اسمائے صفت اور دوسرا افعال۔ مستعار الفاظ کی بڑی تعداد پہلے گروہ سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے اس میں دیسی آوازوں کا استعمال قدرتی طور پر محدود ہے۔ رہے افعال تو اگرچہ اردو افعال بنیادی طور پر دیسی ہیں، لیکن ہکار آوازوں کا استعمال باقاعدگی سے صرف ابتدائی فعل کی ماضی میں ہوتا ہے، اس کے علاوہ اردو میں ہکار اور معکوسی آوازوں کا استعمال بہت زیادہ نہیں۔ اس لیے قیاساً یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ اردو میں ممتاز دیسی اور ممتاز مستعار اصوات کا باہمی تناسب شاید نصف نصف کا نہیں، اور علمی زبان میں تو دیسی ممتاز اصوات کا یہ تناسب اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ ذاکر صاحب کی نثر سے اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔ نمونے کے لیے اقتباس ب کو جہاں وہ دوبارہ پیش ہوا ہے، ان آوازوں کے لیے نشان زد کر دیا گیا ہے۔ (ر، کا نشان مستعار امتیازی آوازوں اور x کا نشان دیسی امتیازی آوازوں پر لگایا گیا ہے)۔ باقی اقتباسات کو نشان زد نہیں کیا گیا، صرف اعداد پیش کیے جا رہے ہیں:

مستعار آوازیں	دیسی آوازیں	
۳۸	۲۷	(ا)
۴۱	۲۳	(ب)
۳۶	۲۷	(ج)
۳۸	۱۳	(د)
۱۵۲	۹۰	

گویا یہ تناسب ۲:۳ سے قدرے زیادہ ہوا۔ اردو کے اسما اور اسمائے صفت کی بڑی تعداد کے مستعار ہونے کے پیش نظر اس تناسب کو اردو کے بنیادی اسلوب کی حدود کے اندر سمجھنا چاہیے۔ اس پورے تجزیے سے ظاہر ہے کہ خواہ جملے کی نحوی ساخت اور اس کے اجزا کی داخلی تنظیم

ہو خواہ الفاظ کی نوعیت یا اصوات کا باہمی تناسب، ذاکر صاحب کا اسلوب سادگی، ہمواری اور ہم آہنگی کی بہت اچھی مثال فراہم کرتا ہے۔

اگرچہ نثر میں آوازوں کو چین چین کر اور لفظوں کو گن گن کر نہیں لکھا جاتا، لیکن نثر میں یہ خوبیاں اتفاقاً پیدا نہیں ہو جاتیں۔ ان کے پیچھے تخلیقی مزاج، اقتدارِ طبع، اور ذاتی پسند و ناپسند کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مشکل نثر لکھنا مشکل اور آسان نثر لکھنا آسان ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مشکل نثر لکھنا نسبتاً آسان ہے اور آسان نثر لکھنا مشکل۔ خون جگر کھائے بغیر علمی مباحث کو پانی نہیں کیا جاسکتا۔ ذاکر صاحب اردو کی خوش سلیقگی کے مزاج داں اور اس کی امتزاجی خوش آہنگی کے رمز شناس تھے۔ گفتگو کا انداز، سادہ الفاظ، طویل جملوں میں نحوی متوازنیت، اور فعل کے استعمال میں ہمواری، ان کے اسلوب کے بنیادی ارکان ہیں۔ انھوں نے اپنی نثر کے ذریعے جملوں اور ذیلی جملوں میں ربط و توازن کے جو نمونے پیش کیے، افعال کی سادہ شکلوں سے جو کام لیا، اردو کے مختلف الاصل عناصر میں تخلیقی توازن کی جو مثالیں پیش کیں، اور اردو کے فطری امکانات کو بروئے کار لانے اور اس کے جینیس سے انصاف کرنے کی جو کوشش کی، اس کا اعتراف ضروری ہے۔ اردو کے بنیادی اسلوب کا جب بھی جائزہ لیا جائے گا، ذاکر صاحب کی نثری خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔

(۱۹۶۹ء)

35150

